گجرات کی تمدنی تاریخ

(مسلمانوں کے عہد میں)

مؤلفہ

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم



سلسلۂ دار المصنفین

نمبر (۹۱)

گجرات کی تمدّنی تاریخ

(مسلمانوں کے عہد میں)

جس میں بڑی تلاش وجستجو سے گجرات کی تمدنی تاریخ اور شاہانِ گجرات کے آثار و مشاہد کے محققانہ حالات فراہم کئے گئے ہیں

مؤلفہ

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی [illegible] مرحوم سابق رفیق

[illegible] ریسرچ اسکالر ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد

باہتمام

مولانا مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی

کتبہ اقبال احمد

[illegible]

فہرست مضامین

گجرات کی تمدنی تاریخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

گجرات سے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات، یہاں اُن کی حکومت کے قیام کے صدیوں پہلے سے تھے، محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد تعلقات اور بڑھے، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے اپنے زمانہ میں گجرات پر فوج کشی کی، مگر وہ مستقل نہ تھی، سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۶ھ (۱۳۱۶ء) میں اس کو مستقل فتح کیا اور وہ حکومت دلّی کا ماتحت صوبہ بن گیا، مگر اس کی تاریخی اہمیت اور اس کی ترقی کا دور اس وقت سے شروع ہوا، جب خاندانِ تغلق کے زوال کے بعد اس کے ایک امیر ظفر خاں نے ۸۰۳ھ (۱۳۹۸ء) میں یہاں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی، یہ حکومت تقریباً دو سو برس تک قائم رہی، اس میں بڑے بڑے اولوالعزم فرمانروا پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی عظمت و شان حاصل کی، وہ علم و فن کے بڑے قدردان و سرپرست تھے، اور اُن کو ملک کی ترقی سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے

اُن کے زمانہ میں گجرات علم و فن، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ ہر شعبہ میں تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گیا، اور اس کی خاک سے ہر فن کے ایسے ایسے علما، اور ارباب کمال پیدا ہوئے جن کے فیض سے پورا ہندوستان سیراب ہوا، اور آج بھی گجرات کا کوئی خطہ اسلامی دور کے آثار سے خالی نہیں ہے، لیکن اس کی اس تاریخی اہمیت کے باوجود اردو میں اس کی کوئی مستقل تاریخ نہیں تھی، اگر مولانا حکیم سید عبدالحیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ یادِ ایام نہ ہوتا، تو بہتوں کو گجرات کی علمی و تمدنی اہمیت کا علم بھی نہ ہوتا، اس لئے دار المصنفین نے جب تاریخ ہند کا سلسلہ شروع کیا، تو گجرات کو بھی اس میں شامل کر لیا، اور اس کی تمدنی تاریخ کی تالیف مولینا سید ابو ظفر صاحب ندوی مرحوم کے سپرد کی، جو گجرات کی تاریخ کے ماہر خصوصی تھے، اور اس سے پہلے گجرات کی سیاسی تاریخ لکھ چکے تھے، جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے، مولانا نے بڑی تلاش و تحقیق اور محنت و جستجو سے تمدنی تاریخ لکھی ہے جس کا اندازہ ناظرین کو کتاب کے مطالعہ سے ہوگا، مگر افسوس ہے کہ اس کی اشاعت سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا، اور اس کی نظر ثانی اور ضروری ترمیم و تصحیح کا کام راقم کو انجام دینا پڑا، اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا ایک اہم رُخ سامنے آجائیگا، جو عام نگاہوں سے اب تک مستور تھا، ہم اس کتاب کی اشاعت کے لئے عالیجناب ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند کے شکر گذار ہیں جن کی علم نوازی سے تاریخ ہند کے سلسلہ کی تکمیل کا موقع ملا۔

فقیر معین الدین احمد ندوی،

ناظم دار المصنفین و ڈائرکٹر شعبۂ تاریخ ہند

۲۲ / مارچ ۱۹۶۲ء

حالاتِ مصنّف

از

ازجناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (علیگ)

اس کتاب کے فاضل مصنف مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی (جن کو اب مرحوم لکھتے ہوئے بڑی سوگواری محسوس ہوتی ہے) دیسنہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ریاست بہار کا ایک بہت مردم خیز اور ممتاز گاؤں تھا، مولانا اس گاؤں کے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، ان کے پردادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے، اور صاحب دل صوفی بھی، ان کے دادا سید ابوالحسن صاحب بڑے حاذق طبیب تھے، اور اپنے زہد تقویٰ کے لئے بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، ان کے والد ماجد جناب سید ابوحبیب صاحب بھی فنِ طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے اتباعِ سنت کے لئے مشہور تھے، مجددی سلسلہ میں حضرت شاہ ابواحمد صاحب

بھوپالی سے بیعت بھی تھے ، اور اُن کے سگے چچا حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ، جن کے آوازۂ شہرت سے دنیائے علم وادب اب تک گونج رہی ہے ،

وہ اپنے چچا حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ سے ۵ سال چھوٹے تھے اس لحاظ سے ان کی پیدائش کا ۱۳۱۷؁ھ ہجری ہوتا ہے ، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی ، پھر بارہ سال کی عمر میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آکر داخل ہوئے ، اردو کے مشہور فلسفی مولانا عبدالباری ندوی اور مولوی شبلی متکلم ندوی سابق صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر) کے ہم جماعت تھے ، ندوہ کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے مولانا شبلیؒ سے بھی کچھ سبق لئے ، اور اُن سے علمی فیوض بھی حاصل کئے ، اس لئے اُن کا شمار بھی مولانا شبلیؒ کے شاگردوں میں رہا ، دارالعلوم ندوہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ دنوں ملتان کے ایک عربی مدرسہ میں درس وتدریس کا شغل جاری رکھا ، وہاں سے ۱۹۱۵؁ء میں رنگون چلے گئے ، جہاں سے پوری دنیا کی سیاحت کا ارادہ رکھتے تھے ، اور اسی خیال سے انھوں نے رنگون کے قیام کے زمانہ میں سفرنامہ برہما لکھا ، جس میں برہما کے چشم دید اخلاقی معاشرتی ، تجارتی تعلیمی ، اور سیاسی حالات لکھے اور ایک کتاب برمی بول چال کے نام سے برمی زبان کی صرف ونحو میں لکھی یہ دونوں کتابیں محبوب المطابع دہلی اور پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں ، رنگون سے ۱۹۲۲؁ء میں احمد آباد چلے آئے ، جہاں گاندھی جی کے قائم کردہ کالج ودیاپیٹھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے ، اور وہاں

قومی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر بھی نامزد کئے گئے، گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کے بڑے سرگرم کارکن تھے، اور اسی وجہ سے آخر عمر تک اُن کے سیاسی خیالات وہی رہے، جو قوم پرور مسلمانوں کے تھے،

یہاں کے قیام کے زمانہ میں اُن کو گجرات کی تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی، اور اس ریاست کے محکمۂ آثار قدیمہ کی فرمایش پر گجرات کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی، اور اسلامی زبانوں میں جتنا مواد تھا، اس کو اکٹھا کرنے کے لئے عرب، شام، اور قسطنطنیہ کے معزز اہلِ قلم سے خط و کتابت کی، اور اُن کے استفسار پر قسطنطنیہ کے بعض اخبارون میں متعدد مضامین بھی شائع ہوئے، اُن کی کاوش و محنت سے ۱۹۲۸ء میں تاریخ گجرات کی پہلی جلد تیار ہوئی، جس میں کرشن مہاراج کے عہد سے محمود تغلق شاہ اور ظفر خاں آخری ناظم گجرات تک کے سیاسی حالات درج تھے، لیکن گجرات کا محکمۂ آثار قدیمہ اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے اس کتاب کو شائع نہ کرسکا، اور بالآخر یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی، جو ۴۴۸ صفحے پر مشتمل ہے،

ان ہی دنوں انھوں نے مرأۃ احمدی کا ترجمہ تاریخ اولیاء گجرات کے نام سے کیا، جس کو ۱۹۳۳ء میں حاجی بدرالدین حسین نظامی تاجر کتب احمدآباد نے شائع کیا،

جامعہ ودیا پیٹھ کالج احمدآباد سے مدراس چلے آئے تھے، جہاں وہ سیٹھ جمال کے قائم کردہ جمالیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے،

پھر ان کو جناب نواب مہدی علی وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ نے اُن کو جوناگڈھ

بلالیا، جہاں ان سے ریاست کے لئے علمی و مذہبی کام لئے گئے، یہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے اردو کے مشہور اہلِ قلم اختر جونا گڈھی کے ساتھ مل کر ایک علمی رسالہ بھی "شہاب" کے نام سے جاری کیا، احمد آباد اور جونا گڈھ کے قیام میں اُن کو بوہروں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی، اور بوہروں کے بعض اکابر کی فرمائش پر اُن کی بھی ایک تاریخ لکھی، اور جب یہ چھپکر تیار ہوئی تو بوہروں کے کچھ فرقوں کو اس کے بعض حصوں پر اعتراض ہوا، اس لئے اس کی اشاعت روک دی گئی،

۱۹۳۳ء میں دارالمصنفین میں تاریخِ ہند کی تدوین و ترتیب کے لئے ایک لمبی اور اہم اسکیم تیار ہوئی، تو وہ یہاں بلالئے گئے، اور انھوں نے پانچ سال قیام کرکے مختصر تاریخِ ہند، تاریخ سندھ، اور تاریخ خاندان غزنہ لکھیں پہلی دو کتابیں سلسلۂ دارالمصنفین میں شائع ہوگئی ہیں، اسی زمانہ میں انھوں نے "ہندوستان میں توپ" ہندوستان میں کاغذ سازی" ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ڈاک کا انتظام" وغیرہ بہت ہی اہم مضامین لکھے، جو معارف میں شائع ہوتے رہے،

وہ ۱۹۳۹ء میں رابندرناتھ ٹیگور کی یونیورسٹی شانتی نکیتن میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو کر چلے گئے لیکن وہاں سے گجرات ودّیا سبھا احمد آباد نے اُن کی خدمات حاصل کرلیں، جہاں اپنی عمر کے آخر لمحہ تک گجرات کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تدقیق کرتے رہے، اور اس سبھا کے پوسٹ گراجوایٹ کلاس کو عربی اور فارسی بھی پڑھاتے

رہے، یہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے گجرات کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی ایک تاریخ مظفر شاہی مصنفہ ملا طالی کو اڈٹ کرکے شائع کیا، بمبئی یونیورسٹی نے اُن کو گجرات کے عہد وسطیٰ کے بحری بیڑہ پر ایک توسیعی لکچر دینے کو بھی مدعو کیا،

۱۹۵۵ء میں مولانا ابوالکلام آزادؔ اور ڈاکٹر سید محمود (صدر مجلس انتظامیہ دارالمصنفین) کے مشورے سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک پنج سالہ پلان تیار کیا گیا، تو اس کی دس جلدوں میں گجرات کی تمدنی تاریخ بھی رکھی گئی، اور اسکی تدوین کے لئے مولانا ابو ظفر صاحب ندوی کی طرف نظر گئی، جنھوں نے اس کام کو بڑی خوشی سے انجام دینے کا وعدہ کیا، اور یہ کام پورا کرکے دارالمصنفین کے حوالہ کر دیا، لیکن اس وقت انتہائی دکھ اور رنج ہے کہ یہ کتاب اُن کی وفات کے بعد شائع ہو رہی ہے، اُن کی پوری زندگی تاریخ ہند کے مطالعہ میں گذری، اُن کے سامنے کوئی بیٹھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ تاریخ ہند کے کتب خانہ کے پاس بیٹھا ہے، وہ اپنی غیر علمی اور نجی گفتگو تک میں کسی نہ کسی طرح ہندوستان اور گجرات کی تاریخ کا کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور بیان کرنے لگتے، اور تقریباً پچاس برس تک اُن کے قلم کا مسافر برابر چلتا رہا، وہ کتابیں بڑی تلاش وجستجو کے بعد قلمبند کرتے، لیکن اُن کو ختم کرنے کے بعد یہ تصور کر لیتے کہ ان کا کام تو ختم ہو گیا ہے، اس کی کتابت، طباعت اور اشاعت کا کام دوسروں کا ہے، اسی لئے اُن کے بہت سے مسودے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں،

اُن کی وفات کے بعد ملک میں ان کا ماتم اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے لیکن اہلِ نظر کی آنکھیں اس خیال سے ضرور اشک بار ہوئیں کہ ہندوستان اور خصوصاً گجرات کی تاریخ پر اُن کی ایسی دیدہ وری اور بصیرت رکھنے والا اہلِ قلم اب ملک میں کوئی نہیں رہا،

اُن کے اخلاق، سیرت، اور کردار میں بھی بہت سی خوبیاں تھیں، شکل و صورت میں اپنے چچا حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب سے بہت مشابہ تھے تنہائی کو زیادہ پسند کرتے تھے، لیکن جس سے ملتے بہت ہی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے پیش آتے، اُن کا ظاہر اور باطن ایک تھا، جو کچھ دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا، اسی لئے بڑے صاف گو تھے، اپنی تقریروں میں مسائل کو مسائل کی خاطر پیش کرتے، مصالح کا لحاظ بالکل نہ رکھتے،

اللہ تبارک و تعالیٰ اس پیکر علم و فضل اور مجسمۂ اخلاقِ حمیدہ کی تربت کو اپنے انوار رحمت کی بارش سے ہمیشہ ہمیشہ سیراب رکھے، آمین ثم آمین

نظامِ حکومت

تمہید: عرصہ ہوا کہ میں ایک دفعہ سابرمتی آشرم (احمد آباد) گیا ہوا تھا۔ وہاں جسٹس طیب جی آف بڑودہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آج کل کیا کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ گجرات کی سیاسی تاریخ لکھ رہا ہوں، فرمایا کہ یہ تو دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں، تم گجرات کی تمدنی تاریخ کیوں نہیں لکھتے، بات ختم ہو گئی۔ نتیجہ میں جب میں شبلی اکیڈمی (اعظم گڈھ) پہنچا تو تمدنی تاریخ لکھنے کا خیال مستحکم ہو گیا، اور اس کام کی ابتدا میں نے وہیں کر دی، اسی دوران میں فاربس سبھا بمبئی نے اسی مضمون پر لکچر دیا، احباب نے پسند کیا، اس سے میری ہمت اور بڑھ گئی، اور میری توجہ اسکی طرف اور زیادہ منعطف ہو گئی، اور جب شبلی اکیڈمی کی طرف سے اصرار بڑھا کہ میں اس ادارہ کے سلسلۂ "تاریخ میں گجرات کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تمدنی تاریخ لکھوں، تو میرا انہماک

اور بڑھ گیا، اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کام انجام کو پہونچ گیا،

گجرات ہندوستان کے اُن صوبوں میں سے ہے جس کی زرخیزی اور دلآویزی نے ماضی میں حکمران کو موہ لیا، اور اپنے اپنے وقت میں ہر ایک نے اپنا قبضہ جمایا، یہی سبب ہے کہ اگر کھوج لگایا جائے تو ہر قوم کے تمدنی آثار گجرات میں ملیں گے، اور اسی لیے اہل علم اس کی بڑی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے، لیکن اس وقت تک کوئی کتاب اس موضوع پر میری نظر سے نہیں گذری، جناب رتن منی راؤ صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس میں اسلامی عہد کے پہلے کے کچھ حالات درج ہیں تاہم میں اس وقت جو کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق محض اسلامی عہد سے ہے، اس کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کس کاوش اور تلاش سے گجرات کی تمدنی تاریخ سے متعلق یہ معلومات فراہم کیے گیے ہیں۔

گجرات کی قدرتی جائے وقوع ملک عرب کے سامنے ہے، بیچ میں بحر عرب کا ایک حصہ واقع ہے، اسی ہمندری راستہ سے عرب قدیم سے آمد و رفت رکھتے تھے، اور تجارتی کاروبار کے ذریعہ انھوں نے کافی فروغ پایا، یہی سبب ہے کہ عربی زبان میں بہت سے نام آج بھی بطور یادگار موجود ہیں، اسی طرح گجراتی زبان میں بھی عربی نام بکثرت ملیں گے، پھر جب عرب سے لے کر ترکستان تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی، تو اس وقت گجرات سے لے کر لنکا تک

تجارتی جہازوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی اور جب کبھی ان تاجروں کو کوئی تکلیف پہنچی تو ان کی امداد کے لیے بصرہ اور سیراف وغیرہ سے جنگی بیڑا فوراً آجاتا چنانچہ تھانہ، بھروچ، دیول وغیرہ میں متعدد بار آیا، کبھی کامیاب اور کبھی ناکام واپس گیا سندھ پر ۹۲ھ میں عربی حکومت قائم ہو جانے کے بعد تعلقات میں مزید اضافہ ہوا اور "راشٹر کٹ" خاندان (اس کو عرب "بلہرا" کہتے ہیں مان کھیڑ اس کا دارالحکومت تھا) کے برسر حکومت ہونے کے بعد دونوں میں جو معاہدے ہوئے ان سے تعلقات اور زیادہ وسیع ہو گئے، تجارتی، علمی، مذہبی ہر قسم کے فوائد کے حصول کیلئے عرب بڑی تعداد میں آنے لگے، سومناتھ، کھنبایت، بھروچ، چیمور (متصل بمبئی)، سوپارہ، تھانہ میں ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں قائم ہو گئیں، ہارون رشید کے عہد میں یحییٰ برمکی کی رائے سے ایک وفد علمی تحقیقات کے لیے یہاں آیا، جس نے واپس ہو کر ایک رپورٹ پیش کی، جس کا خلاصہ ابن ندیم نے اپنی کتاب میں دیا ہے، اسی طرح جڑی بوٹیوں کی تلاش و جستجو کے لیے بھی ایک وفد یہاں آیا تھا، ہارون رشید نے اپنے علاج کے لیے ایک طبیب (ویدہ) بھی بغداد بلوایا تھا، اور جب اس کے علاج سے صحت یاب ہو گیا تو بلخ کے راستے سے اس کو ہندوستان واپس کیا، کچھ لوگوں کو سنسکرت کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے بیت الحکمۃ میں مقرر کیا گیا

جنہوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

پہلی صدی ہجری سنہ ۶۹۲ء کے آخر میں سولنکی خاندان کا راجہ بھوڑ تمام گجرات پر قابض ہو گیا، اس کے عہد میں گجرات کی سرحد سندھ تک پہنچ گئی، اور اس نے سرحدی باشندوں کو تنگ کرنا شروع کیا، اس کو عرصہ تک برداشت کیا گیا، لیکن دکنی سولنکی حاکم جب نہ مانے تو سنہ ۱۰۷ھ ۷۲۵ء میں سندھ کا گورنر جنید ایک بڑی فوج لیکر مانڈل، دھنج، بھروچ ہو کر اجین گیا، اور وہاں سے بھیل مال ہو کر سندھ واپس آگیا، مگر آندھی کی طرح گیا اور بگولہ کی طرح واپس ہوا، اس لیے اسکا کوئی خاص اثر گجرات پر قائم نہیں رہا۔

اس بعد چار سو برس تک دونوں قوموں کے تعلقات اسی طرح محبت کے ساتھ قائم رہے، لیکن چوتھی صدی کے آخر میں عربوں کا زوال شروع ہوا، ایران، ترکستان اور افغانستان میں ترک برسراقتدار آئے، پانچویں صدی کے شروع ہوتے ہی افغانستان میں غزنویوں کی حکومت بڑی زبردست ہو گئی، پہلے سبکتگین اور پھر اس کے لڑکے سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر پے در پے حملے کر کے بے اطمینانی پیدا کر دی، سنہ ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود غزنوی نے خاص گجرات پر حملہ کیا، اس وقت راج دھانی پٹن تھی، بھیم دیو راجہ تھا، سلطان پٹن سے دھولکہ کے راستہ سومنات پہنچا، اور پھر یہاں سے کچھ کا رن طے کر کے ملتان ہوتا ہوا غزنہ واپس چلا گیا، گجرات پر

یہ دوسرا سیاسی حملہ تھا، لیکن محمود غزنوی کی واپسی کے بعد گجرات پھر آزاد ہو گیا۔ ۵۷۴ھ ۱۱۷۸ء میں سلطان محمد شہاب الدین غوری کچھ کا راستہ طے کر کے گجرات میں آ دھمکا۔ راجہ بھیم دیو ثانی نے اس کو بڑی بھاری شکست دی، غوری غزنہ واپس ہوا اور وہاں پھر شمالی ہند اور ترکوں سے جنگ میں ایسا مشغول ہوا کہ پھر ادھر رخ کرنے کی اس کو مہلت ہی نہ ملی،

۵۸۹ھ ۱۱۹۳ء میں بھیم دیو راجہ گجرات کے سپہ سالار جیون رائے نے جب قلعہ ہانسی پر حملہ کیا، تو قطب الدین ایبک سلطان دہلی نے اس کا مقابلہ کیا، اس وقت قطب الدین نے سپہ سالار کو واپس کر دینے ہی پر اکتفا کیا، مگر ۵۹۱ھ ۱۱۹۵ء میں کامل تیاری کے بعد اس نے خود گجرات پر حملہ کیا، بھیم دیو پٹن چھوڑ کر بھاگ گیا، اور قطب الدین جب گجرات سے واپس ہوا، تو بھیم دیو پھر اپنی سلطنت پر قابض ہو گیا، کچھ عرصہ کے بعد راجپوتوں نے ترکوں سے اجمیر چھین لینا چاہا، مگر شہاب الدین غوری کی بروقت مدد سے ناکام ہو گئے۔ اس متحدہ فوج میں جیون رائے کے ماتحت گجراتی فوج بھی تھی، اس لیے قطب الدین نے ۵۹۳ھ ۱۱۹۷ء میں پٹن فتح کر لیا، اور اپنا ایک نائب مقرر کر کے چلا گیا، لیکن بھیم دیو پھر پٹن پر قابض ہو گیا، اور تقریباً سو برس تک گجرات خود مختار رہا۔

گجرات کے حکام ۶۹۷ھ کی ابتدا میں کرن باگھیلہ راجہ گجرات کا

وزیر مادھو، گجرات پر حملہ کرنے کے لیے علاؤالدین خلجی کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا، گجرات کو الغ خان سپہ سالار نے فتح کر لیا۔ اور الپ خان یہاں کا مستقل حاکم مقرر کر دیا گیا، اور اس وقت سے لیکر ۸۰۰ھ کے آخر تک دہلی کے ایک صوبہ کی حیثیت سے گجرات پر حکومت ہوتی رہی، علاؤالدین خلجی کے بعد قطب الدین متوفی (۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) اور خسرو گجراتی (۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) دہلی کے بادشاہ ہوئے (۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) میں تغلق خاندان برسرحکومت ہوا، اس میں غیاث الدین ملک تغلق غازی (۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) سلطان محمد شاہ (۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) فیروز شاہ (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) محمد شاہ ثانی (۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء) محمود شاہ (۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء) نے دہلی میں حکومت کی اور ان کے نائب صوبہ دار گجرات آتے رہے، ان صوبہ داروں میں الپ خان (۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) ظفر خان ملک دینار، نظام الملک (۷۴۶ھ/۱۳۴۵ء) ظفر خان (۷۶۴ھ/۱۳۶۲ء) دریا خان (۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء) بہترین حاکم تھے۔ جنھوں نے امن قائم رکھنے کے ساتھ تجارتی معاشرتی اور اخلاقی ترقی میں کافی حصہ لیا،

آٹھویں صدی ہجری (۱۴۰۰ء) کے آخر میں محمد شاہ ثانی تغلق نے ظفر خان بن وجیہ الملک سہارن کو گجرات کا حاکم بنایا، خاندان تغلق کے ختم ہو جانے پر یہ خود مختار ہو گیا، یہی شخص سلاطین گجرات کا مورثِ اعلیٰ ہے،

محمد شاہ اوّل (۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء) مظفر شاہ اوّل (۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء) احمد شاہ اوّل

۱۴۱۱ء)، محمد شاہ ثانی (۸۴۶ھ / ۱۴۴۲ء) قطب الدین (۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء) محمود بیگڑہ (۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء) مظفر حلیم (۹۱۶ھ / ۱۵۱۱ء) سکندر (۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء) بہادر شاہ (۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء) محمود ثالث (۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ء) احمد ثالث (۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء)، مظفر رابع (۹۶۹ھ / ۱۵۸۰ء)

گجرات کے خود مختار حکمراں ہوے۔ گجراتی راجپوت خاندان میں سے پورے تو اٹھارہ سلطان ہوے۔ لیکن ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:۔ (۱) مظفر شاہ اوّل (۲) احمد شاہ اوّل (۳) محمود شاہ اوّل (۴) مظفر شاہ ثانی (۵) بہادر شاہ۔ ان کا شمار اُن سلاطین میں ہے جن پر گجرات بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اور بہادر شاہ نے فتوحات کا دروازہ کھول کر سلطنت اس قدر وسیع کر دی کہ نصف ہندوستان کا وہ شاہنشاہ بن گیا۔ زراعت، تجارت، تعمیرات اور علوم و فنون میں گجرات کو اس قدر بلند مرتبہ پر پہنچا دیا کہ آج انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فوجی اعتبار سے بھی گجرات کا صوبہ ہندوستان کے دیگر صوبوں پر فضیلت رکھتا تھا۔ اس کے بانی محمود کے زمانہ میں فوجوں کی تعداد علاء الدین خلجی شہنشاہ دہلی کی فوجوں کے برابر تھی۔ اس کا توپخانہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ تمام ہندوستان میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ بحری بیڑا بھی لاجواب تھا۔ ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء میں اس صوبہ پر محمد اکبر بادشاہ دہلی قابض ہوا، اور اس وقت سے مغل شہنشاہوں کے ناظم آتے رہے۔ جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) شاہجہاں (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) اور نگزیب عالمگیر

(۱۰۶۸ھ ۱۶۵۷ء) محمد معظم بہادر شاہ (۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء) تک تو نظامت کا سلسلہ ٹھیک رہا، لیکن اس کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی تو یہ سلسلہ ۱۱۵۶ھ ۱۷۴۳ء میں ختم ہوگیا۔ اور پھر گجرات پر قبضہ پانے کے لیے امراء میں کش مکش رہی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۱۷۱ھ ۱۷۵۸ء میں احمد آباد پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا، اور چند چھوٹے بڑے ضلعوں پر مسلمان امراء کو قناعت کرنی پڑی، جوناگڑھ، رادھن پور، پالن پور، کھنبایت وغیرہ پر ان ہی امراء کی اولاد آج حکومت کر رہی ہے،

مغلیہ عہد میں گو گجرات کو ویسی ترقی تو نہ ہوئی جیسی خودمختار سلاطین گجرات کے عہد میں تھی، لیکن انھوں نے گجرات کو زوال پذیر ہونے نہ دیا، اور اس کو اچھی حالت اور اصلی رنگ میں رکھنے کی پوری کوشش کی، چنانچہ فوجی بھرتی، تجارتی ترقی، صنعتی کارخانے کے قیام میں انھوں نے بڑا کام کیا، پبلک کی حوصلہ افزائی کے لیے احمد آباد میں صنعتی کارخانے قائم کیے گئے، ان کے عہد میں عمارتیں بھی کافی تعداد میں بنیں جن میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں، مغلوں کو کھانوں اور باغوں سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے احمد آباد میں ایرانی اور مغل طرز کے متعدد باغ لگوائے، کھانوں کے مختلف اقسام کے نمونے آج بھی سورت میں مل سکتے ہیں، لباس کے بھی گوناگون نمونے اسلامی آبادی میں خصوصاً عورتوں میں اس وقت بھی آپ کو نظر آئیں گے، بڑے گھیرے کا پائجامہ جو بیبیاں کے پیشہ ور

خاندانوں کی عورتیں گھر سے باہر استعمال کرتی ہیں. وہ مغلوں
ہی کی ایجاد ہے۔

سلطنت کے حدود | سلاطین گجرات کے عہد میں گجرات کے حدود
کم و بیش ہوتے رہے، اسی سبب سے ان کے حدود اربعہ بھی
بدلتے رہے، یہاں حدود اربعہ کے بجائے ان ضلعوں کا نام لکھا
جاتا ہے، جو ان کے قبضہ میں رہے، تاکہ آسانی کے ساتھ ان کے
مقبوضات اور حدود اربعہ سمجھ میں آجائیں۔

بعہد مظفر شاہ اول | مظفر شاہ اول جو گجرات کی سلطنت کا
بانی ہے، اس کے قبضہ میں مندرجۂ ذیل صوبے تھے، جالور،
ناگور، نندرباد، دھولکا، دھندھوکا، پٹن، بڑودہ، بھروچ،
کپڑونج، رانڈیر (سورت) کھنبایت، سومناتھ، کڑی. (احمد
آباد) خاص گجرات یعنی پٹن سے لے کر ہر طرف مغربی جانب
سمندر تک اس کی حکومت تھی، کاٹھیاواڑ کا بڑا حصہ اور گجرات
کا جنوبی سرحدی حصہ اس کی سلطنت سے خارج تھا، مالوہ
اور خاندیس اس کے باج گذار تھے۔

بعہد احمد شاہ اول | ناگور، جالور، نندرباد، دھولکا، دھندوکا
پٹن، بڑودہ، بھروچ، کپڑونج، رانڈیر (سورت) کھنبایت
سومناتھ، احمد آباد (مع کڑی) احمد نگر (ایڈر) تھانہ (بمبئی)
ماہنور، جالاواڑ (پایہ تخت) ویرم گام، داہود (دوحد)

سلطان پور، تھانہ اس کے ماتحت تھے،

بعہد سلطان محمود اعظم عرف بیگڑہ | ناگور، جالور، نذرباد، سلطان پور، تھانہ، دھولکا، دھندھوکا، پٹن، بڑودہ، احمد آباد، بھروچ کرونج، راندھر، (سورت) کھنبایت، احمد نگر، دہانم (بمبئی) بالاسنور، چھالاواڑ (پایہ تخت دیرم گام داہود (دوحد) تھانہ، خاندیس، چاپانیر، جوناگڑھ، دوارکا، دیو، دمن، سندھ کا کچھ حصہ، یہ تمام ضلعے براہ راست اس کے دائرۂ حکومت میں تھے، اس کے علاوہ کاٹھیاواڑ اور گجرات، کاٹھا کی غیر مسلم ریاستیں جیسے ریڈر، راج پیلا وغیرہ اس کی باجگذار تھیں،

بعہد سلطان مظفر حلیم | سلطان مظفر حلیم کے عہد میں بھی یہی ضلعے رہے، اس نے مالوہ فتح کر لیا تھا، لیکن محمود خلجی کو واپس کر دیا، اس کے عہد حکومت میں کسی نئے ملک کا اضافہ نہیں ہوا،

بعہد سلطان بہادر شاہ | ناگور، جالور، نذرباد، سلطان پور، دھولکا، دھندھوکا، پٹن، بڑودہ، احمد آباد، بھروچ، کیرونج، راندیر، (سورت) کھنبایت، احمد نگر، دہانم، بالاسنور، چھالاوار، داہود، تھانہ، چاپانیر، جوناگڑھ، دوارکا، دمن، دیو، سندھ کا کچھ حصہ، اجمیر، چتوڑ، مالوہ، خاندیس، برار، دولت آباد اس کے مقبوضات میں داخل تھے، اس کے علاوہ کاٹھیاواڑ کی غیر مسلم ریاستیں، گجرات کی جنوبی سرحدی ریاستیں، نظام شاہی، عادل شاہی

بڑی پیشاہی، اور بگلانہ وغیرہ اس کے باج گذار تھے،

عہد سلطان محمود ثانی بہادر شاہ کے وفات پا جانے پر سلطان محمود تخت نشین ہوا، تو امرا کی خانہ جنگی کے باعث تمام گجراتی علاقے ہاتھ سے نکل گیے، صرف مندرجۂ ذیل ضلعے رہ گیے،

مذرباد، سلطان پور، دھولکا، دھندھوکا، پٹن، احمد نگر، احمد آباد، بڑودہ، بھروچ، کیرونج، سورت، کھنبایت، گوگہ، سومناتھ، دھاتم، بالاسنور، جھالاواڑ، واہود، چانپانیر، جونا دیو، دمن،

فوج سلطنت کی مضبوطی صرف اُسی وقت ہو سکتی ہے، جبکہ اس کا فوجی نظام مکمل ہو، اسی لیے آج تک دنیا کی ہر سلطنت نے سب سے پہلے اسی محکمہ کی طرف توجہ کی، اور ان کو خوش رکھنے کے لیے ان کے ساتھ ہر ممکن مراعات کی گئیں۔

فوجی نظام کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ فوج کی تعداد ملک کی وسعت کے لحاظ سے ہو، بہترین آلاتِ جنگ سے آراستہ ہو، اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے، جس سے وہ دل وجان سے حکمران اور ملک کی وفادار ہو، سپاہی اسی وقت وفادار ہو سکتا ہے، جب کہ خود اس کو اور اس کے اہل وعیال کو آرام پہنچنے کا یقین ہو، اسی لیے دنیا کی ہر سلطنت اور ہر بیدار مغز فرماں روا سپاہیوں کی تنخواہ کا نظام پہلے قائم کرتا ہے، ہندوستان

انگریزوں کو مضبوط کرنے والے خود ہندستانی سپاہی تھے جن کو وقت پر پوری پابندی کے ساتھ تنخواہ مل جاتی تھی۔ اگر ہندستان کے راجے، مہاراجے، نواب اور دہلی کے سلاطین سپاہیوں کی چھ چھ مہینے کی تنخواہ باقی رکھنے کے بجائے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ دیدیا کرتے تو وہ انگریزوں کی بہ نسبت اپنے ملکی حکمرانوں کے زیادہ وفادار ہوتے۔

علاءالدین خلجی کے عہد میں فوج کی تنخواہ نقد دیجاتی تھی۔[1] لیکن تغلق نے اس کے بجائے جاگیر کا طریقہ اختیار کیا۔[2] سلطان مظفر اول، سلطان محمد شاہ اول اور سلطان احمد شاہ اول کے ابتدائی عہد سلطنت میں یہی طریقہ رائج رہا۔

۸۳۲ھ میں احمد شاہ اول نے ایک جدید اسکیم تیار کی، یعنی ہر سپاہی کو نصف تنخواہ وہاں ملے جہاں وہ رہتا ہو، اور نصف کی جاگیر ملے۔ تاکہ سپاہی سفر میں تنگ دست ہو کر قرضدار نہ ہو، اور اس کے اہل و عیال گھر پر فاقہ نہ کرنے لگیں۔[3] اس جدید انتظام سے متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ اول یہ کہ فوج میں وفاداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ دوسرے رنگروٹوں کے ملنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی، تیسرے خاندانی سپاہی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر

---

[1] فیروز شاہی ضیاء برنی [2] مسالک الابصار جلد دوم مصر [3] مرآۃ سکندری۔

والیوں میں بغاوت کا مادہ پیدا ہو گیا، قطب الدین کے زمانہ میں اسکو
فوج کو وسیع بنایا گیا، اور ملک کی آمدنی کا $\frac{1}{4}$ حصہ فوجیوں
اور اہلِ علم کے لیے مقرر کیا گیا، سلطان محمود کے عہد میں اس میں
اور اضافہ ہو گیا، اس کا حکم تھا کہ سپاہیوں کی اولاد نرینہ نہ ہو
تو لڑکیوں کو دے دو، اور وہ بھی نہ ہوں تو رشتہ داروں کے
سپرد کر دو، اس کا بڑا اچھا اثر رنگروٹوں کی بھرتی پر پڑا، قطب الدین
احمد شاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں جب کہ محمود خلجی سلطانِ مالوہ کی
کثرتِ فوج سے سارا گجرات لرز رہا تھا، اور وہ بھروچ ہوتا ہوا
کپڑ ونج پہنچ گیا، تو قطب الدین نے جس کو تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی
صرف چند دن ہوئے تھے، چالیس ہزار فوج تیار کر لی، اور باوجود
کمی تعداد کے یہ فوج محمود کی فوج پر غالب آئی، سلطان محمود اول
کو فوجی نظام درست کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا، اس کے عہد
میں فوج اس قدر مکمل تھی کہ آس پاس کی کسی حکومت کے پاس نہ
تھی، ۱۴۶۰ء / ۸۶۵ھ سے ۱۴۶۳ء / ۸۶۸ھ تک یعنی چار سال تک سلطان محمود
اول نے تمام گجرات کی آمدنی صرف فوج پر خرچ کی، خود اس کی جاگیر
میں ایک گاؤں بھی نہ تھا، تمام شاہی اخراجات خزانے سے ہوتے
تھے جن کو پہلے کے بادشاہوں نے جمع کیا تھا، اس کی فوج میں بڑے
بڑے افسروں کی تعداد دس ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی گجراتی بادشاہ
کے یہاں بھی نہ تھی۔

مظفر حلیم کے عہد میں کسی خاص ترقی کا پتہ نہیں چلتا۔ بہادر شاہ گجراتی کے عہد میں مملکت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ اسکے لیے محمود اوّل کی فوج بالکل ناکافی ثابت ہوئی۔ اس لیے فوج کی تعداد بہت زیادہ کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گجرات کے محاصل پر فوج کا دارومدار نہ رہ سکا، مجبوراً سب کی تنخواہ نقد ہو گئی،

جاسوسی | فوجی جاسوسی کا انتظام بھی معقول تھا، چنانچہ رانا سانگا نے جب فوج کشی کا ارادہ کیا، تو اس کی خبر فوراً گجرات پہنچ گئی اور سلطان قطب الدین نے اسی وقت فوج کے کوچ کا نقارہ بجوا دیا، جس کا غنیم پر بڑا اثر پڑا، اور وہ اپنے ارادہ سے باز آ گیا، اسی طرح چتوڑ کی فتح کے وقت جب ہمایوں سے ان بن ہو گئی، تو جاسوسوں کے ذریعہ روزانہ آگرہ سے سلطان بہادر کے پاس ڈاک آتی تھی اور وہ اس طرح حریف کے ارادوں سے باخبر رہتا تھا، (ظفر الوالہ جلد اوّل صفحہ ۲۳۰) وہ تاجروں کے ذریعہ جاسوسی کا کام زیادہ لیتا تھا،

جب فوج روانہ ہوتی تو سب سے پہلے بادشاہ کا سراپردہ کیا جاتا، اور بادشاہ کے کوچ کرنے کی یہی علامت سمجھی جاتی۔ فوج کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ سب سے پہلے ہراول کا دستہ ہوتا، پھر میمنہ، اس کے بعد میسرہ اور درمیان میں قلب، سب سے آخر میں فوج محفوظ خود بادشاہ (سپہ سالار) قلب میں ہوتا۔ اکثر اوقات

بادشاہ خود کمان کرتا، رات کو جنگی کونسل بیٹھتی، اور وہ جو مشورہ دیتی اس پر عمل کیا جاتا، بادشاہ کی غیر حاضری میں شاہزادہ یا دزیر نائب کی حیثیت سے پایہ تخت میں رہتا، تاکہ ملک کا انتظام بدستور قائم رہے۔

فوجوں کی تعداد | سلاطین گجرات کی فوجیں مختلف عہد میں تعداد کے لحاظ سے کم و بیش رہی ہیں، سلطان مظفر اوّل کے عہد میں فوج کی تعداد بہت معمولی تھی، جب گورنر (ناظم) ہو کر پٹن پہنچا ہے تو اسکے پاس صرف چار ہزار فوج تھی۔[۱] اگرچہ تاریخوں ین میری نظر سے یہ بات نہیں گذری کہ آخر زمانہ میں اس کے پاس کس قدر فوج تھی لیکن اس عہد کے حالات کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس دس پندرہ ہزار سے زیادہ فوج نہین تھی، سلطان احمد اوّل صیحح معنی مین گجرات کا پہلا خود مختار بادشاہ ہوا، اس کی سب سے آخری جنگ مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود خلجی سے ہوئی، اس جنگ مین اس کی فوج میں بیس ہزار سوار تھے، اور تین سو ہاتھی، اور پانچ ہزار سوار اس کے لڑکے محمد خاں کے ماتحت تھے، اور کچھ فوج احمد آباد میں محفوظ رہی ہوگی، اس طرح اس کی کل فوج کی تعداد تیس پینتیس ہزار ہوگی، اور جنگی ہاتھی بھی اس کے پاس تین سو سے زیادہ رہے ہوں گے، پھر اس کے پاس توپ خانہ بھی تھا جسکو

---

[۱] تاریخ گجرات جلد اوّل

پیل اور ہاتھی کھینچ کر لیجاتے تھے،

سلطان قطب الدین کے ابتداے عہد مین اس کے پاس چالیس ہزار فوج تھی، جسکو لے کر وہ سلطان محمود خلجی سے لڑا تھا، بہت ممکن ہے آخر زمانہ میں اس سے بھی تعداد بڑھ گئی ہو یہانتک کہ لاکھ تک پہنچ گئی ہو، سلطان محمود کے پاس جب کہ وہ ۸۶۶ھ میں شاہ دکن کو امداد دینے کے لیے چلا ہے، ستر ہزار سوار تھے، بروایت مرآۃ سکندری ابتدا مین محمود کے پاس پانچسو جنگی ہاتھی، اور قطب الدین سے دوگنی فوج تھی، اگر آخر مین اس کے پاس دو لاکھ فوج ہو گئی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہین ہے، کیونکہ اس کی مدت سلطنت پچاس برس سے زیادہ تھی، سلطان مظفر نے چتوڑ فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی تو اس میں ایک لاکھ بیس ہزار سوار اور ایک سو بیس ہاتھی تھے، فتح منڈو کے وقت اس کے پاس تین لاکھ سوار تھے[۱]، ایک قلمی کتاب گلشن گجرات مین ہے کہ اس کی کل فوجوں کی تعداد[۲] پانچ لاکھ تھی[۳]، جنگی ہاتھی بھی پانچسو سے کم نہ ہون گے، سلطان محمود اول نے توپ خانہ کو بڑی ترقی دی تھی یہانتک کہ بحری جہازون پر بھی توپین چڑھائی گئین اور غنیم پر حملہ کے وقت انکو استعمال کیا گیا جو ہندوستان کیلیے بالکل نئی بات تھی، مظفر کے عہد میں اس توپ خانہ سے جنگ مالوہ مین خوب کام لیا گیا،

---

[۱] طبقات اکبری صفحہ ۱۴۰ جلد سوم کلکتہ [۲] ظفر شاہی قلمی صفحہ ... اس مین مجاہدین کی وہ تعداد بھی شامل ہے جو تنخواہ دار سپاہیون کے علاوہ تھی،
[۳] گلشن گجرات بیان خوند میر قلمی،

بہادر شاہ نے جس وقت دولت آباد پر حملہ کیا ہے تو ایک لاکھ پچیس ہزار سوار اور نو سو ہاتھی اس کے ساتھ تھے۔ سترہویں صدی کا پرتگیزی سیاح فاریا سوزا لکھتا ہے کہ سلطان بہادر گجراتی کے پاس ایک لاکھ سوار اور چار لاکھ پندرہ ہزار پیدل سپاہی تھے اور چھ سو جنگی ہاتھی تھے اور اس کا توپخانہ اس قدر عمدہ تھا کہ ہندوستان بھر میں کسی کے پاس نہ تھا۔ بحری بیڑہ بھی اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ سلطان محمود دوم بن لطیف خاں کے پاس ایک لاکھ سوار تھے، توپخانہ بھی اعلیٰ درجہ کا تھا، لیکن افضل خاں کے زمانۂ وزارت میں اس کے پاس ایک لاکھ سوار اور دو لاکھ سے زیادہ پیادہ فوج تھی۔

سلطان مظفر آخری بادشاہ کے عہد میں امیروں کی خانہ جنگی نے ملک کو تباہ کر دیا۔ اور فوجی اقتدار پر سارا دارومدار ہو گیا اس کا بدترین نتیجہ یہ نکلا کہ مرکز کی فوجی طاقت بہت کمزور ہو گئی، اور وہ امیروں میں اس طرح تقسیم ہو گئی :-

الغ خاں حبشی کے ماتحت سات سو، عماد الملک رستم رومی (ترکی) کے تحت تین سو، ہیبت خاں بھیلم چار سو، امین خاں غوری چھ سو۔ محمد سلطان کے لڑکے (مغل) پانچسو، سید حامد بخاری پانچسو، شیر خاں فولادی (افغان) چار ہزار، اختیار الملک گجراتی پانچ ہزار سوار،

مرآۃ سکندری ص ۲۱۵ بمبئی ۔ تاریخ بیجاپور ص ۷۰ دہلی ظفر الوالہ جلد دوم ص ۷۰۵ لندن ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۰۷ ۔ لندن

جہانگیر خاں واسد خاں (ترک) کے ماتحت پانچسو توپ، چھ ہزار گولیاں، بارہ ہزار بندوقیں تھیں[۱]، اس کے علاوہ حسن قلی دکھنی، فتح خاں بلوچی، اور راجہ سلہدی اور راجہ نرسنگھ وغیرہ غیر مسلموں کے تحت ایک لاکھ فوج تھی جس میں سوار اور پیادے دونوں شامل تھے، اس طرح سے یہ فوج دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت کافی تھی،

بہادر شاہ کے بعد بحری بیڑہ البتہ بہت کمزور ہو گیا تھا، پھر بھی محمود ثالث بن لطیف خاں کے عہد میں جو جدید جہاز تیار ہوئے وہ اس قدر کافی تھے کہ حریف (پرتگیزی) اس سے خائف رہتے تھے،

بحری بیڑہ ہندوستان کا مغربی جنوبی حصہ بحر عرب کے کنارے واقع ہے، اور گجرات اس کے وسط میں ہے، اس لئے ہر گجراتی بادشاہ کو ملک کی حفاظت اور بیرونی تجارت کے لئے بحری بیڑا رکھنا پڑتا تھا۔ سب سے پہلے احمد شاہ اول نے بحری بیڑا تیار کرایا، اور تھانہ کی جنگ میں اس کو استعمال کیا، کھنبایت کا بندرگاہ اس کا مرکز تھا۔ محمود اول نے اس بیڑے کو بہت مضبوط بنا دیا، مالا باری قزاقوں نے جب سمندر میں لوٹ مار مچائی۔ تو ان کی تنبیہ کے لئے گھوگھہ بندر سے ایک بیڑا روانہ کیا گیا جو کامیاب واپس آیا،

---

[۱] ظفر الوالہ ج ۲ ص ۵۰۸، لندن

اس زمانہ میں جہاز کھنبایت میں تیار ہوتے تھے، جن کو ہر قسم کے جنگی سامان سے مسلح کیا جاتا تھا۔ جب ڈابھول بندر پر حملہ کرنے کے لئے بیڑا روانہ ہوا تو اس میں تین سو جنگی جہاز تھے[1]۔

اسی بادشاہ کے زمانہ میں جنگی جہازوں پر توپ چڑھائی گئی اور پرتگیزوں کو سمندری لڑائی میں سخت شکست دی گئی، ملک ایاز سلطانی اس بیڑے کا امیر البحر تھا۔ سلطان بہادر نے سولہویں صدی عیسوی میں اس بیڑے کو اور زیادہ ترقی دی، ترکی اور پرتگیزی ہر قسم کے جہاز کھنبایت میں تیار کرائے، اور جزیرہ دیو کو اس کا مرکز بنایا، اس بیڑے کا امیر البحر ملک طوغان یہیں رہتا تھا، سمندر میں اس کا اس قدر رعب غالب تھا کہ جب تک وہ اس عہدہ پر مامور رہا، پرتگیزوں کو گجرات کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اگر پرتگیزوں نے سلطان بہادر کے ساتھ غداری نہ کی ہوتی تو وہ بہت جلد پرتگیزوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکال دیتا۔ اور آج ہندوستان کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جہازوں کے الگ الگ نام تھے۔ جنگی جہازوں میں سے کسی کا نام بیرشت اور کسی کا غراب تھا، مسافروں کے جہاز کو سفریہ اور بعض کو سنبوق کہتے تھے[2]، جہاز تین قسم کے ہوتے تھے۔ جنگی، تجارتی، مسافری، ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ نام ہوتے، مثلاً مسافری جہازوں میں کسی کا نام مدینہ

---

[1] برہان مآثر ص ۱۴۱۔ دہلی [2] ظفر الوالہ ج ۱ حالات بہادر شاہ،

کسی کا زہر ار کسی کا چنگیزی ہوتا ، (دیکھو ضمیمہ گجرات کا بحری بیڑا)

آلاتِ جنگ | خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ احمد آباد میں اسلحہ سازی کے کارخانے تھے ، اور تلوار بہت اچھی بنتی تھی ، تلوار ، تیر ، نیزہ ، خنجر ، جمدھر جیسے عام اسلحہ کے علاوہ خاص قسم کے آلاتِ جنگ میں سے ایک منجنیق ہے ، سلطان مظفر اوّل کے زمانہ میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہوا ، یہ قلعہ شکنی کے کام میں زیادہ آتی تھی ، لیکن توپ کی ایجاد نے اس کو بے کار کر دیا ، اس کے ذریعہ سے بڑے بڑے بھاری پتھر اوپر پھینکے جاتے تھے ، اور روغنِ نفت پھینک کر اندرونِ قلعہ میں آگ لگا دیتے تھے ،

آلاتِ جنگ میں دوسری چیز بندوق اور توپ تھی ، بندوق کا استعمال تو بالکل آخری زمانہ میں یعنی سلطان محمود سوم اور سلطان مظفر کے عہد میں ہوا ، لیکن توپ ہندوستان میں سب سے پہلے علاءالدین خلجی کے عہد میں آئی ، اور پھر آہستہ آہستہ ہندوستان میں رواج پاگئی ، خاص گجرات میں احمد شاہ اوّل کے زمانہ میں رائج ہوئی ، ۸۲۵ھ ۱۴۲۱ع کی جنگ مالوہ میں اس کو پہلی دفعہ استعمال کیا گیا ، فرشتہ لکھتا ہے کہ گجرات سے قلعہ فتح کرنے کے لئے سامانِ جنگ مثلاً منجنیق ارابہ وغیرہ طلب کیا - (ارابہ کے معنی گاڑی کے ہیں ، لیکن اصطلاح میں خاص اس گاڑی کو کہتے ہیں جس پر توپ رکھی جاتی ہے) ظفر الوالہ میں ہے ارابہ سے مراد ایسی گاڑیاں ہیں جن کو دو بیل کھینچتے ہیں ، اور ہندوستان

میں اس پر عمل (توپ) رکھتے ہیں، اس کی تائید گجرات کی ایک قلمی تاریخ سے بھی ہوتی ہے، اس میں احمد شاہ کے عہدہ داروں کی ایک فہرست بھی مع اُن کی تنخواہوں کی تفصیل کے دی ہے، اس زمانہ میں توپیں بڑی وزنی ہوتی تھیں اس لئے اُن کو ہاتھی کھینچتے تھے، ہاتھی نئے اس محکمہ کا نام توپ خانہ فیل تھا، اس کے افسر کی تنخواہ دو ہزار ٹنکہ تھی[1]

سنہ ۸۶۷ھ میں سلطان محمود اوّل نے قلعہ شکن اور میدانی توپوں کے علاوہ خاص بیڑے کے لئے بھی توپیں تیار کرائیں، اور مالابار کی بحری جنگ میں اُن کو استعمال کرکے نمایاں فتح حاصل کی،

گجرات کا مشہور ترین قلعہ چانپانیر ۸۸۹ھ میں اسی توپ کے ذریعہ فتح ہوا، سنہ ۹۱۵ھ میں سلطان محمود کا بیڑا بڑا زبردست ہوگیا تھا، کاٹھیاواڑ سے لے کر مالابار کی سرحد تک اس کے ذریعہ حفاظت ہوتی تھی، جب پرتگیزیوں نے ساحلی مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرنا چاہا، اور اُن کی لوٹ مار سے اسلامی ممالک کے جہازوں کی آمدورفت موقوف ہورہی تھی سلطان نے ملک ایاز کو حکم دیا کہ دیو، دمن، اور تھانہ سے جہازوں کا بیڑا لے جاکر جنگ کرے، چنانچہ اس جنگ میں گجراتی توپ خانہ نے آتش باری کرکے متعدد جہازوں کو غرق کردیا، اور غنیم کو شکست ہوگئی،

---

[1] گجرات کی تاریخ قلمی مملوکہ نضیلت النسار بیرونی،

۹۲۱ھ/۱۵۱۸ء میں سلطان مظفر حلیم نے جب منڈو (مالوہ) پر حملہ کیا تو قلعہ کے محاصرہ میں توپیں موجود تھیں، مظفر شاہی میں ملا قانعی نے اس کو تفصیل لکھا ہے[۱] سلاطین گجرات میں بہادر شاہ کو توپوں سے عشق تھا۔ اس نے طرح طرح کی توپیں جمع کیں، اور ایسی توپیں بنوائیں کہ ہندوستان میں اس وقت تک کسی نے نہیں دیکھی تھیں، رومی خان ترکی جیسا ماہر فن بہادر شاہ کے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ تھا، لیلیٰ مجنوں اور دو دوسری سلیمانی مصری توپیں وہ خود اپنے ساتھ لایا تھا۔ بہادر شاہی نام کی ایک توپ گجرات میں تیار کی گئی تھی، اس تفصیل سے میرا مقصود یہ ہے کہ مغل سلطنت کے بانی بابر بادشاہ کے ہندوستان میں آنے اور پانی پت کی جنگ سے قبل ہندوستان کے بعض صوبوں میں اعلیٰ پیمانہ پر توپ خانہ موجود تھا، اور اس میں گجرات کو فخر و تقدم حاصل تھا۔

بندوقی بھی یمن کے راستہ سے سب سے پہلے گجرات میں آئی، چنانچہ مظفر شاہ کے آخری عہد میں بارہ بندوقی باز فوج میں موجود تھے[۲]۔

سلطان محمود نے ایک تیرا یجاد کیا تھا، جس کا پھل کف کے برابر چوڑا تھا، اس سے چوپایوں کا شکار کرتا[۳]۔

---

[۱] مظفر شاہی قلمی ص ۲۰ [۲] النور السافر ص ۲۰۳ بغداد [۳] ظفر الوالہ جلد ۲ ص ۵۶۸ لندن (دیکھو ضمیمہ سلاطین گجرات کا توپخانہ)

سامانِ جنگ | اس زمانہ میں مندرجۂ ذیل قسم کے اسلحے اور لباس پہنتے تھے،

تلوار، نیزہ، گرز، عمود، تیر و کمان، ناچخ، جوشن، خود، خفتان، زرہ، بغلطاق (جنگی قبا) ژوبین، آہنیں، ساعدیں، ساقین، طبل، نقارہ، بوق، کمند، چکر،

مختلف قسم کے تیروں کے پیکان، زرہ اور جوشن کے لئے، پیکان ماہی پشت، سپر کے لئے پیکان مودودی، حصار کے لئے غلولہ، خفتان برگستوان، بغلطاق اور جاگی کے لئے پیکان بے لک، سپانخی، برگ بید، بط پاٹ کے لئے پیکان بید کے پتے کی طرح، برگستوان آہنی کے لئے تیر و خدنگ، تیر کلک، تتارچہ، ایک خاص قسم کا تیر،

سپر کے اقسام حسب ذیل تھے،

سپر چوبیں، سپر شوشک، سپر نے، سپر چخ، سپر گرگ، سپر خدنگ، سپر گردہ،

کمانیں بھی مختلف قسم کی ہوتی تھیں، بعض کے نام یہ ہیں:-

چاچی، خوارزمی، پروانچی، غزنچی، لاہوری، کروری، ہندوی، کوہی، ان میں سے کوہی پہاڑی علاقوں کے اور گجرات (بھروچ) کے لوگ زیادہ استعمال کرتے تھے، اس میں لکڑی بالکل نہیں ہوتی تھی، سینگ سے بنائی جاتی، اور بہت خوشنما ہوتی، ہندی تیر و شاخہ ہوتی، پھل ہڈی کا ہوتا، جو بڑا زہردار ہوتا، سانپ کے

زہر کی طرح فوراً بدن میں سرایت کر جاتا،

تلوار کی بھی بہت سی قسمیں تھیں، مثلاً چینی، روسی، رومی، فرنگی، یمانی، سلیمانی، شامی، علائی، ہندی، کشمیری، ان میں سب سے بہتر تیغ ہندی ہے، اس کی بھی مختلف قسمیں تھیں، پرالک، ترادتہ، رودھینا، مقبر، مان گوہر، پرگس (موج دریا) باحری، سورمال، تورمال، موج دریا، رودھینا، ترادتہ، پرالک بہترین تلواریں تھیں جو ہندوستان کے سوا کہیں نہیں ملتی تھیں،

ہندوستان میں تلوار کی ایک قسم "نباہ" تھی، وہ نرم لوہے، تانبے اور چاندی کے مرکب سے بنائی جاتی، چاندی کے سبب سے اس کے جوہر چکیلے ہوتے، اس کا گھاؤ کم بھرتا، پرالک، ترادتہ، مان گوہر، پرگس اور مقبر سلاطین کی کمر اور رکاب کی زینت بنتی تھیں،

ناچخ شاہی حربہ ہے، دوست دشمن دونوں کے کام آتا، دشنہ عیاروں اور جانبازوں کا حربہ ہے، کٹار کا استعمال زیادہ تر ہندو اور غدار لوگ کرتے ہیں، سیل (بھالا) اور ژوپین (دوشاخہ برچھی) ہندو اور افغانوں کا آلۂ جنگ تھا، پیل کش، اور نیم نیزہ پیادوں کے حربے ہیں، اور وہ لوگ رکھتے تھے جو سپرزخ (چھج) اور سپر گردہ سے بچاؤ کرتے تھے، نیزہ، خشت، دورباش، شاہی محافظوں کے ہتھیار تھے، ہندوستان کے بانس کا نیزہ بڑے اعلیٰ پیمانہ کا ہوتا، نر بانس سے مادہ بانس زیادہ کارآمد اور ہلکا ہوتا[۱]،

---

[۱] آداب الحرب والشجاعۃ لاہور۔

بیرونی لکھتا ہے کہ ہندوستان کی تلواروں میں پرالک سب سے بہتر ہے، قنوج (کنوج) میں تیار ہوتی روہنیا ملتان میں، مان گوہر بھی وہیں بنتی، پھر باخری (یاباجری) اور مجلبا (موج دریا) جس میں نقش و نگار اور صورتیں بناتے تھے یہ سب بہت بہتر ہوتی تھیں،

نیزوں کے اقسام یہ ہیں: قلم، برچھی، نیزہ، بھالا، سیل، ژوبین، دورباش، یہ سب ایک ہیں لیکن بانس اور اوپر کے پھل کی وجہ سے ان کے مختلف نام اور کام ہو گئے ہیں[1]

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ گجرات کی تلوار سب سے بیش قیمت ہوتی، کیونکہ آب و ہوا کے علاوہ، وہاں کے ایک مخصوص کنوئیں کا پانی تلواروں کی آب کے لئے بیحد مفید تھا۔ سروھی کے ہتھیار آج بھی مشہور ہیں، جو گجرات کا مشرقی پہاڑی علاقہ ہے؛

فوجی بھرتی فوجی بھرتی میں کوئی تفریق نہ تھی، ہر نسل اور ہر مذہب کا آدمی فوجی شرائط کے مطابق لے لیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں محمود غزنوی کے بعد احمد شاہ گجراتی پہلا بادشاہ ہے جس نے فوج میں ہندوؤں کو برابری کا حصہ دیا، چنانچہ مالوہ کی جنگ میں ہندوؤں کی فوج بھی اس کے ساتھ تھی، مظفر حلیم نے جنگ مالوہ میں بھیل تیر اندازوں کی فوج بھی اپنے ساتھ رکھی تھی، بھرتی زیادہ تر

---

[1] کتاب الجماہر مطبوعہ حیدرآباد (۱۳۵۵ھ)

ان خاندانوں سے ہوتی جن کا پیشہ سپاہ گری ہوتا، اُن کو نصف تنخواہ نقد اور نصف کی جاگیر ملتی تھی، تاکہ وفادار سپاہی ملک میں پیدا ہوں، غیر ملکی بھی فوج میں بھرتی ہوتے، جیسے رومی (ترکی) حبشی، دکھنی، بلوچی، مغل، عرب، بھیلم، بھٹی، غوری، غیر گجراتی ہنود وغیرہ، یہ سب فوجیں اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت فرائض انجام دیتیں،

خطابات اور عہدے | تغلق کے عہد میں چار خطابات تھے، خان، ملک، امیر، سپہ سالار، خان کے ماتحت دس ہزار فوج، ملک کے ماتحت ایک ہزار، امیر کے ماتحت ۱۰۰، اور سپہ سالار کے ماتحت اس سے بھی کم فوج ہوتی، خان کی تنخواہ دو لاکھ ٹنکہ کی جاگیر، اور ملک کی پچاس ساٹھ ہزار ٹنکہ کی جاگیر، اور امیر کی تیس چالیس ہزار ٹنکہ تک کی جاگیر، اور سپہ سالار کی بیس ہزار ٹنکہ کی جاگیر ہوتی تھی، اور باقی سپاہیوں کو نقد تنخواہ ملتی تھی[1]،

تقریباً اسی اصول پر سلاطین گجرات نے بھی خطابات رکھے، خان، ملک، وین، ملک، یہ چار اصولی خطابات تھے، عہدوں میں سب سے بڑا عہدہ خان کا تھا، جیسے آصف خاں، خداوندخاں، اختیار خان، اس کے بعد ملک کا درجہ تھا، جیسے عماد الملک، عضد الملک، صفی الملک وغیرہ، پھر دین کا جیسے بہاء الدین، رضی الدین،

---

[1] مسالک الابصار جلد دوم مصر،

سب سے کمتر ملک تھا، جیسے ملک کالو، ملک شیر، ملک جیون داس
یہ خطابات کے درجے تھے، ہر درجہ کے دو قسم کے خطابات
ہوتے، مخصوص اور غیر مخصوص۔ مخصوص خطابات یہ تھے الغ اعظم ہمایوں
یہ عموماً شاہزادوں کو ملتا تھا، خداوند خاں، عماد الملک، عام طور
پہ وزرار کو دیا جاتا، محافظ خاں، قیصر خاں، الپ خاں، نظام الملک
ملک شیر جی، الغ خاں، آصف خاں، اوّل نمبر کے امرار کو دیے جاتے
صدر جہاں، خان جہاں کے خطابات درجۂ دوم کے امرار کے لئے تھے
ہندوؤں کے لئے راؤ، رائے رایان تین درجہ کے خطابات
مقرر تھے،

محکمۂ عدالت میں قاضی، قاضی القضاۃ[۵۱]، اقضی القضاۃ[۵۲]، صدر القضاۃ
ملک القضاۃ[۵۳] کے خطابات رائج تھے۔ ان خطابات کی یہ خصوصیت
تھی کہ جب تک ان میں سے کسی خطاب کا آدمی زندہ رہتا، یا اپنے
عہدہ سے معزول نہ کیا جاتا، کسی دوسرے کو وہ نہ ملتا، دوسرے
ان کے درجات کے مطابق جاگیر بھی مقرر ہوتی، خطاب یافتہ باپ
کے مرجانے سے اس کی جاگیر بیٹے کو نہیں ملتی، بلکہ اس کے مرنے
کے بعد جس شخص کو وہ خطاب ملتا، جاگیر اس کے قبضہ میں چلی جاتی
پھر اوّل اور دوم درجہ کے امرار میں سے جن کو خاص شاہی دربار

---

[۵۱] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۲۔ کلکتہ [۵۲] ظفرالوالہ جلد اول ص ۱۲۔ [۵۳] تاریخ
محمود شاہی قلمی کا آخری صفحہ [۵۴] ظفرالوالہ ج ۲ بیان محمود و مظفر لندن،

میں بیٹھنے کی اجازت ہوتی، اُن کو مجلس کہتے تھے، اُن کے رتبہ اور اعزاز کے لحاظ سے اس کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کرتے جیسے مجلس عالی مجلس سامی مجلس گرامی وغیرہ، عام وزیروں کو مجلس عالی کہا جاتا، سلطان کے نائب کے لئے مسند[1] عالی کا لفظ مقرر تھا۔

غیر مخصوص خطابات کا طریقہ یہ تھا کہ خان، ملک، دین سے پہلے کوئی موزوں لفظ بڑھا دیتے، جیسے اختیار الملک، رضی الملک، صفی الملک، عضد الملک، بہاء الدین، مؤید الدین، صفی الدین، اعتماد خان، اختیار خان، خراسان خان، رومی خان، فرنگی خان وغیرہ، خطابات سلطان کی طرف سے ملتے۔ مگر اُن کی تجویز اور سفارش وزیر اعظم کی طرف سے ہوتی۔ ایک وقت میں متعدد وزیر بھی ہوتے تھے، جیسے خداوند خان، افضل خان، آصف خان اختیار خان، بہادر شاہ کے عہد میں تھے، ہر وزیر کے سپرد الگ الگ محکمہ ہوتا، اس کی نگرانی وزیر اعظم کرتا۔

سلاطین گجرات کے عہد میں وہ جو خطابات اپنے نام کے ساتھ سکوں اور فرامین میں لکھتے یہ تھے:

شمس الدنیا والدین، ناصر الدنیا والدین، غیاث الدنیا والدین، قطب الدنیا والدین، معین الدنیا والدین، ایک ہی خطاب متعدد سلاطین نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً ناصر الدین والدنیا کو محمد شاہ اول

---

[1] ظفر الوالہ ج ۲ بیان محمود و مظفر لندن ۲۱۳ مراۃ سکندری ۱۵۔

اعتمادالدولہ اوّل محمود شاہ اوّل نے استعمال کیا، عورتوں میں والدۂ سلطان کے لئے مخدومۂ جہاں کا خطاب تھا، اور حرم شاہی کی منتظمہ قہرمانہ کہلاتی تھی،

مغلوں کے عہد میں حسب ذیل فوجی عہدے تھے، ہفت ہزاری پنجہزاری، چار ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری، یک ہزاری ہفت صدی، پنج صدی، سہ صدی، دو صدی،

ان میں سے ہفت ہزاری عموماً شاہزادوں کو ملتا تھا، باقی امراء اور اراکین سلطنت کو ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہوتے منصب کے مطابق اگر سواروں کی تعداد ہوتی تو اول درجہ، اس سے کچھ کم یا نصف ہوتی تو دوم درجہ ورنہ سوم درجہ کا امیر مانا جاتا، مثلاً پنجہزاری عہدہ دار کے پاس پانچہزار سوار ہوتے، تو وہ اوّل درجہ کا امیر ہوتا، اور جس کے پاس چار، یا تین یا ڈھائی ہزار سوار ہوتے تو وہ دوم درجہ کا امیر ہوتا، اس سے بھی کم ہوتے تو سوم درجہ کا امیر کہلاتا، (یعنی پنج ہزاری درجہ اوّل، پنج ہزاری درجہ دوم، اور پنج ہزاری درجہ سوم) خطابات بھی مخصوص اور غیر مخصوص ہوتے، مخصوص جیسے خان خاناں، منعم خاں وغیرہ، اور غیر مخصوص جیسے شجاعت خاں، رستم خاں وغیرہ۔

مغلوں میں سے بابر اور ہمایوں چونکہ خالص ترکی النسل (تاتاری) تھے، اس لئے اُن کی زبان بھی ترکی (تاتاری) تھی، اُن کے عہد میں

فوجی چیزوں کے نام بھی ترکی تھے، مثلاً یوز باشی (امیران صدہ) سو سواروں کا دستہ ان کے ساتھ ہوتا، تمن دس ہزار سواروں کا دستہ، قول (غول) قلب لشکر، برانغار (فوج کا دایاں بازو) میمنہ، جرانغار (فوج کا بایاں بازو) میسرہ، تولقمہ (تلغمہ) مددگار میسرہ یا میمنہ، التمش فوج کا ہراول، ہراول، مقدمہ یعنی فوج کا اگلا حصہ، پایک، نیم مسلح تیز رو سپاہی (قاصد اسپ یا شتر سوار) قورچی، بندوقچی، توپچی، قورخانہ، اسلحہ خانہ آردو، لشکر گاہ،

عہدہ داروں کی تنخواہ | سلاطین گجرات کے عہد میں عہدہ داروں کی کیا تنخواہ تھی، اس کا مفصل حال معلوم کرنا مشکل ہے، مگر گجرات کی ایک قلمی کتاب میں احمد شاہ اول کے عہد کی تنخواہیں درج ہیں اُن کو ذیل میں لکھتا ہوں، جس سے ایک طرح کا اندازہ ہو جائے گا،

عہدہ دار	تنخواہ	عہدہ دار	تنخواہ
۱ وزیر اعظم (مسلم)	پندرہ ہزار تنکہ	۵ سالار فوج نائب	گیارہ ہزار
۲ نائب وزیر	بارہ ہزار	۶ میر بخشی[۱]	سولہ ہزار
۳ 〃 (غیر مسلم)	دس ہزار	۷ وزیر مال	دس ہزار
۴ سالار فوج	بارہ ہزار	۸ داروغۂ اسلحہ خانہ	آٹھ ہزار

[۱] غالباً ۶ ہزار ہوگی، کیونکہ وزیر اعظم سے زیادہ کسی کی تنخواہ نہیں ہو سکتی ہے،

عہدہ دار	تنخواہ	عہدہ دار	تنخواہ
۹ داروغہ توپخانہ فیل	دو ہزار	۲۲ عربی سوار	بیاسی
۱۰ سالار شیر[۱]	دو ہزار دو سو	۲۳ عراقی و ترکی	چالیس
۱۱ داروغہ اردو (سامان رسد کا افسر)	ایکہزار تین سو	۲۴ کرانی و ایرانی	پچاس
		۲۵ پیادہ پردیسی	۴۴
۱۲ فوطہ خان کا افسر / افسر محصولات	۴۰ ٹنکہ	۲۶ گجراتی	۳۰
		۲۷ عیال دار	۳۱
۱۳ میرایلچی	ایکہزار آٹھ سو	۲۸ داروغہ چوبدار	ایک سو
۱۴ ایلچی ممالک غیر اضافہ	خلعت زریں	۲۹ چوبدار ڈلیٹ	اسی
۱۵ منادی دار	ایکہزار	۳۰ چپراسی میر منشی غیر ملکی	پچاس
۱۶ ممتاز عدالت[۲]	”		
۱۷ کوتوال مختار (کمشنر)	گیارہ سو	۳۱ ” ملکی	چالیس ۴۰
		۳۲ دفتر دار	ایک سو
۱۸ کوتوال شہر	پانچ سو	۳۳ محافظ دفتر	دو سو
۱۹ میر منشی	پانچسو	۳۴ جراح	
۲۰ منشی	آٹھ سو[۳]	۳۵ طبیب شاہی	
۲۱ داروغہ فیل خانہ	ایکہزار	۳۶ نجومی	

۱؎ جنگی کونسل کا صدر ۲؎ ان عہدوں کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی ممکن ہے چیف جسٹس اور جج ہوں ۳؎ غالباً برعکس ہوگا، یہ کاتب کی غلطی ہے۔

www.taemeernews.com

عہدہ دار	تنخواہ	عہدہ دار	تنخواہ
۳۷ - میرماہی شکار		۴۰ - مفتی شہر	
۳۸ - میرشکار		۴۱ - مفتی	
۳۹ - قاضی شہر			

ان میں سے فوجی سپاہیوں کو نصف نقد اور نصف کی جاگیر ملتی اعلیٰ عہدہ دار کو بجائے نقد کے جاگیر دیجاتی شاہزادوں کو گاؤں دیئے جاتے، ولی عہد کو کسی صوبہ کا حاکم مقرر کیا جاتا، احمد شاہ اول کے عہد میں غیر فوجی سپاہی کی تنخواہ بہت معمولی ہوتی۔ لیکن اکبر کے ابتدائی عہد میں اعتماد خاں وزیر گجرات، گجراتی سپاہیوں کو دس روپیہ ماہوار تنخواہ دیتا تھا۔ (مرأۃ سکندری ص ۲۰۷ بمبئی)

بعض انتظامی و دیوانی عہدہ داروں کے نام: میر آخور (داروغۂ اصطبل) بڑا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا، عارض ممالک (فوجی سکریٹری) معتمد فوج، مشرف ممالک، دبیر مملکت (شاہی میر منشی) امیر کوئی محکمۂ آبادی کا افسر، مستوفی الممالک، صدر محاسب (اکاونٹنٹ جنرل) مشرف دیوان (میر منشی، سکریٹری) بخشی الممالک (فوج کا خزانچی، افسر خزانہ) کبھی کبھی فوج کا افسر سپہ سالار کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، صدر جہاں (مفتی اعظم) فوطہ دار (خزانچی، ناظر) ناظر عمال ممالک کی جمع بندی جو داخل دفتر کی گئی ہے اس کا جانچنے والا، وقوف (اخراجات ملک کی نگرانی کرنے والا) امین (زمین کی پیمایش کرنے والا) تحصیلدار

(عامل یا کلکٹر (زمین کی مالگذاری وصول کرنے والا) شقہ دار (نیم فوجی عہدہ دار جو سول کو مدد دیتا تھا، مسلح پولیس) صدر شقہ دار (ایک ضلع کا منتظم کمشنر) منصف (مقدمات کا فیصلہ کرنے والا) صدر منصف (جج) انصاف کے علاوہ حکام کی نگرانی بھی کرتا) مگر تبادلہ اس کے اختیار میں نہ تھا، فوجدار (جس کو سول کے اکثر حقوق حاکمانہ ان کے لئے حاصل تھے) کوتوال (تمام شہر کا افسر جس کو امن قائم کرنے کے لئے ہر قسم کے حاکمانہ اختیارات حاصل تھے۔) قلعہ دار (جو صرف قلعہ کی محافظت کرتا تھا،) امیر برید (وزیر ڈاک، افسر محکمہ ڈاک)

دیوانی کا محکمہ فوجی محکمہ سے الگ ہوتا، محکمۂ دیوانی کے دفتر میں تین سو آدمی تک ہوتے، جو علحدہ علیحدہ اپنی شاخوں کے دفتر میں کام کرتے:

صوبہ دار	جو صوبہ پر فوجی اور انتظامی اختیار رکھتا،
صوبہ	چند سرکاروں کا مجموعہ،
سرکار	چند محال (پرگنہ) کا مجموعہ
ضلع	چند تحصیلوں کا مجموعہ
تحصیل	چند گانوں کا مجموعہ،
گانوں	انسانوں کی وہ چھوٹی آبادی جہاں تمام ضروری اشیاء میسر آتی ہوں،

کوس	دو سو جریب کا
جریب شاہجہانی	۲۵ ذراع کا
ذراع	۴۲ انگلی کا[1]

بعض سلطانی عہدوں کے نام: وکیل در (دوار۔ محل سرا کا محافظ اور منتظم) امیر حاجب (یا بار بک) وہ امیر جو بغیر اجازت ہر وقت سلطان کے پاس جا سکے، سرجام دار (خان ساماں) میر مجلس (سلاطین کی خانگی مجلس کا سردار)

جب بادشاہ اپنے پایۂ تخت سے باہر جاتا تو اپنی جگہ پر جس شخص کو رکھتا، اس کا لقب ملک نائب یا نائب سلطان ہوتا، یہ شخص عموماً بادشاہ کے خاندان کا ہوتا، غیروں میں سے جس پر سلطان کو بھروسہ ہوتا، اس کو نائب بناتا،

اسی طرح محکمۂ دیوانی کا افسر اعلیٰ دیوان کہلاتا تھا، یہ صرف صوبوں میں ہوتا، مغل شہنشاہوں کے دور میں اس کا استعمال ہوا، ورنہ گجراتی سلاطین کے زمانہ میں نہ یہ عہدہ نظر آتا ہے، نہ یہ لفظ، وزیر اعظم کے ماتحت جو وزراء ہوتے تھے، انہی کے سپرد یہ کام ہوتا تھا، اور ان میں سے ایک وزیر اس کے لئے مخصوص ہوتا، اس کا ایک نائب بھی ہوتا تھا، جس کو نائب دیوان کہتے تھے،

---

[1] خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۱۱، بمبی،

ڈاک

افسوس ہے کہ سلاطینِ گجرات کے عہد میں محکمۂ ڈاک کو کوئی ترقی نہیں دی گئی، وہی پرانا طریقہ جو شتر سواروں کا تھا، اس عہد میں بھی نظر آتا ہے؛ چنانچہ احمد شاہ اول کو رانا کی بغاوت کی خبر ناگور سے شتر سوار ہی کے ذریعہ سلطان پور پہونچی، جس نے اس مسافت کو صرف نو دن میں طے کیا تھا، اسی طرح مظفر حلیم کے زمانہ میں بھی دوحد (داہود) چانپانیر میں شتر سوار ہی کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ محمود خلجی سلطان مالوہ کی پناہ لینے کے لئے گجرات آیا ہوا ہے، سلاطینِ گجرات سے قبل محمد تغلق کے عہد میں مختلف قسم کی ڈاک ایجاد ہو چکی تھی، مثلاً سانڈنی کے علاوہ گھوڑوں کی ڈاک، پیادوں کی ڈاک، کبوتروں کی ڈاک، نقاروں کی ڈاک (مثل تار) وغیرہ، لیکن ان گوجرہ بادشاہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی، ورنہ ان سب کا رواج گجرات میں ہوتا، گجرات میں جو محکمۂ ڈاک تھا، اس کا مرکز احمد آباد تھا، اس کے سب سے بڑے عہدہ دار کو ملک البرید یا صاحب البرید کہتے تھے، اس کی شاخیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، سلطان محمود ثالث کے عہد میں اس عہدہ پر حبیب اللہ بن شمس الدین[1] تھے،

---

[1] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۹۲، طبع لندن،

جو صاحب البرید کہلاتے تھے، جن کو ہم آج وزیر ڈاک کہتے ہیں۔
اسی طرح مغلیہ عہد میں بھی ڈاک کا انتظام معقول تھا، صوبۂ
گجرات کا مرکز احمد آباد تھا، افسر محکمہ کو صاحب البرید یا داروغۂ
ڈاک کہتے تھے، اس کے ماتحت منشی اور ڈاکیئے ہوتے۔ قاعدہ یہ
مقرر تھا کہ ایک گھڑی میں ایک کوس طے کرنا پڑتا، اس میں کوتاہی
کرنے پر چوتھائی تنخواہ کٹ جاتی تھی، ڈاکیہ کے لئے چوکیاں مقرر
تھیں، ہر چوکی کا داروغہ، فوجدار اور اس طرف کے زمیندار اس
بات کے ذمہ دار تھے کہ بلا توقف ڈاک روانہ ہو جائے، اور
راستہ کے لئے بدرقہ (رہنما) ساتھ کر دیا جائے، ایک ڈاکیہ ایک
چوکی سے دوسری چوکی تک ڈاک پہنچا دیتا، پھر وہاں سے دوسرا
ڈاکیہ اس سے آگے کی چوکی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ احمد آباد سے
اجمیر کی سرحد تک مسافت ڈاکیہ عموماً بارہ دن میں اور ضروری کام
ہو تو ایک ہفتہ میں طے کرتا، اس کام کے لئے ۶۲ آدمی دو سو پچپن
روپئے پر ملازم تھے، (تقریباً چار روپیے نفر) اس کے ساتھ دو
نفر تاریخ نویس اور دو نفر پرچہ نویس ہوتے (پرچہ نویس شاہی
جاسوس) احمد آباد سے اجمیر کی سرحد تک ۲۷ چوکیاں تھیں (۱) احمد آباد
سے کالی (۲) اڈالیج (۳) پانسہ (۴) چورنگ (۵) بسانہ (۶)
بھاندو (۷) اونجہ (۸) سدھ پور (۹) بسلاؤ (۱۰) حلودی (۱۱)
پالن پور (۱۲) بھوتری (۱۳) دائی واڑہ (۱۴) کھوارہ (۱۵) پانتی واڑہ

(۱۶) ڈونگرپور (۱۷) بانٹ (۱۸) بدکانم (۱۹) کودی (۲۰) بھیل مال (۲۱) رسونت (۲۲) نورنا (۲۳) مودرا (۲۴) جالور (۲۵) دیباداسن (۲۶) بھورانی (۲۷) کھندب، ایک کوس کی مسافت جریب سے مقرر کی جاتی، جریب ۲۵ ہاتھ کا اور ہاتھ ۲۴ انگل کا ہوتا، اس طرح ایک کوس دو سو جریب کا ہوتا، جس کے پانچ ہزار ہاتھ شاہجانی ہوئے۔[۱]

عدالت | انصاف کے لئے عدالت کا بھی ایک محکمہ تھا، اس کے لئے ہر شہر میں ایک مفتی اور ایک قاضی ہوتا، قاضی کی اپیل قاضی القضاۃ کے یہاں جاتی، اور اس کی اپیل اقضی القضاۃ کے یہاں ہوتی، آخری اپیل خود بادشاہ کے یہاں ہوتی، بادشاہ خود بھی انصاف کا خیال رکھتا، اور جہاں تک ممکن ہو سکتا، انصاف کرنے میں دریغ نہ کرتا، چنانچہ سلطان احمد شاہ اوّل نے اپنے داماد کو مانک چوک میں صرف اس لئے قتل کر ڈالا تھا کہ اس نے محض غرور جوانی میں کسی کو مار ڈالا تھا،[۲]

سلطان محمود اوّل نے اپنے دو بہترین امیروں کو اس بنا پر مار ڈالا کہ ان دونوں نے دو غریب آدمیوں کو اصلی مجرم کے عوض میں بادشاہ کے سامنے پیش کر کے قتل کرایا تھا،[۳]

بادشاہ لوگوں کی عرضیاں خود اپنے ہاتھ سے بھی لیا کرتا تھا

---

[۱] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۷۶ کلکتہ [۲] مرآۃ سکندری ص ۴۴،
[۳] ایضاً ص ۹۸،

لیکن مظفر حلیم کے وقت میں جب ایک دفعہ عرضی لیتے وقت مدعی کی انگوٹھی سے بادشاہ کی آستین پھٹ گئی، تو ایک لمبے بانس کے سرے پر عرضی باندھ کر پیش کرنے کا حکم دیا گیا[1]۔

بادشاہ خود عدالت کا احترام کرتا تھا، اس کے احکام کی خود بھی تعمیل کرتا، چنانچہ سلطان محمود نے اپنے لئے ایک رباب تیار کرایا تھا، جو چھ مہینے میں جاکر تیار ہوا تھا، کاریگر رباب لے کر بادشاہ کی خدمت میں جارہا تھا کہ راستہ میں قاضی صاحب سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے اس کو مذہب کے خلاف سمجھ کر توڑ ڈالا، بادشاہ کو جب معلوم ہوا تو اس نے قاضی صاحب کو کچھ نہیں کہا[2]۔

ایک مرتبہ مظفر حلیم پر گھوڑوں کے ایک تاجر نے دعویٰ دعویٰ دائر کر دیا، قاضی نے بادشاہ کے نام سمن جاری کیا۔ قاضی کے حکم کے بموجب بادشاہ فوراً عدالت میں حاضر ہوا، قاضی نے مدعی کے تمام دلائل سن کر بادشاہ پہ ڈگری جاری کردی، جب تک ڈگری کے تمام روپیے ادا نہیں ہوگئے، بادشاہ اپنے مدعی کے ساتھ عدالت میں کھڑا رہا[3]۔

مظفر حلیم بھیس بدل کر راتوں کو گشت کرتا، تاکہ رعایا کا حال بچشمِ خود دیکھے، اس نے ایک دفعہ اسی گشت میں ایک سپاہی مجرم

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۱۰۴، [2] ایضاً ص ۱۱۱ [3] ظفر الوالہ جلد ۱ ص ۱۳۱ لندن،

گرفتار کیا، جو جبراً ایک شخص کے گھر میں گھس جایا کرتا تھا،[۱]

محکمۂ احتساب اور پولیس | گجرات میں پولیس کا ایسا انتظام جیسا کہ آجکل ہے، تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا، تاہم راستہ کے ہر نکڑ (چوراہہ) پر ایک پولیس چوکی امن قائم رکھنے کے لیے موجود رہتی۔ تمام شہر کا ایک کوتوال ہوتا، جس کے ماتحت پولیس کام کرتی، جو چوروں اور بدمعاشوں کو نگاہ میں رکھتی، اس کام کے لیے زیادہ تر وہ لوگ لیے جاتے جو اس فن میں ماہر ہوتے، سلطان محمود اول کے زمانہ میں محافظ خاں اس عہدہ پر ممتاز تھا۔ جو ترقی پاکر آخر میں وزارت تک پہنچ گیا تھا، ۹۵۴ھ میں بعہد سلطان محمود ثالث ناصر حبش خاں اس عہدہ پر مامور تھا، جو بعد کو دیو کا گورنر ہوگیا تھا۔[۲]

احمد آباد شہر کا کوتوال ایک دفعہ بازار میں جارہا تھا کہ سر بازار اس نے ایک شخص کو گرفتار کر لیا جو بظاہر بڑا شریف انسان نظر آرہا تھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ گھوڑوں کا چور تھا۔[۳]

اسی کے ساتھ ایک محکمۂ احتساب بھی تھا، جس کے افسر کو محتسب کہتے تھے، اخلاقی اور شرعی امور کی دیکھ بھال اس کے سپرد تھی، مظفر شاہ اول کے عہد میں اس عہدہ پر مولانا خانو اس عہدہ پر ممتاز تھے،

سزائیں | سزائیں جرم کی نوعیت کے لحاظ سے ہوتیں، عام طور سے قید کرنا،

---

۱ ظفر الوالہ ج ۱ ص ۱۳۰ لندن ۲ ایضاً ص ۲۸۰ لندن۔

۳ مرآۃ سکندری ص ۱۴۴

کوڑے مارنا، ہاتھ کاٹنا، قتل کرنا، پھانسی دینا ہوتا تھا، توپ سے اڑا دینا، کھال کھینچنا یا دیوار میں چنوا دینا، اتفاقی سزائیں تھیں جو کبھی کبھی غیر معمولی جرموں پر دیجاتیں، البتہ سیاسی مجرموں، خصوصًا باغیوں کی سزا بڑی سخت اور روح فرسا ہوتی جنگی ہاتھیوں کے آگے ڈال دینا جس کو وہ اچھال کر پاؤں کے نیچے دباکر مار ڈالتے، اکبر کے ابتدائی عہد کے سوا اور کبھی گجرات میں تاریخوں میں مجھے نظر نہیں آیا،

معافی اور رحم | سلاطینِ گجرات میدانِ جنگ میں تو دشمنوں کے لئے انتہائی سخت اور بے رحم تھے لیکن حالت امن میں عفو و کرم کے پیکر تھے، راجہ جانپانیر، راجہ ایڈر، راجہ پال، راجہ جوناگڑھ، راجہ جھالاواڑ، راجہ آبو، رانا مارواڑ، یہ سب سلاطین گجرات کے باج گذار تھے، مگر جب موقع ملتا، باغی ہو جاتے، اور غنیم سے مل جاتے، اور بعض دفعہ تو محض ان کی غداری اور بے وفائی کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے خونریز جنگ بھی کرنی پڑی، مگر ان غداریوں کے باوجود بھی جب جب یہ معافی کے خواستگار ہوئے، تو معاف کر دیئے گئے، ذاتی معاملات میں بھی یہ سلاطین اکثر رحم و کرم سے کام لیتے چنانچہ مظفر دوم کا اسی وصف کی وجہ سے حلیم لقب بھی ہو گیا تھا، اکثر اوقات سخت سے سخت مجرموں کو بھی اپنے حلم کی وجہ سے معاف کر دیتا تھا

ایک دفعہ وہ کچھ لکھ رہا تھا کہ مورچھل بردار کے ہاتھ سے مورچھل گر گیا، جس سے کتاب خراب ہو گئی۔ مگر مظفر نے اس کو کوئی سزا نہیں دی،

ایک بار اس کے نہانے کے لئے گرم پانی رکھا گیا، اتفاق سے اس میں چوہا گر گیا، اور ریزہ ریزہ ہو گیا، غسل کرتے وقت اس کو اتنی کراہیت معلوم ہوئی کہ وہ بے اختیار حوض میں کود پڑا، تاہم ان ملازموں کو جنھوں نے پانی گرم کیا تھا، ایک حرف نہیں کہا، اور معاف کر دیا، خداوند خان نے محمود اول کے خلاف سازش کی جو کھل گئی لیکن محمود نے اس کو کوئی سزا نہیں دی، حالانکہ وہ اس غداری کی وجہ سے سخت ترین سزا کا مستحق تھا، محمود کو اس بنا پر بھی اس کو رحم آگیا، کہ وہ اپنے وقت کا بہترین عالم اور ماہرِ فن تھا، اس نے سوچا کہ اگر اس کو قتل کر دیا جائے گا تو ایسا ماہرِ فن پھر کہاں ملے گا،

محکمۂ شکار سلاطینِ گجرات نے جہاں اور بہت سے محکمے قائم کر رکھے تھے، ایک محکمۂ شکار کا بھی تھا، جنوبی گجرات متعدد ندیوں کی وجہ سے بڑا سرسبز اور شاداب ہے اور یہاں بکثرت چراگاہیں تھیں، اور اس کی لالچ میں بکثرت جانور یہاں آتے اور رہتے تھے، جن کا شکار کیا جاتا تھا، علاء الدین خلجی بھی ایک مرتبہ شکار کی غرض سے یہاں آیا تھا، (منتخب التواریخ بدایونی جلد اول کلکتہ)

سلطان علاء الدین حسن بہمنی گجرات فتح کرنے کے لیے نوساری تک آیا، تو چراگاہوں کی سبز سبزی، اور جانوروں کی کثرت دیکھ کر عرصہ تک یہاں رہ پڑا تھا[۱]۔

سلطان احمد شاہ اول کے عہد میں باقاعدہ محکمۂ شکار تھا، اس محکمہ کے افسر کو میر شکاری کہا جاتا تھا، اس کے عہد میں میر الٰہی بخش اس عہدہ پر مامور تھے[۲] سلطان سورٹھ کے جنگل، ایڈر، اور نوساری میں شکار کھیلتا، شکاری جانوروں میں باز، جرہ، شکرہ، بہری، باگھ، (چیتا) ہاتھی، کتا مخصوص تھے، اور ان کو بڑی محنت سے سدھایا جاتا تھا، جب شکار کے لیے نکلتے تو کتے زنجیروں میں بندھے ہوتے، اور باز ہاتھوں پر بیٹھے ہوتے، چیتے سلاخ دار گاڑیوں میں بند ہوتے، شکار کے وقت دروازہ کھول کر شکار کی طرف اشارہ کر دیا جاتا، ہاتھی پر بادشاہ اور امراء سوار ہوتے، اور تیروں سے شکار کیا جاتا۔

محمود بیگڑہ کے عہد میں مورآلی (متصل چانپانیر) راج پیپلہ، سورٹھ وغیرہ شکارگاہ تھے، مالوہ اور خاندیس بہادر شاہ شاہ کے شکارگاہ تھی، محمود ثالث نے محمود آباد میں آہوخانہ بنایا تھا، جو کئی میل لمبا چوڑا تھا، اس میں ہر قسم کے جانور پال رکھے تھے، محمود ثالث کو باز اور چیتے سے بڑی رغبت تھی، اس نے باگھ ماروں کی

[۱] ذ ظفر [illegible]
[۲] گجرات کی قلمی تاریخ
[۳] مرآۃ سکندری ص ۲۹۹، بمبئی

پوری ایک جماعت ہی نوکر رکھی تھی، ہرنوں کے شکار کے لئے ایک خاص قسم کا تیر کف دست برابر ایجاد کیا تھا، باز، جرہ، شکرہ، بہری جو ناگرا سے، باگھ اگیر کے جنگل سے، کتے (تازی) عرب سے اور ہاتھی راج پیلہ سے منگوائے جاتے،

اسی طرح مچھلیوں کے شکار کے لئے بھی ایک محکمہ تھا، اس کے افسر کو "میر شکار ماہی" کہتے تھے،

وظائف اور جاگیریں | تنخواہ (درماہہ) وظیفہ اور جاگیر، یہ تینوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ تنخواہ کسی کام کے معاوضہ میں ہوتی ہے جو ماہ بماہ یا سالانہ ملتی ہے، اس میں وراثت نہیں چلتی جب تک کام کیا تنخواہ ملتی رہی، جب چھوڑ دیا یا مرگیا موقوف ہوگئی، اور وظیفہ میں وراثت جاری ہوتی ہے، اور اس سے اولاد در اولاد فائدہ اٹھاتی ہے، ایسے وظائف عالموں، صوفیوں، مسجد کے اماموں اور درویشوں کو بکثرت دیئے جاتے، گجرات کے عالموں اور صوفیوں کے علاوہ غیر ملکی عالموں کو بھی وظیفے ملتے تھے،

جاگیریں دو قسم کی ہوتی تھیں، موروثی اور غیر موروثی، وہ جائداد جو یکے بعد دیگرے وراثت میں ملتی وہ موروثی ہوتی، یہ زیادہ تر سپاہیوں اور مساجد کے اماموں اور مشائخ کو دی جاتی، چنانچہ سلطان قطب الدین احمد کے زمانہ میں گجرات کا دو حصہ سپاہیوں کے قبضہ میں تھا، اور ایک حصہ مساجد کے اماموں، مشائخ، صوفیہ اور علماء کے نام

تھا۔ جیسے شاہ عالم، قطب عالم، شیخ احمد کھٹو، اور شاہ وجیہ الدین کی درگاہوں کیلئے گاؤں وقف تھے، اسی طرح مساجد، مدارس شفاخانوں اور حاجیوں اور مکہ کے مدرسوں کے لئے بھی گاؤں وقف تھے، وظائف شہروں کے حکام اور گاؤں کے مقدم کے تقرر میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا، اگر کسی کو وظیفہ کے ساتھ جاگیر بھی ملجاتی تھی، تو زمان میں وظیفہ بھی بحال رکھا جاتا تھا۔[۲]

غیر موروثی جاگیریں در اصل قابلیت اور لیاقت کی بنا پر ملتی تھیں، یہ عموماً کسی خطاب کے ساتھ ملحق ہوتیں، مخصوص خطابات یعنی عماد الملک، خداوند خاں، آصف خاں، راے رایان وغیرہ کے ساتھ ایک معین رقم کی جاگیر بھی ہوتی تھی، مثلاً دو لاکھ، ایک لاکھ، پچاس ہزار سالانہ کی جاگیر اس کو دیجاتی، جیسے عماد الملک کو بڑودہ اور بھروچ دیئے گئے، یہ جاگیر خطاب کے ساتھ ایک کے بعد دوسرے کو منتقل ہو جاتی، مخصوص خطاب میں وراثت نہیں چلتی تھی، ایک شخص جو عماد الملک یا راے رایان کا مخصوص خطاب رکھتا، اور اس کے پاس پچاس ہزار یا ایک لاکھ کی جاگیر ہوتی، اور وہ معزول ہوجاتا، یا مرجاتا، تو اس کی جاگیر پھر سرکار میں واپس آجاتی، پھر جس کو عماد الملک یا خداوند خاں قسم کا مخصوص خطاب ملتا، وہ جاگیر اس کو دیدیجاتی، اس کے لڑکے وارث نہ ہوتے،[۳]

---

[۱] مرآۃ سکندری ص ۰ ۰ [۲] ظفر الوالہ جلد اول ص ۴۰ ۹، لندن،

[۳] ص ۱۹۹ لندن،

گجراتی بادشاہوں کے شاہی خطابات | عام تاریخوں میں اُن کے صرف ایک ہی قسم کے خطابات درج ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

مظفر شاہ اول، شمس الدنیا والدین، محمد شاہ اول ناصرالدنیا والدین، احمد شاہ اول ناصرالدنیا والدین، سلطان محمد شاہ ثانی غیاث الدنیا والدین، احمد شاہ ثانی قطب الدنیا والدین، سلطان محمود اول ناصرالدنیا والدین، سلطان مظفر ثانی شمس الدنیا والدین، سلطان سکندر ناصرالدنیا والدین، سلطان بہادر شاہ، قطب الدنیا والدین، سلطان محمود ثالث (۹۴۳ھ) ناصرالدنیا والدین، سلطان احمد ثالث ناصرالدنیا والدین، غیاث الدنیا والدین، یمین الدنیا والدین (اس کے سکوں میں یہ تینوں خطاب مجھے ملے ہیں)، سلطان مظفر رابع شمس الدنیا والدین،

سکوں میں بعض دوسرے خطابات بھی مجھے ملے ہیں، اس لئے ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُن کو بھی درج کرتا ہوں:-

۱- الموفق بتائید الرحمٰن شمس الدنیا والدین، مظفر شاہ السلطان ۹۲۰ھ ۱۵۱۴ء

۲- المعتصم باللہ شمس الدنیا والدین بہادر شاہ بن مظفر شاہ السلطان،

۳- (الف) الواثق باللہ المنان ابوالفتح ناصرالدنیا والدین محمود شاہ بن لطیف شاہ السلطان،

(ب) الموفق بامراللہ ابوالفتح ناصرالدنیا والدین محمود شاہ بن لطیف شاہ السلطان،

(ج) الموفق باللہ المنان مثل ما سبق (د) الموثق بتائید المنان شمس الدنیا والدین محمود شاہ بن لطیف شاہ السلطان ۔

(۴) المجاہد معین الدنیا والدین احمد شاہ بن لطیف خان بن نظام خان السلطان ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ (ب) المعتصم باللہ غیاث الدنیا والدین ابو المحامد احمد شاہ سلطان عم محمود شاہ بن لطیف خان ۔

(۵) المؤید بتائید الرحمٰن ابو الفتح ناصر الدنیا والدین مظفر شاہ ابن محمود شاہ السلطان (ب) المؤید بتائید الرحمٰن شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ ،

(۶) الواثق باللہ المنان ناصر الدنیا والدین ابو الفتح سکندر شاہ بن مظفر شاہ السلطان (۹۳۲ھ / ۱۵۲۵)

(۷) الواثق بتائید الرحمٰن افتخار الدنیا والدین ابو الغازی محمد شاہ ابن مظفر شاہ السلطان اول (۸۰۶ھ / ۱۴۰۴)

(۸) الواثق باللہ المستعان ناصر الدنیا والدین ابو الفتح احمد شاہ اول

(۹) غیاث الدنیا والدین ابو المحامد محمد شاہ بن احمد شاہ

(۱۰) الواثق بتائید الرحمٰن قطب الدنیا والدین ابو المظفر احمد شاہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ اوّل ؛

(۱۱) الواثق باللہ المنان ، الواثق بتائید الرحمٰن ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ بن

محمد شاہ بن احمد شاہ اول[۵] مندرجۂ بالا سطور میں الموفق، المعتصم، الواثق، الموثق، المجاہد، المؤید خاص طور سے قابلِ غور ہیں، اس قسم کے خطابات بغداد، قاہرہ، اور اندلس کے خلفاء کے ہوتے تھے، ہندوستان میں نویں صدی سے قبل کسی نے اس قسم کے خطابات اختیار نہیں کیے، المتوکل علی اللہ عباسی آخری خلیفۂ مصر سے جب ترکی سلطان سلیم خاں ( ) نے خلافت لے لی، تو ترکی خلفاء نے تو یہ خطابات اپنے لیے پسند نہیں کیے لیکن دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں آزاد خود مختار بادشاہوں نے اس قسم کے خطابات اختیار کرنے شروع کر دیئے، چنانچہ یمن، گجرات، دکن (بہمنی) کے سلاطین نے سکوں میں اس قسم کے خطابات مسکوک کرائے، گجرات میں مظفر شاہ بن محمود شاہ اول کے عہد سے یہ شروع ہوا، مصری خلفاء کے سفیروں کی آمد و رفت ہندوستان میں ہمیشہ رہی، دہلی، مالوہ، گجرات اور دکن میں ان سفیروں کی آمد و رفت کا حال تاریخوں میں موجود ہے، گجرات میں سلطان قطب الدین احمد ثانی کے عہد میں ایک سفیر مصر کے عباسی خلیفہ کی طرف سے آیا تھا، اس زمانہ میں جو سکہ ڈھالا گیا اس کے ایک رخ پر تحریر ہے:-

خلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ قطب الدنیا والدین احمد شاہ السلطان

---

[۵] احمد آباد کے کتبات پر نذر جرنل مولفہ چغتائی،

اسی طرح محمود اول کے ابتدائی عہد میں جو سکہ تھا، اس پر یہ تحریر ہے :۔

"خلیفہ امیرالمومنین خلدت خلافتہ ناصرالدنیا والدین محمود شاہ السُلطان (۱۰۰۵ھ)"

یہ دونوں سکے میرے پاس موجود ہیں، مصر کی عباسی خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد اس قسم کے سکے ہندوستان میں موقوف ہوگئے، اور اسی کے ساتھ سلاطین ہند نے خلفاء کے جیسے خطابات رکھنے شروع کر دیئے۔

شاہی خطوط کے اقسام

(۱) فرمان یا احکام، ان سے وہ خطوط مراد ہوتے ہوتے تھے، جو بادشاہ کسی شاہزادہ، افسر یا کسی بیرونی حکمران کو لکھتا تھا۔

(۲) شقہ، اس کا اطلاق کبھی کبھی فرمان شاہی پر بھی ہوتا تھا لیکن یہ دراصل کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو کہتے، جس پر بادشاہ امرائے حضوری یا اعلیٰ منصب داروں کو اپنے دست خاص سے لکھتا، (نورالغات جلد سوم) اُس رقعہ کو بھی کہتے جو امراء اپنے سے کم رتبہ امیروں کو لکھتے، جب کوئی ضروری کام پیش آتا، اور اس کے لئے فرمان لکھنے میں تاخیر ہوتی، تو بادشاہ ایک رقعہ مشتمل بر اصل مضمون لکھ کر، اس پر اپنا دستخط ثبت کر دیتا، اور تیز رو قاصد یا ڈاک کے ذریعہ بھیج دیتا، اس رقعہ کو بھی شقہ کو بھی شقہ کہتے تھے،

(۳) نشان وہ خط جو شاہی خاندان کا کوئی رکن بادشاہ یا اپنے خاندانی بزرگوں کے علاوہ کسی شخص کو لکھتا،

۴۔ عرضداشت: وہ خط جو کوئی شاہزادہ یا کوئی اور خود بادشاہ یا بادشاہ زادوں کو لکھتا،

۵۔ فتح نامہ: کسی صوبہ دار کی طرف سے جب کوئی خط بادشاہ کے نام آتا تو اس کو فتح نامہ کہتے، فتح کی خوشخبری کے خط کو بھی فتح نامہ کہتے،

۶۔ حسب الحکم: وہ خط جو وزیر، بادشاہ کی طرف سے، اُس کی ہدایت کے مطابق لکھتا،

۷۔ احکام
۸۔ رمز
۹۔ اشارہ

} وہ جملے اور عبارتیں جو بادشاہ کسی فرمان کے متعلق اپنے منشی کو لکھوا دیتا، اور وہ اسی کے مطابق پورا فرمان لکھتا، جس کو "شاہی نوٹ" کہہ سکتے ہیں،

۱۰۔ سند وہ خط جس کے ذریعہ کسی شخص کے تقرر کا حکم دیا جاتا، صوبہ دار کا تقرر خاص فرمان کے ذریعہ ہوتا،

۱۱۔ پروانہ، حکمنامہ جو کسی محکمہ کی طرف سے ماتحت افسر کے نام بھیجا جاتا، یہ عموماً کسی مقدمہ کا فیصلہ یا کوئی خاص قانون یا جائداد کے متعلق ہوتا،

۱۲۔ دستک: پروانۂ راہداری، جو عموماً تجارتی چیزوں کے لیجانے یا کسی خاص شخص کو دربار یا چھاؤنی میں داخل ہونے کے لئے دیا جاتا،

۱۳۔ محضر: یہ درحقیقت کسی مقدمہ یا کسی واقعہ کی تحقیقاتی رپورٹ ہوتی، جس میں شہادت، پنچوں کی راے اور اُنکے فیصلے لکھے جاتے، بعض دفعہ

عام رعایا کی طرف سے جو درخواست کسی خاص مسئلہ کے متعلق حکام کو دی جاتی اُس کو بھی محضر کہتے تھے،

۱۴۔ رقعہ : عام خط کو کہتے تھے لیکن آج کل کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھ کر جو بھیجا جاتا ہے، اس کو کہتے ہیں،

شاہی مہریں | شاہی مہریں دو قسم کی ہوتی تھیں، ایک چھوٹی مدور یا بیضاوی اس پر صرف بادشاہ کا نام ہوتا تھا، اسے اوزک بھی کہتے تھے، یہ صرف خاص خاص فرمانوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی، دوسری بڑی مدور یا مربع ہوتی اُس کے وسط میں بادشاہ کا نام اور چاروں طرف چھوٹے چھوٹے خانوں میں بادشاہ کے آبا و اجداد کے نام ہوتے، چونکہ اس سے شان وشوکت اور خاندانی بزرگی اور جلالت کا اظہار مقصود ہوتا، اس لئے اکثر غیر ملکی فرمانوں پر کی جاتی، پھر بعد میں عام فرمانوں پر بھی یہ مہریں لگائی جانے لگیں، اس قسم کی متعدد مہریں راقم الحروف نے قاضی بڑودہ کے یہاں کے فرمانوں پر ثبت دیکھیں،

کبھی کبھی کسی فرمان پر شاہی نام کا طغرا بھی ہوتا، اور کسی پر بادشاہ کے ساتھ اس کے باپ اور دادا کا نام بھی اسی طغرے میں لکھا جاتا، فرمانوں کے لئے کاغذ خاص قسم کا ہوتا تھا۔[۱]

ہندوؤں سے برتاؤ | احمد آباد کے گجراتی بادشاہوں کا عام برتاؤ ہندوؤں سے بہت اچھا تھا، اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے کہ یہ اسی خطہ کے باشندے تھے اُن کے

---

[۱] مقدمہ مکاتبات عالمگیری ص ۴۴، اعظم گڈھ،

تمام رشتہ دار اور ہم قوم پورے گجرات میں پھیلے ہوئے تھے، جن سے با وجود تبدیلِ مذہب کے نسلی تعلقات قائم تھے، سلطان احمد شاہ اول کے لڑکے محمد شاہ ثانی کی شادی راجہ ایڈر کی لڑکی سے ہوئی تھی، سلطان قطب الدین کی رانی "روپ منجری" تھی، محمود اول کی بیگمات میں ایک بیگم رانی سیرائی (سوروپ رانی) تھی، بہادر شاہ نے راجہ بگلانہ کی لڑکی سے خود اپنی اور اس کی بہن سے محمود شاہ فاروقی حاکم خاندیس کی شادی کی، جو اس کا بھانجا تھا، ان رشتہ داریوں سے ہندوؤں سے تعلقات بہت خوشگوار، اور اُن کے ساتھ برتاؤ بڑا اچھا ہو گیا تھا،

ان معاشرتی امتیازات کے علاوہ ہندوؤں کو ملک کی سیاست میں بھی اچھا خاصا دخل تھا، وہ فوج میں بھرتی بھی ہوتے تھے، جس پر کوئی پابندی نہیں تھی، محمود غزنوی کے بعد سلطان احمد شاہ اول ہندوستان کا پہلا بادشاہ ہے، جس نے ہندوؤں پر پورا اعتماد کیا، اور اُن کو فوج میں لینا شروع کیا، اُس کے بعد جو بھی تخت نشین ہوا، اُس نے اس کی پیروی کی، بڑے بڑے عہدے بھی اُن کو دیئے گئے، سلطان مظفر اول کے عہد میں ملک جیون داس اور ملک پریاگ داس دو ہندو درباری امیروں میں شامل تھے، احمد شاہ اول کا نائب وزیر اعظم ایک ہندو تھا، اور اس کی تنخواہ دس ہزار تنکہ تھی، محمد شاہ دوم کے درباری امیروں میں ست بیرا نامی ایک ہندو امیر تھا، جس سے بادشاہ مشورے لیتا تھا، اسی عہد میں نراین داس اور سوروداس دو فوجی افسر تھے جو جنگِ ایڈر میں شریک تھے، اور حکومت

کے معزز اراکین میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔[۵۱]

سلطان قطب الدین کے درباریوں میں ایک سربرآوردہ اور ممتاز امیر ایس چند مانک تھا، جو بڑا قابلِ اعتماد تھا، اور فوجی عہدہ بھی رکھتا تھا، اسی طرح ملک کورائی بھی سلطان کے امیروں میں داخل تھا، سلطان محمود اول نے ایک معزز ہندو کو سب سے بڑا خطاب راے رایان دیکر اپنے اراکینِ دولت میں شامل کر لیا تھا، مظفر حلیم کا نائب وزیر اعظم ملک گوپی چند ایک ہندو تھا، جو اس قدر شان و شوکت سے رہتا تھا کہ خود شاہزادوں کو بھی یہ شان نصیب نہ تھی، راجہ کونیا کونیل کو بہادر شاہ نے رانا راؤ کا خطاب دیا تھا، راجہ سلہدی کا لڑکا اس کے امراے دولت میں شامل تھا، راجہ نرسنگھ دیو بہادر شاہ کا بڑا معتمد فوجی افسر تھا،

چنگیز خان بن اعتماد الملک جب بھروچ کا خود مختار حاکم ہوگیا، تو اُس نے اپنا وزیر مال ایک ہندو سوجھ نامی کو بنایا، شیر خاں بابی کا وزیر مال بھی ایک ہندو کیکا موقر الملک تھا، جگ جیون داس کبت کوہی اسلام خاں صوبہ دار گجرات کا ہردلعزیز درباری تھا، یہ چند نام محض سرسری طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں، ورنہ غائر نظر سے تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو اس طرح کے ہزاروں ہندوؤں کے نام نکلیں گے، جو سلاطین گجرات کے دور میں بڑے بڑے منصب اور

[۵۱] مرقاۃ الوصول قلمی ص ۹۲-

جمعہ بسلامت پہنچے۔

فتح: حکمرانِ گجرات سلاطین کسی جگہ کو فتح کرتے تھے تو وہاں کے حاکم سے بڑی مہربانی سے پیش آتے تھے، جوناگڑھ فتح ہوا تو وہاں کے راجہ کو خانِ جہاں کا خطاب دے کر جاگیر عنایت کی، اور اس کے لڑکے کو الگ سے جاگیر دی، جو اکبر اعظم کے عہد تک نسلاً بعد نسلٍ اس کے وارثوں کے قبضہ میں رہی، راجہ چاپانیر کے لڑکے کو نظام الملک کا خطاب دے کر امرائے دولت میں شامل کر لیا گیا، بھوپت سنگھ جی راجہ منڈلک کو جگت (صدارکا) کا دیوان بنا دیا گیا، (۱۴۷۳ء)

تاج بخشی: ان گجراتی بادشاہوں نے بارہا تاج و تخت بھی بخش دیئے، سلطان مظفر اول نے مالوہ فتح کر کے واپس کر دیا، سلطان احمد اول نے ایڈر فتح کیا، اور واپس کر دیا، اسی طرح جانپانیر فتح کر کے وہاں کے راجہ کو بخش دیا، محمد شاہ دوم نے بھی اسی طرح کی فراخ دلی دکھائی؛ اور ایڈر فتح کر کے واپس دے دیا، قطب الدین نے غنیم سے آبو چھین لیا، اور اس کے اصلی وارث راجہ آبو کو دے دیا، سلطان مظفر دوم نے مالوہ فتح کرنے میں کتنی بڑی قربانی کی، مگر کس فیاضی کیساتھ اصل وارث کو واپس کر دیا، سلطانِ گجرات چلا آیا، بہادر شاہ نے بھی احمد نگر کے نظام شاہ کو وہاں کا تاج و تخت بخش دیا تھا، اور بارہا خاندیس فتح کیا گیا، اور ہر مرتبہ وہاں کے حاکم کو واپس کر دیا گیا، اسی طرح سلطان محمود نے جگت فتح کر کے واپس کر دیا۔

گجراتی بادشاہوں کے وزیر

گجراتی بادشاہوں کے عہد میں بڑے لائق اور قابل وزیر گذرے ہیں، جن پر گجرات آج بھی فخر کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی قابلیت، علم اور تدبر سے ہزارہا سیاسی مسائل حل کئے، ملک عبدالعلیم خداوند خاں، آصف خاں، محمد بن محمد خداوند خاں الانجی، افضل خان بنبانی ملک جیو، قاضی اختیار خان صدیقی ایسے باکمال وزیر گذرے ہیں، کہ اس عہد میں مشکل سے ہندوستان میں کوئی اُن کا مقابلہ کر سکتا ہے، سارے اختیارات اُن کے ہاتھ میں تھے، اور اُن کی وجہ سے سلطنت کو عروج ہوتا چلا گیا، ان وزیروں میں بعض ایسے اہلِ علم تھے کہ اگر وہ کرسئ وزارت کے بجائے مسند درس پر بیٹھتے تو ہزاروں اُن کے شاگرد ہوتے، ملک عبدالعلیم خداوند خاں فنِ نجوم میں بڑا ماہر تھا، محمد بن محمد الانجی فنِ حدیث کا استاد مانا جاتا تھا، قاضی اختیار خان صدیقی کا پایہ عام علوم وفنون کے ساتھ فلسفہ اور معرفت وسلوک میں اس قدر بلند تھا، کہ ایاس بن قرہ کا ہم رتبہ سمجھا جاتا تھا، آصف خاں فقہ، حدیث اور علوم عقلیہ میں بہت باکمال تھا، اور زہد و تقویٰ میں اس کا مرتبہ اس کے تمام ہم عصروں میں اونچا تھا، علمار کا قدردان، کتابوں کا عاشق اور غریبوں کا ماویٰ و ملجأ تھا، اس کی فیاضی اور دریادلی کی شہرت عرب وروم و شام تک تھی۔

اگر بہادر شاہ نے ان وزیروں کا مشورہ قبول کیا ہوتا، تو ہمایوں ہرگز گجرات میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ دیو کے سمندر میں ڈوب جانے

کی اس کو نوبت آتی ،

ذیل میں ان وزیروں کی ایک نامکمل فہرست درج کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اندازہ ہو گا کہ گجرات میں کیسے کیسے اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے ، افسوس کہ ان وزیروں کے سنین تقرر نہ مل سکے ، تاریخوں میں جس سنہ میں اُن کی موجودگی کا ثبوت مل سکا وہی درج کر دیا گیا ہے ،

شمار	نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
۱	مظفر شاہ اول	عماد الدین خداوند خاں		
۲	محمد شاہ تاتار خاں	شمس خاں دندانی ،		
۳	احمد شاہ اول	ملک ضیاء الدین نظام الملک[1]		اس کا باپ بھی عماد الملک کے خطاب سے سرفراز تھا ، فنِ جنگ میں ماہر تھا ،
		ملک فرید عماد الملک سمرقندی[2]		
۴	محمد شاہ ثانی زر بخش			
۵	قطب الدین احمد شاہ ثانی	خان جہاں ملک میر سلطانی ملک شعبان عماد الملک تحفہ سالطانی ،	۸۵۵ھ ۱۴۵۱ء	ملک شعبان شاہی غلاموں میں سے تھا ، ملک شرق کا بھی خطاب رکھتا تھا ، باغ تالاب مسجد ، اس نے بنوائی ، باغ شعبان مشہور باغ تھا ،

[1] مرأۃ سکندری ص ۲۵ – ۵۲ ، ص ۶۹ –

نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
			تالاب اب بھی موجود ہے، سلطان محمود کے ابتدائی چھ ماہ میں وزیر رہ کر مستعفی ہوگیا، اور گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور پھر ساری زندگی یادِ خدا میں صرف کر دی۔
۶ داؤد شاہ	ملک شعبان عماد الملک	۸۶۳ھ ۱۴۵۸	
۷ سلطان محمود اول	ملک شعبان عماد الملک[1]	۸۶۳ھ ۱۴۵۹	
	ملک بہاء الدین عماد الملک	۸۷۰ھ ۱۴۶۵	
	ملک عبدالعلیم خداوندخان بن یوسف دستور خاں آصف خان	۸۷۵ھ[2]	ملک علیم بہت بڑا عالم، فاضل اور فنِ نجوم کا ماہر تھا۔ محمود بیگڑہ کی بدنامی سے گھبرا کر اس کے خلاف سازش کی، مگر ناکام رہا، اس کی شادی مظفر شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی، جو محمود کی سوتیلی بہن تھی،

[1] مرآۃ سکندری ص ۹۰ طبقات اکبری ص ۱۳۲ ۔ [2] طبقات اکبری جلد سوم ص ۱۵۳

نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
			اس کے دونوں لڑکوں نے ایک امیر کو قتل کر ڈالا، اور فرار ہو گئے تو سلطان نے اس کو قید کر دیا، اور اسی قید میں وہ مرگیا،
	جمال الدین محمد محافظ خاں	سنہ [illegible]	
	رشید الملک محمد بن محمد مجد الدین الایجی،		
۸ مظفر شاہ ثانی	رشید الملک محمد بن محمد مجد الدین خداوند خان الایجی	سنہ ۹۱۷ھ[۵]	
	تاج خاں نرپالی		
	قیصر خان	سنہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء	
۹ سکندر شاہ	رشید الملک خداوند خان الایجی	″	
	تاج خاں نرپالی	″	تاج خاں نرپالی بہت ہی دور اندیش، فیاض اور مدبر تھا، مظفر شاہ

۵ ظفر الوالہ جلد اول ص ۱۳۳؛

نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
			ثانی کے بعد بہادر شاہ کے ابتدائی عہد میں مستعفی ہوکر گوشہ نشین ہوگیا،
	قیصر خاں	سنہ ۹۳۲ / ۱۵۲۶	ملک محمد جمال الدین بن شیخ ملک محافظ خاں
۱۰ نصیر خاں محمود ثانی	قیصر خاں		معمولی درجہ سے اس نے ترقی کی، پہلے اسلحہ خانہ کا محافظ تھا، پھر کوتوال ہوا، پھر احمد آباد کا کلکٹر، اور بعد کو صوبہ دار (گورنر) ہوگیا، بعدہٗ مستوفی الممالک (صدر محاسب) کے عہدہ پر پہنچا، اور آخر میں وزیر بن گیا، احمد آباد میں اس کی دو مسجدیں آج بھی موجود ہیں، بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا، اس کے اصطبل میں ایک ہزار

نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
[illegible]			گھوڑے بندھے رہتے تھے، بڑا مدبر اور سیاست داں تھا، اس کی سیاست اور تدبر کا غلغلہ اتنا بلند ہوا کہ ملک کے باہر بھی لوگ مرعوب ہوگئے، اس کا لڑکا ملک خضر تھا، اور اسی کا پوتا حسام خاں ہے، جو بہادر شاہ کے امیروں میں داخل ہے، اور تاریخ بہادر شاہی کا مصنف ہے،
سلطان بہادر شاہ	تاج خاں نرپالی	۹۳۲ھ 1525	
	قیصر خاں		
	محمود بن محمد مجد الدین خداوند خاں الایجی		محمد نام، مجد الدین لقب، اپنے وقت کے بہت بڑے علامہ تھے، فن حدیث کے ماہر تھے، سلطان محمود اعظم کے عہد میں گجرات آئے،

مرآۃ سکندری ص ۲۱۰

کیفیت	سنہ	نام وزیر	نام سلطان
درجہ بدرجہ ترقی کرکے شیدالملک کا خطاب حاصل کیا، امرو کے زمرہ میں داخل ہو۔ مظفر حلیم نے حدیث انہی پڑھی، اور وہ جب تخت بیٹھا تو اُن کو وزیر اعظم بنا اور خداوند کا خطاب د مظفر کے بعد سکندر کے میں بھی وزیر رہے، بہا شاہ کے عہد میں وزیر ا ہو گئے، آخر میں وزیر مخا نائب سلطان) ہو گئے، بادشاہ سے جنگ ہوئی یہ گرفتار ہو کر اس کے س پیش کئے گئے، تو اُن کے فضل کی شہرت کی بنا پر بڑی قدر کی، اُن کو مہ رکھتا، اور اُن سے علمی			

	نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
			[illegible]	ہمایوں جب ہندوستان سے ایران چلا گیا تو یہ شیر شاہ کے قبضہ میں آ گئے، اور اس سے گجرات جانے کی درخواست کی اُس نے بحفاظت تمام گجرات پہنچا دیا، سلطان محمود ثانی کے عہد میں یہ محمود آباد پہنچے، اچھی عمر پائی، ۸۰ سال کے تھے، ضعف سے گھوڑے کے بجائے پالکی پر سوار ہوتے[1]
	عبدالعزیز آصف خان[1]		متوفی ۹۶۱ھ ۱۵۵۴ء	
	خان جیو اختیار خاں			
	عبدالصمد افضل خاں		متوفی	
	بنبانی		۹۶۱ھ	
۱۲	سلطان محمود ثالث	خان جیو قاضی اختیار خاں	۹۴۳ھ	
		ابن داؤد صدیقی		
		عبداللطیف صدر خاں		
		ملک جیو عماد الملک بن		

[1] [illegible] جلد دوم ص ۶۲۲

	نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
		توکل دریا خاں		
		عالم خاں		
		نورالدین برہان الملک بنانی[1]		
		عبدالصمد افضل خاں	متوفی	
		بنانی بن محمود	سنہ ۹۶۱ / ۱۵۵۴	
		عبدالحلیم حمید الملک خداوند خاں	"	
		مسند عالی عبدالعزیز آصف خاں وزیر مطلق یا نائب السلطان	"	
۱۳	سلطان مظفر سوم	دریا خاں		
۱۴	سلطان احمد ثالث	شیر خاں بن عبدالکریم	"	
		اعتماد خان		
		اوجی ملک وجیہ الملک[2]		
		صدر خاں برادر عبدالصمد		
		اعتماد خاں وزیر اعظم یا نائب سلطان،		

[1] ظفر الوالہ ص ۲۶۹ [2] مرأۃ سکندری ص ۲۴۲ بمبئی

نام سلطان	نام وزیر	سنہ	کیفیت
سلطان مظفر شاہ چہارم	عبدالکریم اعتماد خاں	۹۶۸ھ ۱۵۶۰	
	ابوالفتح مرزا شمس الدین نولسیا	۹۷۶ھ ۱۵۶۸	

قیصر خاں | محمود اعظم نے جب چانپانیر فتح کیا، تو راجہ کا چھوٹا لڑکا اور لڑکی مع والی کے گرفتار ہوئے، لڑکا پرورش پاکر جوان ہوا، اور سلطان مظفر کے عہد میں امیروں میں داخل ہو کر "قیصر خاں" کا خطاب حاصل کیا، سلطان بہادر شاہ کے ابتدائی عہد میں بھی وہ وزیر رہا۔ لیکن شہزادہ لطیف خان بن مظفر شاہ کا طرفدار بن کر بہادر شاہ کے خلاف سازش کی اور پھر گجرات سے بھاگ کر دوسری جگہ چلا گیا، اور وہیں اس کی وفات ہوئی،

عبدالعزیز آصف خاں | عبدالعزیز نام، والد کا نام محمد حمید الملک، سندھ کے بادشاہ جام نندہ کے خاندان سے سلسلہ ملتا ہے، بمقام چانپانیر ۱۲ ربیع الاول ۹۰۱ھ ۱۵۰۰ء میں پیدا ہوئے، اپنے والد کی گود میں پرورش پائی، ابتدائی کتابیں بھی یہیں ختم کیں، پھر قاضی برہان الدین نہروالی سے علوم شرعیہ کی تعلیم پائی، اور علوم عقلیہ کی تحصیل خطیب ابوالفضل گازرونی صاحب حاشیہ بیضاوی سے کی، اور علامہ جلال الدین دوانی کے شاگرد

سلے النور السافر ص ۲۲۵ بغداد

سید ابوالفضل استرآبادی سے اس کی تکمیل کی، بعد فراغت تعلیم مکہ معظمہ سے
گجرات واپس آئے، اور سرکاری ملازم ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد ان کو
حبیب الملک کا خطاب ملا، اور محکمۂ وزارت میں داخل ہوئے، محمد بن
محمد مجدالدین وزیر اعظم نے اپنا نائب بنایا، اور بہادر شاہ نے اُس کو
منظور کر لیا، محمد مجدالدین خداوندخاں وزیر اعظم نے دیکھا کہ پورا محکمۂ وزارت
اس کا تابع اور وہ خود برائے نام رہ گیا ہے، تو مستعفی ہو گیا، سلطان
نے ان کو وکیل مطلق (نائب سلطان، اس کو وزیر مختار یا وزیر مطلق بھی کہتے ہیں)
بنا دیا، اور حبیب الملک کو مسند عالی آصف خاں کا خطاب دے کر وزیر
کے عہدہ پر سرفراز کیا، ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں جب کہ خداوندخاں ہمایوں کے
قبضہ میں چلا گیا، تو اُن کو وکیل مطلق کا درجہ دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا، تاکہ
ہمایوں کے مقابلہ میں سلطان سلیمان ترکی سے مدد حاصل کریں، یہ مکہ معظمہ سے
شام اور وہاں سے مصر، اور یہاں سے جہاز کے راستہ سے قسطنطنیہ پہنچے
اور سلطان سلیمان سے مدد کے طالب ہوئے، اس نے اس کا وعدہ کیا،
آصف خاں پھر مکہ معظمہ واپس آ گئے، اور دس برس وہاں مقیم رہے، کیونکہ
ہمایوں کے واپس جانے کے بعد بہادر شاہ پھر گجرات پر قابض ہو گیا تھا، وہ
اس کے مرنے پر گجرات کے امراء آپس میں لڑنے بھڑنے لگے، اور کسی نے
ان کی خبر نہ لی، ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء میں محمود ثالث نے اعتماد خاں کے مشورہ سے
اُن کو واپس بلا لیا، اور نائب سلطان اور وکالت مطلقہ کے عہدہ پر سرفراز
کیا، ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں برہان نامی غلام نے سلطان محمود کے ساتھ اس نیک دل

وزیر کو بھی قتل کر ڈالا، یہ بڑا عالم، محدث، متقی اور سخی آدمی تھا، تدبیر مملکت میں بے نظیر، سلطان کا وفادار، ملک کا بہی خواہ، علماء کا قدر داں، کتابوں کا عاشق، طلبہ کا حامی، غریبوں کا ماوی اور ملجا تھا،

عبدالحلیم | عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے، علم و فضل میں یکتا، تدبر اور نظم مملکت میں بے مثل، ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء میں افضل خاں کے بعد وزیر بنائے گئے، اور ملک میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا، اس کو مجتمع کرنے میں بے حد کامیابی حاصل ہوئی فوجی عہدہ داروں نے سلطان کو شاہ شطرنج بنا رکھا تھا جس کا یہ کوئی مداوا نہ کر سکے، یہ کام اُن کے بھائی عبدالعزیز خاں آصف خاں نے کیا، کہ بارہ ہزار فوج عرب، ترک اور حبشیوں کی، سلطان کی حفاظت کے لیے مقرر کر دی اور اس کی باگ سلطان کے ہاتھ میں دے دی، جس سے وہ بہت محفوظ اور مضبوط ہو گیا، اس کے بعد پھر کسی امیر کو جرات نہ ہوئی کہ سلطان کے ساتھ گستاخی کر سکے۔ عبدالحلیم کو خداوند خاں کا خطاب ملا تھا، انھوں نے دیوانی کے انتظامات اس قدر مکمل کر دیئے کہ مخلوق اُن سے خوش ہو گئی،

دونوں بھائیوں نے ملک کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے میں بے حد کوشش کی، اگر گجرات کو خدا کی مہربانی سے ایسے دو وزیر نہ مل گئے ہوتے تو شاید گجرات پر بہت جلد دوسروں کا قبضہ ہو گیا ہوتا، کیونکہ امیروں کی خانہ جنگی نے ملک کو تباہ کر دیا تھا، افسوس ہے کہ ۹۶۱ھ ۱۵۵۴ء میں سلطان کے ساتھ ان کو بھی شہید کر دیا گیا، اور احمد آباد کے شاہی خاندان کے مقبرہ میں ان دونوں بھائیوں کو دفن کر دیا گیا،

اختیار خاں | ان کا اصل نام معلوم نہ ہو سکا، گجرات میں اعلیٰ اور بلند مرتبہ کے افسر کو "خان جیو" کہتے تھے، اور آج بھی باپو جیو، یا صرف باپو کہتے ہیں اُن کے نام کے ساتھ بھی خان جیو لگا ہوا تھا، اختیار خاں خطاب تھا، نڑیاد کے باشندے تھے، اسی جگہ پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام داؤد تھا، صدیقی خاندان سے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے آباء واجداد کہیں باہر سے آئے تھے، اُن کے خاندان کے زیادہ تر لوگ اہلِ علم تھے، کئی پشت سے قاضی ہوتے چلے آرہے تھے، ایسے گہوارۂ علم و کمال میں اُن کی تعلیم ہوئی، ابتدائی کتابیں تو گھر پر پڑھیں، اور تعلیم کی تکمیل دوسری جگہ جا کر کی، افسوس ہے کہ اُن کے اساتذہ کا علم نہ ہو سکا،

تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ سرکاری ملازموں میں شامل ہو گئے، اور رفتہ رفتہ بہادر شاہ کے زمانہ میں محکمۂ وزارت میں لے لئے گئے، یادِ ایام کے مصنف نے لکھا ہے کہ تیرہ برس بہادر شاہ کے وزیر رہے، بہادر شاہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء کے آخری مہینوں میں تخت نشیں ہوا، اور ۹۴۳ھ میں وفات پا گیا، اس حساب سے گیارہ بارہ برس وزارت میں رہے، لیکن اس کی کسی تاریخ سے تصدیق نہیں ہوتی، اور مصنف نے کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا، اگر مصنف کی بات تسلیم کر لی جائے تو ۹۳۱ھ / ۱۵۲۴ء میں وزارت میں آئے، جو مظفر شاہ حلیم کا آخری زمانہ ہے، مگر میری نظر سے یہ کہیں نہیں گذرا، چانپانیر سے جب بہادر شاہ دیو چلا گیا تو قلعہ اُن کے سپرد کر گیا، ہمایوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا، تو یہ گرفتار ہو گئے، ہمایوں نے

ان کی قابلیت، لیاقت، اور تدبر، اور ملک و قوم کے ساتھ اُن کی وفاداری کو دیکھ کر اُن کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا، اور اپنے خاص مصاحبوں میں شامل کر لیا، اور جب ہمایوں ایران چلا گیا تو یہ گجرات واپس آ گئے اور بہادر شاہ کے بعد سلطان محمود ثالث کے ابتدائی عہد ۹۴۳ھ میں وزیر مطلق یعنی نائب سلطان کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے، ۹۴۴ھ ۱۵۳۷ء میں عماد الملک اور دریا خاں نے محض خبث نفسی سے اُن کو اور اُن کے بھائی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا، اور مرأۃ سکندری میں ہے کہ پھانسی پر لٹکا دیا، کلمہ کا پہلا حصہ انھوں نے ادا کیا تھا کہ رسی کھینچ لی گئی، جب اُن کو پھانسی کے تختہ سے اتارا گیا، تو آنکھیں کھول دیں اور کلمہ کا دوسرا حصہ محمد رسول اللہ کہہ کر جان بحق ہو گئے، پہلے دربار (بھدر) کے پاس والے باغ میں دفن کئے گئے، بعد کو خاندانی مقبرہ میں لیجا کر دفن کیا گیا، اُن کے ایک لڑکا بھی تھا، جو علم موسیقی اور سخاوت میں یکتا تھا، اس کی شادی آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس سے ایک لڑکا تھا، جو بڑا ہونہار معلوم ہوتا تھا، اختیار خاں نے موت کے وقت اپنے حریفوں سے کہا کہ عمر اور دولت میں اس سے زیادہ کیا ترقی ہو سکتی ہے، جو مجھے نصیب ہوئی، اُن کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ان کی عمر ۷۰، ۵۰ کے قریب ہو گی، اگر یہ صحیح ہے تو اُن کی ولادت سلطان محمود بیگڑہ کے عہد ۸۷۰ھ کے آگے پیچھے ہونی چاہئے۔

حاجی دبیر آصفی نے اُن کی بڑی تعریف کی ہے، وہ کہتا ہے کہ اختیار خان

بڑا ہی ذہین فطین اور صاحب فراست تھا، اس کو اپنے وقت کا ایاس بن قرہ کہنا بیجا نہ ہوگا، علوم عقلیہ، نقلیہ، ریاضی، ہندسہ، فلکیات، منطق، حکمت، شعرا معما میں کمال حاصل تھا، بدیہہ گوئی میں بے مثل تھا، اور تاریخ گوئی میں بے بدل، اسی سبب سے مظفر شاہ حلیم نے لار (ایران کے دریا کے کنارے کا حصہ) کے بادشاہ کے پاس اس کو سفیر بنا کر بھیجا تھا: اس نے اُن کی بڑی قدر کی، اور اُن کی سفارت بڑی کامیاب رہی، ممکن ہے اسی سے خوش ہوکر مظفر شاہ نے اس کو وزارت کے شعبہ میں لے لیا ہو، افسوس کہ گجرات میں پھر اس قابلیت کا شخص پیدا نہ ہوا[۱]

| عبدالصمد بنبانی | عبدالصمد نام، افضل خاں خطاب والد کا نام محمود، محمود بیگڑہ کے عہد

سنہ ۸۹۱ھ ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان بنبان سے آیا تھا، جو یمامہ (عمان کے پاس) میں ہے، اُن کے خاندان میں بڑے بڑے علماء صلحاء، قاضی اور مفتی پیدا ہوئے، علمی خاندان تھا، اس لئے بہترین تعلیم و تربیت پائی، اور اچھی قابلیت پیدا کی، سرکاری ملازمت میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرتے رہے، بہادر شاہ کے آخر وقت میں وزارت میں شامل کر لئے گئے۔ مرآۃ احمدی کے مصنف کا بیان ہے کہ بڑے متقی اور خدا ترس تھے، جب مسند وزارت پر بیٹھتے تو ایک شخص کفن لئے کھڑا رہتا تاکہ انصاف کرتے وقت قبر کا معاملہ پیش نظر رہے، علم و فضل میں بھی ممتاز تھے، عباسی خاندان سے تھے، اس لئے لوگ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے، سلطان محمود

---

[۱] ظفر الوالہ، مرآۃ سکندری، تاریخ فرشتہ وغیرہ سے یہ تمام حالات ماخوذ ہیں۔

کے ابتدائی زمانہ میں عماد الملک کا رویہ دیکھ کر مستعفی ہو گئے جب عماد الملک چلا گیا اور اختیار خاں بھی شہید ہو گیا: تو یہ پھر مسندِ وزارت پر آ گئے، ان سے قبل برہان الملک نور الدین محمد عباسی بھی وزیر رہ چکے تھے، جو ان کے چچا تھے، اور اُن کے والد محمود کے سگے بھائی تھے، ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں خداوند خاں صفر سلطانی کو دیو پر حملہ کرنے کی ترغیب دی، اور مدد کا وعدہ کیا، لیکن کوئی مدد نہیں پہنچائی، خداوند خاں شہید ہو گیا، اور مسلمانوں کو پرتگیزوں کے مقابلہ میں بدترین شکست ہو گئی، بڑے بڑے بحری افسروں نے عدم کی راہ لی، بہترین توپخانہ برباد گیا۔ سلطان محمود ان سے ناراض ہو گیا اور معزول کر کے دوسرے شخص عبدالحلیم خداوند خاں کو وزارت دے دی لیکن اُن کے سیاسی تدبر اور علمی فضیلت کی بنا پر سلطان ہمیشہ امورِ سلطنت میں ان سے مشورہ لیتا رہتا۔ اور بغیر اُن کے مشورہ کے کام نہ کرتا، ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں برہان نامی غلام نے ستر برس کی عمر میں سلطان محمود کے ساتھ اُن کو بھی شہید کر ڈالا، محمود آباد سے اُن کی لاش احمد آباد لائی گئی، اور یہیں دفن کئے گئے۔ شہر پناہ سے باہر راسے پور اور سارنگ پور دروازے کے درمیان اُن کی قبر ہے؛ انہی کے پہلو میں مشرقی جانب اُن کے بھائی ملک زین الدین کی قبر ہے۔ افضل پور کا محلہ انہی کا آباد کیا ہوا ہے، اور قبر سے متصل ایک سرائے بھی انہی کی تعمیر کردہ ہے۔ جو "افضل خاں کی سرائے" کے نام سے مشہور ہے، مقبرہ کے ساتھ پتھر کی ایک مسجد بھی تھی۔ جو بہت خوشنما تھی لیکن مومن خاں کے عہد میں مرہٹوں کے محاصرہ میں تباہ ہو گئی، حال

میں (۱۹۴۶ء ۱۳۶۶ھ) وقف کمیٹی نے اُس کو درست کرا کے پھر آباد کیا ہے، بنبانیوں کا صرف ایک خاندان احمد آباد میں آج آباد ہے، اور وہ لوگ سلطان احمد اول کے مقبرہ کے سامنے رہتے ہیں، ان میں سے تین افراد سید قائم الدین عریفی، سید احمد عریفی اور حسین عریفی قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، ان کا خاندان احمد آباد میں بہت مشہور ہے، بنبانیوں کا دوسرا خاندان بڑودہ میں ہے، اُن کو بڑودہ جاگیر میں ملا تھا، مگر آج صرف قضاۃ ان کے ہاتھ میں ہے، اس خاندان کے گل سرسبد قاضی احمد صاحب مہاراجہ پرتاب سنگھ بن فتح سنگھ بن سیاجی راؤ راجہ بڑودہ کے مصاحب ہیں، اُن کو راجہ کی طرف سے راج رتن کا خطاب ملا ہے،

صنعت وحرفت

ملکی صنعت وحرفت ہی وہ چیز ہے جو زراعت کے بعد ملک کی ریڑھ کو سب سے زیادہ نفع پہنچاتی ہے، اس میں بھی سلاطینِ ہند نے عموماً اور شاہانِ گجرات نے خصوصاً بے حد کوشش کی، اور مختلف اشیار کے ہزاروں کارخانے انھوں نے قائم کئے، سنگ تراشی، زردوزی، کارچوبی، چینی کا کام، صندل اور ہاتھی دانت کا کام بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا رہا، کپڑوں میں زربفت، کم خواب، مخمل، سقرلات، الاچہ، چکن، چیرہ، جیسی نادر قسم کی چیزیں بنائی جاتی تھیں، جو باہر جا کر بڑے داموں پر فروخت ہوتی تھیں، اطلس (ساٹن) بھی یہاں کا بہت مشہور تھا، بادشاہ خلعتوں میں اکثر دیتے تھے۔[۱]

سوت کے علاوہ ریشم، اون اور زری کا کام بہت ہی عمدہ ہوتا اور زریں کپڑوں میں ایک کام ہی گجراتی تھا، جس کی قیمت فی تھان

---

[۱] توزک جہانگیری ص ۱۹۰ - علی گڑھ،

۴۵۰ روپیے بھی، ایک اور قسم کے کپڑے کا نام "طاس گجراتی" تھا جس کی قیمت فی تھان ۳۱۵ روپیہ تھی، کوتہ دار گجراتی کی قیمت ۱۰۰ روپیے فی تھان ہوتی،

بہادر شاہی ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا تھا، جو ۱۰ روپیے فی گز فروخت کیا جاتا تھا، ایک اور قسم کا کپڑا "محمودی" کہلاتا تھا جس کی مانگ ہندوستان میں بہت تھی، یہ ۲ روپیہ فی گز بکتا تھا، ہلکے دام کا ریشمی کپڑا بھی عام طور سے تیار ہوتا تھا جس کی قیمت ایک روپیہ یا دو روپیہ فی گز ہوتی[۱]، کپڑوں کے مندرجہ ذیل اقسام بھی ملتے ہیں،

گلشن	انکو	گلاب	سلامہ	دل افروز	محبوبہ
۱۲ر	۱۲ر	۱۲ر	۱۲ر	۹ر	۹ر

(قدیم روزنامچہ ولی اللہ کی پیڑھی احمد آباد)

فرنگی، سالو، بھیرم، شربتی وغیرہ نام کے بھی کپڑے ملتے ہیں، ان میں سے فرنگی غالبًا غیر ملکی کپڑا ہے، جو پرتگیزی کسی دوسرے ملک سے لاکر یہاں فروخت کرتے تھے[۲]

سلطان سکندر کے عہد میں ایک نئے قسم کا کپڑا "جامۂ سکندری" نام کا بھی ایجاد ہوا تھا، افسوس کہ اس کی تفصیل نہ معلوم ہو سکی، اس بادشاہ کو ایجاد کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اس نے ایک خاص قسم کی دار ھی کا نام

---

[۱] آئین اکبری جلد اول قلمی [۲] مرقات الوصول قلمی کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ، احمد آباد،

"ریش سکندری" رکھا تھا۔

احمد آباد کا ایک خاص قسم کا کپڑا "چندر کلا" بھی تھا۔ یہ پٹن میں بھی تیار ہوتا تھا، ناگرا ور دوسری قوم کی عورتیں اس کو استعمال کرتی تھیں، زیادہ تر اس کی ساریاں بناتیں۔ اس زمانہ میں احمد آباد اور کھنبایت کے کھتری، مومنہ اور کاچھی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دونوں کور تو ریشم کے ہوتے ہیں۔ باقی تانا بانا سوت کا، غالباً پہلے اس میں چاند کا نقشہ بھی رہتا ہوگا۔ اگلے زمانہ میں اس کی بڑی شہرت تھی،

پٹولہ: اس میں ریشم یا دھاگے سے تصویریں بناتے۔ راقم نے بچشم خود اس کو پٹن کے کارخانہ میں دیکھا ہے۔ اس کی ساڑی کی قیمت کم از کم سوا سو روپیہ ہوتی ہے،

ہندوستان میں کپڑا بننے کے چار مرکز تھے، ڈھاکہ، مسولی پٹم، گجرات سندھ، گجرات کا مشہور شہر کھنبایت قالین سازی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ دریاں، شطرنجی (سوتی اور اونی) دونوں قسم کی تیار ہوتی تھیں احمد آباد کے رنگین، اور چھپے ہوئے کپڑے ۱۸ویں صدی کے آغاز میں قاہرہ اور پیکن تک جاتے تھے، کمخواب اور مشروع احمد آباد کی خاص چیز تھی، اس میں سونے چاندی کے تار ہوتے، ریشم سے زمین کا کام لیا جاتا، چاند تارہ، مور کلا، شجر بہت ہی نفیس بنائے جاتے۔ ان سب چیزوں کا مرکز احمد آباد تھا[۱] اس کے علاوہ اور مختلف قسم کی صنعتیں بھی گجرات میں تھیں، گجرات کا

---

[۱] ہندوستانی صنعتوں کا زوال، مصنفہ پی، آر، رام چندر،

اسلحہ سازی کا کارخانہ بیحد مشہور تھا، اور اس کی بنی ہوئی چیزیں دور دور جاتی تھیں، عرب و شام میں جس ہندی تلوار کی دھاک بندھی تھی، وہ اسی کارخانہ کی ہوتی تھی، یہاں کی کٹار بھی بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی، اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ یہاں کا قدرتی پانی اسلحہ کے لئے بہت موزوں تھا، سورٹھ کے موضع آدنہ میں ایک کنواں تھا، جس کے پانی سے اسلحہ پر بڑی آب و تاب آتی تھی، جس کی دور دور شہرت تھی، کوہ جمیل وآثار سے سونا نکلتا تھا، کیرونج میں شیشہ (کانچ) کی مٹی پیدا ہوتی تھی، جس سے سبز رنگ کی چوڑیاں ور دیگر سامان تیار ہوتا تھا، اسی کیرونج میں چاندی اور لوہے کی کانیں بھی تھیں، جہاں سے لوہا نکالا جاتا تھا، ایڈر کی پہاڑیوں میں ایک خاص قسم کا چونا ہوتا تھا، جس کو گجرات کے کاریگر پالش دے کر ایسا روشن کر دیتے تھے، کہ لوگ دیکھ کر آئینۂ حیرت بن جاتے، آگرہ کے روضۂ تاج محل میں یہی استعمال ہوا ہے، موضع نرورہ (احمد آباد) میں لوہے کے ریزے ہوتے، جس کو طبیب مدبر کرکے دوا میں استعمال کرتے، بڈنگر کی زمین سے لاکھوں من شورہ تیار کیا جاتا تھا، جو آتش بازی کے علاوہ فوجی کام میں بھی لائے جاتے، کھنبایت میں عقیق کی کاریگری آج کی طرح پہلے بھی تھی، بٹن، چاند، صلیب، پن، چھری، چاقو اور اسلحہ کے دستے، پیالہ، تسبیح، تعویذ، کاغذ کٹ، گھڑی کا چین، انگوٹھی کا نگینہ، کان کے دُر، گلے کا ہار، بڑی صفائی سے نہایت خوبصورت تیار ہوتے تھے،

سنہ ۱۵ سنہ صدی کے وسط میں اس کے علاوہ اور بھی مختلف قسم کے کارخانے جاری تھے، مثلاً جنوبی احمد آباد میں شاہ بھیکن کے مزار سے متصل ایک پن چکی تھی، جس سے آٹا پیسنے کا کام لیا جاتا تھا۔[۱]

چہار گلشن کا مصنف لکھتا ہے کہ گجرات کی مشہور مصنوعات میں ابریشم نزدی، زربفت، مخمل، کمخواب، مشروع، شمشیر، جمدھر، تیروکمان، مروارید، مرجان وغیرہ تھے، البتہ چاندی عراق اور روم سے آتی تھی۔[۲]

حدیقۃ الاقالیم میں ہے کہ اس صوبہ کے کاریگر صندوقچہ، قلمدان، پارچہ زرتار، کمربند، کمخواب، زربفت، مشروع، تافتہ، ٹاٹ بند، اور مخمل بہت نفیس بناتے ہیں، شمشیر، جمدھر اور تیروکمان کی بڑی شہرت ہے، مولف کتاب قاضی مرتضیٰ حسن بلگرامی نے ان چیزوں کو بچشم خود دیکھا تھا، لکھتے ہیں، واقعی ہر چیز بے نظیر بنتی ہے۔[۳]

احمد آباد میں شیعہ بوہروں کے ملا داؤد راجح صاحب کا صابون کا ایک کارخانہ تھا، ملا داؤد عالم باعمل تھے، لیکن پیشہ صابون سازی کا تھا، مظفر شاہ حلیم کے عہد (سنہ ۹۱۰ھ / ۱۵۵۱) میں ایران کا سفیر آیا تو اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔[۴] سرکھیج میں نیل سازی کے بہت کارخانے تھے، یہاں سے یورپ کے ملکوں میں بکثرت نیل جاتی تھی، بہادر شاہ کے عہد میں

---

[۱] مراۃ احمدی کا خاتمہ اور مقدمہ جلد اول مطبوعہ بمبئی [۲] چہار گلشن قلمی منقولہ سنہ ۱۱...ھ

[۳] حدیقۃ الاقالیم قلمی کتب خانہ، راجہ سلیم پور (لکھنو)

[۴] موسم بہار جلد سوم قلمی،

جہاز سازی کے کارخانے گھوگھہ، کھنبایت اور سورت میں قائم تھے، توپ سازی کے کارخانے بھی بڑے اعلیٰ پیمانے کے تھے، محمود ثالث کے عہد میں جزیرہ دیو کو پرتگیزوں سے واپس لینے کے لئے جو جنگی تیاری کی گئی تھی، اس کے لئے توپ اور جہاز خاص طور سے گجرات ہی میں تیار ہوئے تھے،

مغلوں کے عہد میں بھی ہندوستان کے صنعتی شہروں میں یہ اوّل نمبر کا شہر شمار ہوتا تھا، جہانگیر کے عہد میں جب شاہجہان اس صوبہ کا ناظم ہوکر آیا، تو یہاں کی عمارت اور کاریگری اس کو بہت پسند آئی، اس نے احمد آباد میں ایک سرکاری کارخانہ قائم کیا، جس میں گجرات کے ہنرمند اور کاریگر کام کرتے تھے، ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) سے قبل اسی کارخانہ ایک تخت مرصع دس لاکھ روپیہ کا اور شمشیر کا پرتلہ دو لاکھ میں تیار کرایا تھا[1]، قلعۂ معلی اور تخت طاؤس کے تیار ہونے پر ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں جو دربار ہوا تھا، اس موقع پر اس کے لئے زربفت کا شامیانہ ایک لاکھ روپیہ میں اسی کارخانہ میں تیار ہوا تھا، جس کا مخملی سائبان، طلائی اور نقرئی ستونوں کے نقش و نگار احمد آباد کے کاریگروں کی ہنرمندی کے مظہر تھے،

اسی کے عہد میں دوسری "بارگاہ مخملی" زربفت کلابتو کی بناوٹ کی، جس کا طول ۴۲ گز اور عرض ۳۶ گز تھا، پچاس ہزار کی لاگت سے اسی کارخانہ میں تیار ہوئی تھی، جو ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) کے جشن میں کام میں لائی گئی[2]. عالمگیر

---

[1] مآثر الکرام کلکتہ۔ [2] مرآۃ احمدی جلد ا دل بیان شاہجہان،

اور شاہ عالم کے عہد میں بھی یہ کارخانہ قائم تھا۔ شاہ عالم نے چار مخملی شامیانے ۶۵ ہزار کی لاگت کے اسی کارخانہ میں تیار کرائے تھے،

سولھویں صدی میں گجرات کی صنعت میں کاغذ بھی تھا، اس کے ہزاروں کارخانے گجرات میں قائم تھے، احمد آباد کے علاوہ پٹن اور کھنبایت میں بھی اس کے کارخانے تھے، پٹن کے کاغذ کا نام ہی پٹنی ہو گیا تھا، چنانچہ جوناگڑھ کی پبلک لائبریری میں ایک قلمی کتاب ہے۔ جو اسی پٹنی کاغذ پر لکھی ہوئی ہے،

کھنبایت میں اس کے متعدد کارخانے تھے، اور ابھی تک وہ محلہ موجود ہے، جہاں کاغذ بنتا اور فروخت ہوتا تھا، احمد آباد میں اس کثرت سے کاغذ تیار ہوتا تھا کہ ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں بھی جاتا تھا، یہ کاغذ سفیدی اور چکنے پن میں بے مثل تھا، ہندوستان کے کسی صوبہ کا کاغذ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، موٹا، باریک، بڑا، چھوٹا ہر قسم اور ہر سائز کا کاغذ تیار ہوتا تھا، رنگین کاغذ بھی مختلف اقسام کے بنتے، جو بہت چکنے ہوتے، ان میں سے بادامی رنگ کا کاغذ تجارتی روزنامچوں اور آمد و خرچ کے رجسٹروں میں زیادہ استعمال ہوتا، اگرچہ یورپ کے کاغذ کی ارزانی اور درآمد نے اس صنعت کو بالکل فنا کر دیا ہے، مگر گجراتی ساہوکاروں اور تاجروں کی بدولت بادامی کاغذ کی صنعت احمد آباد میں آج بھی زندہ ہے، ان کاغذ فروشوں کو کاغذی کہتے ہیں، اس نسبت نے آخر میں اس قدر شہرت حاصل کی کہ متعدد خاندانوں کے نام ہی کاغذی

(ٹانک) ہو گئے، اور آج وہ اسی سے شناخت کئے جاتے ہیں، احمد آباد میں ان کا ایک خاص محلہ تھا، جو اُن کی نسبت سے "کاغذی محلہ" مشہور تھا، زرافشاں کاغذ بھی احمد آباد میں بنتا تھا، جس کے نمونے اب بھی ملتے ہیں، احمد آباد کے کتب خانۂ پیر محمد شاہ میں بعض نمونے آج بھی موجود ہیں، کاغذ کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ اگرچہ دولت آبادی اور کشمیری کاغذ بہت ہی عمدہ ہوتا تھا، لیکن پھر بھی سفیدی اور چمک میں احمد آبادی کاغذ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، مگر اس وصف کے باوجود اس میں ایک عیب بھی تھا، یعنی تیار ہونے کے بعد غیر محسوس طور پر اس میں سوراخ ہو جاتے، اس کا سبب احمد آباد کی جائے وقوع ہے، مرزا علی محمد خاں صاحب مرأۃ احمدی نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ شہر ریگستانی علاقہ میں ہے، اس لئے ریت کے ذرّے اڑ اڑ کر کاغذ کے خمیر میں مل جاتے ہیں، اور چکنا کرنے کے وقت خشک ہو کر باہر نکل آتے ہیں، اس طرح سے اس میں سوراخ ہو جاتے ہیں لیکن اس کھلے ہوئے عیب کے باوجود بھی اس کی سفیدی، خوش نمائی اور چکنے پن کی وجہ سے اس کی مانگ بہت تھی، ہندوستان کے دور دراز حصّوں سے گذر کر عرب و شام اور روم تک جاتا تھا اس سے تاجروں کو بڑا فائدہ ہوتا تھا اور ہزاروں اور لاکھوں روپیے کا کاغذ برآمد کرتے تھے،

کھنبایت سے سفید نمک اور ویرم گام میں سیاہ نمک تیار ہوتا تھا، ساج (ساگ، ساگوان) کی لکڑی سے کڑیاں، شہتیر اور جہاز

تیار ہوتے تھے، شیشم کی لکڑی سے فرنیچر کے علاوہ خاص طور سے رتھ تیار کیا جاتا تھا،

سولھویں صدی کی ابتدا میں گجرات میں موسیقی کا بڑا رواج ہوگیا تھا، آلاتِ موسیقی میں خصوصیت سے رباب کی بہت مانگ تھی، محمود بیگڑہ کے لئے تو خاص طور سے تیار کرایا گیا تھا، اس کے لڑکے مظفر کے لئے سونے اور جواہرات کا ایک بیش قیمت ہنس چھ مہینے میں تیار ہوا تھا، جو صناعی کا بہترین نمونہ تھا، یہ ایک جشن کے موقع پر سرستی سوانگ کے لئے خاص طور سے استعمال کیا گیا، اس کا پارٹ بائی چھانامی ایک رقاصہ نے بڑی خوبی سے ادا کیا، رباب، چتری، چتروا چھ، سرمنڈل وغیرہ دوسرے آلاتِ موسیقی بھی بکثرت تیار ہوتے، بادشاہ خود اس فن کا بڑا ماہر تھا[۱]،

غرض صنعت کے اعتبار سے گجرات بہت آگے تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ خاص احمد آباد کے محلہ عثمان پورہ میں دس ہزار مکانات محض کاریگروں کے تھے[۲]

سنگ تراشی گجرات سنگ تراشی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا، وہاں پتھر کی جو عمارتیں ہیں، ان میں طرح طرح کے نقش و نگار ہیں، بکثرت نبت کاری کے کام ہیں، مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے اور مقبرے سب میں اس صنعت کا نمونہ موجود ہے، خصوصیت سے سنگِ مرمر پر جو کام ہوا ہے، اور مقبروں اور مسجدوں میں جو جالیاں ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، احمد شاہ اول

---

[۱] مرآۃ سکندری بمبئی ۵۲ [۲] مرآۃ احمدی کا مقدمہ ص ۱۴-۱۵-۱۶ کلکتہ،

کے مقبروں کی جالیاں اور شیخ احمد کھٹو کے مزار کی متعدد قسم کی جالیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔ غیر ملکی انجینیر جو احمد آباد آتا ہے، وہ سرکھیج جاکر اُن کو ضرور دیکھتا ہے، احمد آباد کے لال دروازہ کے پاس کی کھجور یہ مسجد کی جالی اس قدر لاجواب ہو کہ انسان اس کو دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے، جامع مسجد کے شہ نشیں، اور محمود بیگڑہ کی قبر پر بہترین سنگ مرمر کا کام ہوا ہے، سنگ تراشی کے بہترین نمونے پٹن کے قدیم زمانہ کے مندروں میں تھے جنمیں سے کچھ تو یورپین اور امریکن سیاح لے گئے جو باقی رہ گئے وہ آج بھی قابل دید ہیں، سوامی نرائن کے مندر اور ہٹی سنگھ کی باڑی میں سنگ تراشی کے بہترین نمونے ہیں،

سکے اسلام سے قبل گجرات میں جو سکہ رائج تھا اسلامی تاریخوں میں اس کا نام طاطریہ لکھا ہے، یہ چاندی کا تھا، نویں صدی کے وسط میں سلیمان تاجر جب یہاں آیا ہے، تو اس وقت بھی یہ سکہ رائج تھا، اُس نے لکھا ہے کہ اس کا سنہ راجوں کے نام سے ہوتا ہے، اس پر راجہ کی تصویر بھی ہوتی ہے، یہ ½ یا ½۱ درہم کے برابر تھا، اور وزن ایک مثقال، درہم چار آنے کے برابر ہوتا ہے، اس اعتبار سے طاطریہ ۲ریا ۶ر کے برابر تھا، علاء الدین خلجی اور تغلق کے عہد میں گجرات میں دلی ہی کے سکے رائج تھے، مثلاً فلوس (پائی) دوگانی (ادھنا) ہشت گانی (دوآنہ) جیتل (پیسہ) ٹنکچہ، ٹنکہ سفید، (روپیہ) ٹنکہ طلائی (اشرفی)

جب گجراتی بادشاہوں نے خود مختاری حاصل کی، تو اُن کے سکے علحدہ

ہوگئے، لیکن یہ بالکل دلّی کے سکوں کی نقل تھی، اس پر بادشاہ کا نام خطاب سنہ اور مقام ٹکسال درج ہوتا تھا، سلطان مظفر اوّل، محمد شاہ اوّل، سلطان احمد شاہ اوّل، محمد شاہ ثانی کے عہد تک مندرجۂ ذیل سکے رائج تھے، جیتل، ٹنکچہ، ٹنکہ سفید، ٹنکہ طلائی، ان کے علاوہ چھوٹے بڑے مختلف قسم کے تانبے کے سکے راقم الحروف کو ملے ہیں، لیکن ان پر قیمتیں درج نہیں ہیں، اس لئے اُن کی قیمتوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا،

۱۹۲۳ء میں کھنبایت میں سلطان مظفر حلیم متوفی ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء کے ابتدائی عہد کا ایک طلائی سکہ میری نظر سے گذرا ہے، جو ایک شخص زمین کھودتے وقت مل گیا تھا، یہ گول اور تانبہ کے سکے کی شکل کا تھا، اسی طرح سلطان محمود اعظم کے زمانہ کا ایک طلائی سکہ ایک شخص فروخت کرنے کے لئے لایا تھا، اس کی شکل بھی وہی تھی، اور چاندی اور تانبے کے سکہ کی طرح اس پر بادشاہ کا خطاب، نام اور ٹکسال سب کچھ درج تھا، ٹنکہ سفید بھی، جو روپیہ کے برابر ہوتا ہے، اسی شکل اور نقش کا ہوتا ہے، احمد شاہ اول، محمود شاہ اول، مظفر شاہ آخر کے عہد کے سکے بکثرت ملتے ہیں، مظفر شاہ اوّل کا سکہ نایاب ہے، چند روزہ بادشاہوں کے سکے بھی کمیاب ہیں، جیسے محمد شاہ اوّل، محمود دوم، مظفر سوم، سکندر وغیرہ کے،

ان سکوں کے نام میں آگے چل کر بڑی تبدیلی ہو گئی، محمود اوّل کے وقت میں چاندی کے ایک ٹنکہ کا نام محمودی ہو گیا تھا، پھر مظفر آخر کے زمانہ میں مظفری ہو گیا، چنگیز خان کے عہد میں ایک سکہ کا نام

چنگیزی تھا، سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں جام نگر کے راجہ نے مظفری اور جامی نام کے سکے اپنے یہاں رائج کئے، جوناگڈھ اور پوربندر کے حاکموں نے بھی مظفری سکے مسکوک کرائے، راقم الحروف کے پاس یہ سب سکے موجود ہیں،

سکوں کی قیمت | طلائی ٹنکہ کی قیمت تو معلوم نہ ہو سکی لیکن طلائی دینار جس کو اشرفی بھی کہتے تھے، اس کی قیمت ۸ روپیہ سے لے کر ۲۵ تک ہوتی تھی، جو مختلف عہدوں میں مختلف وزنوں کے ڈھالے گئے تھے، ٹنکہ سفید جو چاندی کا ہوتا تھا، عام طور سے ایک تولہ کے برابر ہوتا، چنانچہ محمود اول کے ایک سکہ کا وزن کیا گیا، تو کم و بیش ایک تولہ تھا، اس میں تانبہ تو برائے نام لیکن چاندی زیادہ ہوتی تھی، یہ ہمارے زمانہ کے ایک روپیہ کے برابر تھا، اسی طرح اٹھنی اور چونی بھی ہوتی، راقم کے پاس یہ سب موجود ہیں،

چونکہ مختلف عہدوں میں ٹنکوں کا وزن کم و بیش ہوتا رہتا ہے اسلئے اسی اعتبار سے اس کی قیمتیں بھی گھٹتی بڑھتی رہی ہیں، ذیل کی تفصیل سے اسکا اندازہ ہوگا

۵،۰۰۰،۷ محمودی ... ۲۲۵ روپیہ کے برابر ہوتا ہے، سلطان محمود بیگڈھ کے زمانہ کی محمودی (چاندی) آٹھ اکبری کے برابر ہوتی تھی، اس کا وزن ۴½ ماشہ تھا، عالمگیر کے عہد میں اس کا دام گر گیا، اور ایک روپیہ میں دو یا تین محمودی ملتی تھی، مظفر حلیم کے وقت کا ایک ٹنکہ آٹھ مرادی ٹنکہ کے برابر تھا، یہ مرادی سکہ کس بادشاہ کے عہد کا تھا، اس کا پتہ گجرات کی تاریخوں سے مجھے نہیں مل سکا، مرأۃ سکندری میں سکہ کا تو ذکر ہے مگر بادشاہ کا نام نہیں لکھا ہے،

فرشتہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مظفر حلیم کے عہد کا ۲۰ لاکھ ٹنکہ گجراتی دو ہزار تومان کے برابر ہے[1] تومان ایران کا مشہور سکہ تھا۔ فارسی لغت میں لکھا ہے کہ ایک تومان میں روپیہ کا ہوتا ہے۔

بہادر شاہ اپنی فیاضی کے لئے مشہور ہے، جب کبھی وہ انعام دیتا تھا تو ایک لاکھ سے کم رقم اس کی زبان پر نہ آتی، اس لئے وزیروں سے مشورہ کرکے کم قیمت کا ٹنکہ بنوایا، جو ۲۱ دوکڑے کا تھا، یہ تانبے کے پیسہ کے برابر تھا، اس حساب سے بہادر شاہی ٹنکہ کی قیمت آج کل کے حساب سے ۰۰ ر ہوتی ہے۔

ظفر الوالہ میں ہے کہ جب ۹۴۲ھ میں بہادر شاہ نے چتوڑ فتح کیا ہے، اس وقت ایک کرا وڑ قدیم گجراتی سکہ دلی کے چالیس کرا وڑ کے برابر تھا، گویا ایک گجراتی ٹنکہ کے چالیس ہندوستانی ٹنکے ملتے تھے۔

سلطان احمد ثالث متوفی ۹۶۹ھ ۲۲ کرور گجراتی ٹنکہ ۲۲ لاکھ اکبری ٹنکہ کے برابر تھا، اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ بہادر شاہ کے عہد میں ٹنکہ کا جو وزن کم ہوا اسی سے اس کی قیمت گھٹ گئی، پھر سلطنت کی کمزوری کا بھی اس پر اثر پڑا ہوگا۔

ٹنکہ سفید ایک تولہ خالص نقرہ کے برابر ہوتا تھا جو اس وقت کم و بیش ایک انگریزی روپیہ کے برابر ہوا۔

گجرات کے پڑوس دکن میں ہون (ہن) ایک تولہ چاندی کا ہوتا ہے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد سوم بیان سلاطین گجرات [2] فرامین سلاطین ص ۱۴ مطبوعہ دہلی۔

½ ہن یعنی نصف ہن کا اور فنم 1/16 ہن کا ہوتا تھا[۵۱]

اسی طرح پانچ بھدیہ مساوی بارہ ٹنکہ مرادی کے ہوتا تھا[۵۲]۔ فیروزشاہ کے عہد میں بھدیہ کا بڑا چلن تھا، مولانا قاسم صاحب فرشتہ نے شیخ احمد کھٹو کے جو حالات تحریر کئے ہیں اس میں اس سکہ کا بار بار ذکر آتا ہے، مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ تانبے کا تھا، یا چاندی کا، اغلب یہ ہے کہ چاندی ہی کا ہوگا،

گجرات کے خزانہ میں جواہرات اس قدر اعلیٰ تھے کہ اس عہد میں کوئی ہندوستانی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی،

جواہرنامہ میں لکھا ہے کہ جوہریوں کا قول تھا کہ الماس پندرہ قیراط سے زیادہ ادھر دیکھنے میں نہیں آیا، مگر گجرات کے خزانہ میں ۳۰ یا ۴۰ قیراط کا الماس موجود ہے[۵۳]،

یہی سبب تھا کہ اکبر بادشاہ نے اعتماد خان گجراتی کو جو مظفرشاہ آخری سلطان گجرات کا وزیر تھا، اپنے جواہرخانہ کا ناظم بنادیا تھا،

اوزان | گجرات میں مختلف اشیا کے مختلف اوزان ہیں، جس کو صاحب مرآۃ احمدی نے اپنی کتاب کے آخر میں لکھا ہے تمام اوزان کو نقل کرنا تو طول عمل ہے، صرف وہ اوزان لکھے جاتے ہیں، جو چاندی، سونے اور غلہ کے لئے مستعمل تھے،

---

۵۱ تاریخ فرشتہ حواشی ص ۱۸۱ حیدرآباد ۵۲ مرآۃ سکندری ص ۴۴۲ بمبئی؟

۵۳ جواہرنامہ قلمی کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمدآباد

بیں دام شاہجہانی یا تیس دام عالمگیری کا ایک سیر گجراتی ہوتا تھا، جس کو لوگ کچا سیر کہتے تھے، لیکن چالیس دام شاہجہانی ایک سیر گجراتی پختہ کہلاتا تھا، چالیس سیر کا ایک من ہوتا، دونوں من یعنی خام اور پختہ عام طور سے مستعمل تھے، یعنی ایک من شاہجہانی کا دو من گجراتی ہوتا تھا،[1]

ایک قدیم قلمی کتاب میں ناپ تول کے لئے جو اوزان لکھے ہیں، اُن کو ذیل میں لکھا جاتا ہے،

۲ چاول ساٹھی	کی	ایک کھونچی
۳ کھونچی	"	ایک دال
۸ "	"	ایک ماشہ
۴ ماشہ	"	گنڈیانہ
۲ گنڈیانہ	"	تولہ (اور ۳۲ کھونچی کا ایک درم یا یا درہم اور ایک درہم کا ایک ٹانک)
۳ درہم	"	"
۳ ٹانک	"	"
۲۴ تولہ		سیر
۴۰ سیر		من

اس حساب سے موجودہ انگریزی سیر جس کو بنگالی سیر بھی کہا جاتا ہے اور جو ۸۰ تولہ کا ہوتا ہے، اس کا گجراتی وزن تین سیر آٹھ تولہ ہوگا،

---

[1] مرآۃ احمدی کا خاتمہ ص ۱۶۵ کلکتہ،

تجارت

گجرات میں ہر قسم کی تجارت کو فروغ تھا، ملکی چیزیں باہر جاتی تھیں، اور باہر کی چیزیں اندرونِ ملک میں آتی تھیں، گجرات کی تجارت زیادہ تر سمندر کے راستہ سے ہوتی تھی، یمن، شام، مصر، عراق، عرب، اور حبشہ سے وسیع پیمانہ پر تجارتی تعلقات قائم تھے، لوگوں کے پاس مختلف قدوقامت کے جہاز موجود رہتے، مالوہ، دکن اور سندھ کے خشک راستہ سے خراسان کا مال آتا تھا، سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں دستار دکن سے آتی تھی، گھوڑے عموماً خراسان سے خریدے جاتے تھے، چنانچہ محمود بیگڑا کو ایک دفعہ انہی خراسانی گھوڑوں کی وجہ سے آبو کے راجہ سے لڑائی مول لینی پڑی، اس نے ان کو تاجروں سے بجبر چھین لیا تھا، عراقی اور عربی گھوڑے بصرہ اور قطیف سے آتے تھے، سونا، چاندی، تانبہ عراق ورروم سے آتے تھے،

اس عہد میں کھنبایت گجرات کا بڑا بندر تھا، دوسرا جزیرہ دیو تھا، پھر بھروچ، مغلیہ عہد میں سورت کو بڑا عروج ہوا، اس کے علاوہ جام نگر، بھاونگر، منگرول، پوربندر، سومناتھ، پٹن، راندیر، تھانہ کے بندگاہ

بھی بہت آباد تھے، چھوٹے بڑے تمام بندرگاہوں کی تعداد ۸۴ تھی، اُن میں زیادہ تر گجرات کی تھیں،

سلطان محمود کے عہد میں دیو بڑا آباد اور پُر رونق ہوگیا تھا، اور ہر قسم کا تجارتی مال یہاں درآمد ہوتا تھا، بہادر شاہ کے عہد میں اُس کو اور زیادہ ترقی ہوگئی، چنانچہ ۹۳۷ھ میں جس قدر تجارتی مال دیو میں آیا تھا اُس میں سے ہر طرح چیز کے خریدنے کا حکم صادر کیا، تیرہ ہزار من تو صرف گلاب کا عرق خرید اگیا[۱] اسی سے آپ دوسری چیزوں کی خریداری کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں، اس بندر میں سالانہ ایک سو سے زیادہ تجارتی جہاز اور ایک ہزار سے زیادہ مسافروں کے جہاز آتے تھے، دو سو جنگی جہاز بھی یہاں رہتے تھے[۲]

کپڑوں میں ایک قسم کا کپڑا صرصر تھا، جو باہر سے آتا تھا، اور شاہی خلعتوں میں بکثرت استعمال ہوتا تھا، اسی طرح شاہی اطلس کی گجرات میں بڑی کھپت تھی، گجراتی تاجر شام سے یہاں لاکر بڑا نفع اٹھاتے تھے، جس کو درباریوں کو خلعت میں دینے کے لئے زیادہ تر بادشاہ خریدتا تھا،

گجرات کے آخری بادشاہ مظفر کے عہد میں جب چنگیز خاں نے بھروچ پر قبضہ کرلیا، تو بھروچ کے بندر میں بڑی رونق آگئی، اور لاکھوں کا مال آنے لگا، آمدنی کی کثرت اور دولت کی بہتات سے چنگیز خاں کی نظر میں مالِ تجارت مکہ کی کوئی وقعت نہیں تھی، ۹۶۵ھ میں دو جہاز بندر جدہ سے روانہ ہوکر

---

[۱] ظفر الوالہ جلد اوّل، حالات بہادر شاہ طبع لندن،

[۲] کتاب مذکور ص ۱۱۶ –

بھروچ پہونچے، جن میں مالِ تجارت بھرا ہوا تھا، اس زمانہ میں عبداللہ خاں اوزبک گورنر تھا، وہ بھاگ کر چنگیز خاں کے یہاں آیا ہوا تھا، چنگیز خاں بغیر دیکھے ہوئے بلا تامل دونوں جہاز عبداللہ خاں کو دیدیئے،

سلطان محمود کے عہد میں اسلحہ بھی باہر سے آتے تھے، مثلاً آہنیں کھیلن[1] تلنگانہ سے، توپ بندوق، مصر اور اسپین سے، تلواریں سے، خنجر، جدھر وغیرہ خراسان سے، ان میں سے بعض کا قبضہ طلائی بھی ہوتا، جس کا وزن چار سیر سے چھ سیر تک ہوتا،

اس کے بعد گجرات نے بڑی ترقی کی، اور یہاں بھی سامانِ جنگ بننا شروع ہوا، چنانچہ سروہی میں بہت اعلیٰ درجہ کی کٹار اور تلواریں تیار ہونے لگیں، تیر کا نیزہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا ہوتا کہ عرب و شام میں بطور تحفہ اور ہدیہ کے جاتا، کچھی گھوڑے، گجراتی بیل (قدآور اور کوتاہ قامت) شکاری چیتے، سورٹھ کے باز، راج پیلہ کے ہاتھی ساری دنیا میں مشہور تھے، اور یہاں سے دوسرے ملکوں میں بڑا ہدیے جاتے تھے، کپڑہ، عقیق، کاغذ، نیل، ڈھال کی تجارت بھی بہت اعلیٰ پیمانہ پر تھی اور دور دور ملکوں میں یہ سب چیزیں جاتی تھیں، اور ان سے گجراتی تاجر بیحد نفع اٹھاتے تھے،

تجارت میں سب سے بڑا حصہ بوہروں کا تھا، یہ سیاست سے الگ رہ کر، اپنی ساری توجہ تجارت کی طرف رکھتے تھے، اس لئے ان میں

---

[1] آہنیں جھول،

سے ہر شخص خوشحال اور مطمئن تھا، اُن کی تجارت زیادہ تر عرب ملکوں سے تھی، یہ راجہ جے سنگھ کے عہد سے گجرات میں تجارت کر رہے تھے،

ہندوؤں نے بھی تجارت میں بڑی ترقی کی، ان میں بڑے بڑے، دولت مند تاجر اور سیٹھیے تھے، ان کے ایجنٹ عرب و شام اور مصر و عراق تک دورہ کرتے تھے، مسلمان تاجروں کے ایجنٹ ہندو، اور ہندو بیوپاریوں اور سیٹھوں کے ایجنٹ مسلمان ہوتے، سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک ہندو سیٹھ کا ایجنٹ ایک بوہرہ مسلمان جدّہ اور یمن میں اس کی طرف سے کام کرتا تھا، ایک مرتبہ اس نے بغیر اپنے سیٹھ کی اجازت کے اپنے واعی وقت (گرو) کے مشورہ سے مال کی خریداری کی اور بڑا نفع کمایا، جس سے سیٹھ بے حد خوش ہوا،[1]

ان تاجروں میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بڑا اخلاص تھا، اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک ہندو سیٹھ جاترا کے لئے دوارکا گیا، وہاں اتفاق سے اس کو روپیہ کی سخت ضرورت پیش آگئی، تو جام نگر کے ایک بوہرہ مسلمان تاجر نے میں وقت پر اس کی مدد کی، ایک مرتبہ بوہروں کے واعی وقت کو روپیہ کی ضرورت ہوئی، تو اسی سیٹھ نے جو دوارکا گیا تھا، ضرورت پوری کی اور اُن کو روپیہ دیا،[2]

---

[1] [2] کوکب فلک بیان سیدنا یوسف ۵۲ موسم بہار جلد سوم قلمی،

زراعت

اسلامی سلاطین میں سے احمد شاہ اول پہلا شخص ہے، جس کی ایک تدبیر سے گجرات میں زراعت کو بہت زیادہ ترقی ہوئی، اس نے فوج کے لوگوں کو قرض سے بچانے اور کاشت کو ترقی دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر سپاہی کو تنخواہ کا نصف تو نقد دیا جائے، اور نصف میں زمین عطا کی جائے، تاکہ وہ خود جان رہے، اپنی نقد تنخواہ سے اپنی ضروریات پوری کرے، اور اس کو قرض کی نوبت نہ آئے۔ اور دوسری طرف اس کے اہل و عیال اور متعلقین زمین پر کاشت کریں، اور اس سے ہر قسم کا غلہ، ترکاری وغیرہ پیدا کریں، دودھ اور گھی کا انتظام کریں، اور جنگل سے لکڑیاں لائیں، اور پھر اطمینان سے زندگی بسر کریں[۱]۔ اس طریقہ سے کوئی زمین کاشت سے خالی نہیں رہی، اس لئے کہ ہر فوجی سپاہی، اپنے متعلقین کی کفالت کے لئے کاشت کے لئے مجبور تھا،

یہ زمین موروثی ہوتی، یعنی اگر سپاہی مرجاتا، تو اس کا لڑکا اس کا وارث ہوجاتا، لیکن اگر کسی کے اولاد نرینہ نہ ہوتی تو حکومت پھر زمین واپس

---

[۱] مرأۃ سکندری، طبع دوم بمبی ص ۴۲،

سے پہلے سلطان محمود اعظم بیگڑا کے ابتدائی عہد تک یہی قانون جاری رہا لیکن اس میں پھر بعد میں اتنی ترمیم ہوگئی کہ اگر کسی متوفی کے لڑکا نہ ہو، تو اس کی لڑکی کی اولاد نرینہ کو زمین دیدی جاتی۔[1]

سلطان احمد شاہ اوّل کی یہ اسکیم اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ سلطان محمود اوّل کے پہونچتے پہونچتے پیداوار دوگنی ہوگئی، اور پچاس برس کے بعد اس میں دس گونہ اضافہ ہوگیا، اور پورے گجرات میں خوشحالی پھیل گئی،

محمود کے بعد اس کا لڑکا مظفر حلیم تخت نشین ہوا تو زراعت کو اور زیادہ ترقی ہوئی، کاشت یہاں تک بڑھ گئی کہ لوگوں کو اپنے مویشی اور جانوروں کے لئے گھاس اور چارے کا ملنا مشکل ہوگیا، سلطان مظفر حلیم نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ ہر ہر گانوں میں چراگاہیں بنوائیں۔ اس طرح سے گانوں کے مویشیوں اور جانوروں کے لئے بھی چارے اور گھاس کا مستقل انتظام ہوگیا،

کاشت کے لگان کا قاعدہ یہ تھا، کہ جو زمین برسات کے پانی سے سیراب ہوتی، تو اس کے کاشت کار سے صرف عشر یعنی دسواں حصہ لیا جاتا، بلکہ اس سے بھی کم، تاکہ وہ اپنی محنت اور مشقت کا ثمرہ زیادہ سے زیادہ خود حاصل کر سکے، یہ رعایت صرف فوجیوں تک خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان محدود تھی، جو زمین کولیوں اور گراسیہ راجپوتوں کے قبضہ میں ہوتی اس میں بٹائی کا طریقہ مروج تھا۔[2]

---

[1] مرآۃ سکندری طبع دوم ص ۱۰۲ [2] مرآۃ سکندری

گجرات کی پیداوار زیادہ تر باجرہ، مکئی، ارہر، اور موٹھ تھی، چاول مطلق پیدا نہ ہوتا تھا، بعد میں مختلف مقامات سے اس کے اچھے بیج منگوا کر اس کی کاشت کو ترقی دی گئی، اسی طرح گنّے کی کاشت کی طرف بھی توجہ کی گئی، اور اس کو عروج پر پہونچا دیا گیا،

باغات

سلاطینِ گجرات کو باغوں کا بڑا شوق تھا، اور اس کو ترقی دینے میں انھوں نے بہت کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا گجرات بہشت بریں اور جنتِ عدن بن گیا، ایک پرتگیزی سیاح لکھتا ہے کہ میں جب احمد آباد میں داخل ہوا، تو مجھکو وہاں قدم قدم پر باغات نظر آئے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی شہر میں نہیں باغات میں چل رہے ہیں،

سلطان احمد نے جب احمد آباد کی بنیاد رکھی تو محلاتِ شاہی کے ساتھ اس نے باغ بھی لگوائے، ایک باغ دربار کے قریب ہی تھا، اس میں سلطان محمود ثالث کے عہد میں وزیر اختیار خان دفن کیا گیا[1]، اور باغات محلاتِ شاہی کے عقب میں دریا کے رُخ پر تھے،

اس نیک بخت بادشاہ نے کھنبایت میں بھی ایک باغ تیار کرایا جو دریا کے کنارے تھا، جہانگیر جب گجرات آیا، اور سمندر دیکھنے کے لئے کھنبایت

---

[1] تاریخ شیرازی ص ۸۰ کلکتہ،

پہنچا تو اسی باغ میں قیام پذیر ہوا تھا[1] محمد شاہ بن احمد شاہ اوّل کے عہد میں ایک امیر ملک شعبان نے احمد آباد کے پاس (رکھیال) ایک بڑا باغ تیار کرایا، تھا جس کا نام باغ شعبان رکھا، اسی کے ساتھ تالاب، مسجد اور مقبرہ بھی بنوایا[2]، یہ اس عہد میں بڑا مشہور تھا، مگر اب بالکل ویران ہوگیا ہے، اس زمین کی سندِ ملکیت بھروچ کے ایک سردار صاحب کے پاس ہے،

سلطان قطب الدین نے اپنے عہد میں جس قدر باغ لگوائے، ان میں سے "نگینہ باڑی" جو احمد آباد میں تھا، اپنی ندرت، اور خوبصورتی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا، اسی کی نقل کشمیر کے بادشاہ نے کشمیر میں کی، اور وہاں کی مشہور جھیل ڈل کے اندر باغ لگوایا۔ بنیاد کے لئے گجراتی طرز کی کشتیاں استعمال کی گئیں، جن میں مٹی بھر کر تہ آب کی گئیں، یہ تخیل اصل میں سدھ راج کا تھا، جس نے دھولکا میں ایک تالاب بنوا کر، اس قسم کی تفریح گاہ کی ابتدا کی۔ یہ تالاب جس کے وسط میں نگینہ باڑی اور ایک محل تھا، آج بھی موجود ہے یہ مرہٹوں کے عہد میں ویران ہوگیا تھا، لیکن اب احمد آباد کی میونسپلٹی نے ۴۰ ہزار روپیہ خرچ کرکے اس کی مکمل مرمت کرائی ہے،

محمود بیگڑہ کا عہد، باغوں کے اعتبار سے بہار کا زمانہ تھا، اس بادشاہ کو باغوں اور درختوں سے عشق تھا، اس نے طرح طرح کے باغ

---

[1] مرأۃ احمدی جلد اوّل ص ۲۰۱ بمبئی و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۰۲ [2] ظفر الوالہ جلد اوّل ص ۱۶، لندن،

لگوائے، کوئی فقط میووں کا تھا، کوئی صرف پھولوں کا، کوئی محض پھولوں کا، کوئی محض پھلوں کا، اس نے آم، انار، کھرنی، گولر، ناریل، بیل، موہ، جامن کے بہ کثرت درخت لگوائے۔ محمد آباد (چانپانیر) میں اُس نے متعدد باغ لگوائے، جن میں آم بہت نفیس اور خوشبودار ہوتے تھے، انار، انجیر، انگور، بادام، سیب، کیلہ، امرت پھل، سدا پھل، نارنگی، تاڑ پھنی (تاڑ) ناریل، کٹھل، بدبل، کمرخ، فالسہ[۵۱]، اعلیٰ درجہ کا بکثرت پیدا ہوتا تھا، آملہ اور بڑ کا ایک باغ عہد عالمگیر تک باقی تھا،

محمود نے پھولوں کا جو چمن لگایا تھا اس میں گل لالہ، گل سیوتی، چنبیلی، چمپہ، بیلا، موگرا، جائی، جوہی، کرنی، مولسری، کیوڑہ، کیتکی، طرح طرح کے خوشبودار پھولوں کے درخت تھے، خربزے کی کاشت بڑے اہتمام سے کرائی، نادران کے خربزے آج تک مشہور ہیں، محمود کو درختوں سے ایسا عشق تھا کہ ایک مرتبہ کہیں جارہا تھا، راستہ میں ایک غریب آدمی کے مکان میں درخت دیکھ کر ٹھہر گیا، اس کو جب معلوم ہوا کہ اس غریب کو پانی کی سخت تکلیف ہے تو ایک کنواں کھودنے کا حکم دیدیا،

اسوقت تک معمولی طریقہ سے باغ لگائے جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک خراسانی نے ایرانی طریقہ کے مطابق باغ لگانے کی اجازت چاہی، اس کو اس کام کے لئے زمین دی گئی، باغ تیار ہوگیا، تو لوگوں نے بہت پسند کیا، اسی زمانہ میں ایک گجراتی باغ لگانے کے لئے سلطان محمود سے امداد کا خواہاں ہوا

---

[۵۱] تاریخ کشمیر قلمی کتب خانہ حبیب گنج، علی گڑھ،

اور دعویٰ کیا کہ وہ خراسانی ہی کی طرح باغ تیار کر دے گا، سلطان نے اس کو ساری سہولتیں بہم پہنچا دیں، اور اس نے خراسانی سے کہیں بہتر باغ تیار کر کے خود کھلا دیا، جس کو سلطان نے بیحد پسند کیا، اور انعام واکرام سے اس کو مالا مال کر دیا، سلطان کو گجراتی کے اس کارنامہ پر استعجاب تو تھا ہی خود خراسانی بھی حیرت میں آ گیا، سلطان نے گجراتی سے اس کی تفصیل پوچھی، تو اس نے عرض کیا کہ خراسانی نے جب باغ لگانا شروع کیا، تو نہ تو کسی کو باغ کے اندر جانے دیتا تھا، نہ کسی سمجھ دار آدمی کے سامنے اس کے متعلق بات کرتا تھا، میں نے مزدور کا بھیس بدل کر اندر جانے میں کامیابی حاصل کر لی، میں وہاں ہر چیز کو بغور دیکھتا تھا، اور اس کو ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا، اور گھر آ کر اس کا نقشہ زمین پر بناتا، اس طرح سے یہ پورا باغ تیار ہو گیا، تو غور کر کے کچھ اور چیزوں کا بھی میں نے اس میں اضافہ کیا، یہ قصہ سُن کر، بادشاہ بہت خوش ہوا، اور کافی انعام عطا فرمایا، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں گجراتی کس قدر ذہین اور سمجھ دار ہوتے تھے، سلطان نے اس کا نام "باغ بھالول" رکھا، گو باغ تو اب موجود نہیں ہے لیکن وہ زمین چانپانیر اور گودھرہ کے درمیان موجود ہے[۱]۔

اس کے بعد تو گجرات میں باغبانی کا مذاق عام ہو گیا، اور امراء نے بھی باغ لگانے شروع کر دیئے، سلطان محمود نے خاص احمد آباد میں بڑے اعلیٰ پیمانہ کا پانچ میل لمبا اور ایک میل چوڑا باغ لگوایا، اس کا نام باغ فردوس تھا

[۱] مرآۃ سکندری ص ۱۰۹ طبع دوم بمبئی،

مرأۃ احمدی میں ہے کہ لوگوں کا بیان ہے کہ اس میں ۹ لاکھ درخت تھے، اسی لئے اس باغ کا دوسرا نام نو لکھی باغ تھا؛ اس میں آم، کھرنی، اور آملہ کے درخت زیادہ تھے۔

بعض تاریخوں میں ہے کہ پٹن سے بڑودہ تک آم اور کھرنی کے کئی لاکھ درخت لب سڑک سے تھے، اسی لئے کھرنی تمام ہندوستان سے زیادہ اور اچھی گجرات میں ہوتی ہے، محمد قاسم فرشتہ نے بھی اپنی کتاب طب فرشتہ میں اس کو لکھا ہے۔

درختوں کی کثرت کی وجہ سے احمد آباد کا موسم بہت خوشگوار اور سرد ہوگیا تھا، چنانچہ سلطان محمود گرمیوں کا موسم، احمد آباد، در جو... ... میں گزارتا، اور برسات چانپانیر میں۔

علیم الدین خداوند خاں پہلا شخص ہے جس نے انجیر اور نیزہ کی درخت دکھن سے منگوا کر گجرات میں لگوایا، جو تمام ملک میں رواج پاگیا، احمد آباد کے ایک محلہ عیسن پور میں جو باغات لگائے گئے تھے، اُن میں آم، کھرنی اور آملہ کے درخت بہت اچھے تھے، اس باغ کے گل مونگرہ کی بڑی شہرت تھی، ایا کوہ سے عیسن پور، اور عیسن پور سے رسول آباد تک سڑک کے دونوں جانب اس قدر گھنے آم اور کھرنی کے درخت لگے تھے کہ اس کے سایہ میں مسافر کو جنت کا مزہ آتا تھا۔

لاھ خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۲۰۰ کلکتہ۔ ۲۵ فرشتہ قلمی کتب خانۂ گجرات ورنا کیولر سوسائٹی احمد آباد۔

سلطان قطب الدین نے کانکریہ تالاب کے بیچ میں ایک مختصر سا باغ لگایا تھا جس کا نام نگینہ باڑی تھا، بڑی فرحت بخش جگہ تھی[۵۱]، اس تالاب کے جانب جنوب وہ ایک اور باغ لگوا رہا تھا لیکن اسی درمیان میں اس کا انتقال ہوگیا، اور باغ نامکمل رہ گیا، اس کا نام موگرہ باغ تھا،

محمود ثالث کے عہد میں محمود آباد میں جو آہو خانہ بنا تھا، اُس کے ساتھ ایک بہت بڑا باغ بھی تھا، اس میں یہ اہتمام تھا کہ اس کے درختوں کی شاخوں میں رنگین کپڑے لپیٹے جاتے، اور موسم خزاں میں مصنوعی پھول لگائے جاتے[۵۲]

سلاطین کے باغبانی کے اس ذوق وشوق کو دیکھ کر دولت مندوں کو بھی اس کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے بھی بکثرت باغ لگوائے، جو سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور تک باقی رہے، چنانچہ ہرسی کا باغ، رستم باغ، گلاب باغ، توت باغ، باغ غسل خانہ واقع بھدر، باغ شاہی، کاریز باغ، باغ حویلی (شاہجہاں) شاہ باڑی، باغ چانپانیر، جیت باڑی، فتح باغ، باغِ ارم اسی شوق عام کے نتائج ہیں[۵۳]،

کوکب فلک جو سلطان مظفر چہارم اور اکبر بادشاہ کے عہد کی تصنیف ہے، اس میں لکھا ہے کہ کیرونج میں آم کے پانچ لاکھ درخت تھے[۵۴]

یہ شوق امیروں اور دولت مندوں سے گذر کر غریبوں میں بھی پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ ایک غریب بڑھیا نے بھی باغ لگایا، جس میں پانی کی بڑی کمی تھی،

---

۵۱ خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۱۹ کلکتہ ۵۲ فرشتہ ج ۲ ص ۲۹۰ و طبقاتِ اکبری ص ۱۴۵ کلکتہ

۵۳ کوکب فلک قلمی،

اس کو پورا کرنے کے لئے بادشاہ کے حکم سے اس میں ایک کنواں کھدوا یا گیا،

ان باغوں میں فوارے لگائے جاتے، اور مصنوعی آبشاریں بنائی جاتیں

بڑے بڑے تالاب کھودے جاتے، کیاریاں اور روشیں بنائی جاتیں، موقع

موقع سے خوبصورت اور دلکش دومنزلہ عمارتیں تعمیر کیجاتیں، جن میں بیٹھ کر موسم

برسات کا لطف اٹھایا جاتا،[1]

فتح باڑی | ۹۹۱ھ میں خانخاناں عبدالرحیم نے گجرات فتح کیا، اور جب مقام

پر مظفر تھو کو شکست دی، اسی جگہ اس نے بطور یادگار ایک گاؤں فتح پور

بسایا، اور اسی کے ساتھ فتح باڑی کے نام سے ایک باغ لگوایا، جہانگیر ۱۰۲۹ھ

میں گجرات آیا اور کھنبایت میں سمندر کی سیر کرنے کے بعد احمد آباد آیا، تو اس

وقت خانخاناں کی لڑکی خیرالنساء موجود تھی، اس نے اسی باغ میں جہانگیر

کی دعوت کی، اس وقت خزاں کا موسم تھا، تمام درخت بے برگ و ثمر تھے

خیرالنساء نے بڑی دانشمندی سے باغ کو سجایا، نہروں کے ذریعہ پانی کا

انتظام کیا، بہترین کاریگر جمع کئے، اور ان کو حکم دیا کہ جو درخت جس رنگ

کا ہو، اور اس کے پتے اور پھول وغیرہ جس صورت اور شکل کے ہوں،

ویسے ہی کاغذ کا بنا کر لگا دو، اور پھل موم کے بنا کر اس طرح لگاؤ کہ دور

سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اس میں قدرتی پھل لگا ہوا ہے۔ چنانچہ نارنج، لیموں،

سیب، انار، شفتالو وغیرہ کے پھل بڑی خوبی سے کاریگروں نے تیار کئے

اسی طرح ہر رنگ اور ہر روپ کے پھول اور پتے بنائے، اس کاریگری آ

---

[1] یادِ ایام ص ۱۹ لکھنؤ،

فنکاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی باغ دیکھتا، وہ بھول جاتا، کہ یہ موسم خزاں ہے جہانگیر جب اس باغ میں آیا تو دیکھ کر اس پر حیرت طاری ہوگئی، کہ خزاں میں بہار کا یہ عالم، اس نے فرط مسرت میں کچھ پھول اور پھل توڑنے کے لئے درختوں کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو اس کو بتایا گیا، کہ یہ تمام تر مصنوعی ہیں، اس سے وہ اور زیادہ خوش ہوا، اور بیگم کی حسن تمیز اور مذاق سلیم کی بڑی تعریف کی، اور کاریگروں کو انعام واکرام اور جاگیر میں اضافہ کردیا۔[۱]

اسی طرح مرآۃ سکندری کے مصنف محمد سکندر بن میاں محمد اکبر منجھو کے گھر جب جہانگیر ۱۰۲۶ھ میں گیا تو اُن کے باغ میں بھی مصنوعی پھولوں سے لدے ہوئے انجیر کے درخت دیکھے، تو ان کی تازگی دیکھ کر بے اختیار پھل توڑنے چاہے۔[۲] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجرات میں کیسے باکمال کاریگر موجود تھے کہ کاغذ، اور موم کے پھل پھول اور پتے اس طرح بناتے کہ ان پر اصل کا دھوکا ہوتا تھا،

باغبانی کا مذاق اتنا عام ہوگیا تھا کہ جس شخص کے گھر میں بھی فاضل زمین ہوتی، اس پر وہ ضرور باغ لگاتا،

۱؎ مرآۃ احمدی جلد اص ۱۹۷ کلکتہ ۲؎ تزک جہانگیری ص ۲۱۳، نولکشور، لکھنؤ

گجرات کے جانور

جو ملک جس قدر شاداب اور سرسبز ہوگا، اسی قدر وہاں جانور ہوں گے، گجرات کا بھی یہی حال تھا، وہاں ہر قسم کے جانور پائے جاتے تھے، ان میں بعض ایسے بھی تھے، جو اور کہیں نہیں ہوتے تھے ہم ذیل میں دوسری قسم کے جانوروں کا ذکر کریں گے،

۱۔ قدآور بیل : متوسط قد وقامت کے بیل تو ہر جگہ ہوتے ہیں، لیکن قدآور بیل یہیں پائے جاتے ہیں، جن کا بلند و بالا قد، بڑی بڑی سینگیں اور فربہ جسم دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، یہ ضلع کھیڑا اور کاٹھیاواڑ میں بکثرت ہوتے ہیں، ان کو کاشتکاری، اور لدو گاڑیوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور شکار کے لئے بھی سدھائے جاتے ہیں، ان کے جسم کا آڑ بنا کر ان کی دو سینگوں کے درمیان سے بندوق چلا کر شکار کرتے ہیں، یہ بیل چرتے چرتے ہرنوں کے گلہ کے قریب چلے جاتے ہیں، اور شکاری ان کے پیچھے پیچھے رہتے ہیں، اسی طرح قریب پہونچ کر ہرنوں کا شکار کرتے ہیں

گائیں بھی بڑی قد آور اور لحیم شحیم ہوتی ہیں، اور صبح و شام دس دس سیر دودھ دیتی ہیں،

۲۔ بھینس: یہ جانور بھی گجرات کے ایک مقام میسانہ میں ہوتا ہے، اور بہت فربہ اور لمبا چوڑا ہوتا ہے بھینسیں صبح و شام بیس بیس سیر دودھ دیتی ہیں، ہندوستان کی بھینسوں کے مقابلہ میں اُن کی خوراک بہت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے دودھ بھی زیادہ دیتی ہیں، گیر (سورٹھ کے جنگل) کی بھی بھینسیں بڑی قد آور اور فربہ ہوتی ہیں،

۳۔ کوتاہ قد بیل: یہ ٹھنگنے بیل بچھڑے کے برابر ہوتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی ہلکی گاڑیوں میں جن کو کیہ کہا جاتا ہے، جوتے جاتے ہیں، یہ گاڑیاں اس قدر تنگ اور چھوٹی ہوتی ہیں کہ اُن پر ایک ہی آدمی آرام سے بیٹھ سکتا ہے، گو کبھی کبھی دو دو اور تین تین بھی بیٹھ جاتے ہیں، ان بیلوں کو بڑی اچھی غذا دیتے ہیں، اور گاڑیوں میں جوت کر گھوڑوں کا مقابلہ کرتے ہیں،

۴۔ ہاتھی: راج پپلیہ میں ہاتھیوں کا جھنڈ کا جھنڈ رہتا تھا، اور اُن کو پکڑ کر پایۂ تخت دہلی بھیجا جاتا تھا، شاہجہاں کے زمانہ میں بھی یہاں سے ہاتھی پکڑ کر دہلی بھیجے گئے تھے، اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں ایک زمیندار نے دڈہ کو برباد کر دیا، جس سے ہاتھی یہاں سے چلے گئے،

۵۔ گھوڑا: کچھ اور کاٹھیاواڑ کے گھوڑے بہت طاقتور اور دراز قد کے ہوتے ہیں، گاڑیوں میں جوتے بھی جاتے ہیں، اور لڑائیوں

میں بھی کام آتے ہیں، یہ عربی نسل کے ہوتے ہیں، گھوڑوں کے تاجر عرب سے گھوڑے لاتے، اور جنوبی ہندوستان میں لیجا کر بیچتے، اور کچھ اُدھر کاٹھیاواڑ کے بندروں پر کچھ دنوں قیام کرتے، اس ذریعہ سے وہاں کے باشندوں نے تازی گھوڑوں کی نسل لے لی، جس کی وہ آج تک حفاظت کرتے ہیں[1]،

۶۔ کچھ کے گدہے اچھے ہوتے ہیں، اُن کے گلّے کے گلّے گھومتے رہتے ہیں، وہ مضبوط اور اچھے قد کے ہوتے ہیں،

۷۔ نوساری اور سورت میں ہرن بکثرت ہوتے ہیں، گو لوگوں نے بندوق سے اُن کا شکار کرتے کرتے اُن کی تعداد کم کردی،

۸۔ شیر ببر: تمام ہندوستان میں یہ جانور کہیں نہیں ہے، صرف جوناگڑھ کے جنگل گیر میں پایا جاتا ہے، عام طور پر اس کا شکار کرنے نہیں دیا جاتا تاکہ اس کی نسل قائم رہے،

۹۔ شکرہ، باز، جرہ وغیرہ شکاری پرندے جوناگڑھ کے بہت قوی، چست اور ہوشیار ہوتے ہیں، گجراتی سلاطین اپنا شوق یہیں سے پورا کرتے تھے[2]،

---

[1] خلاصۃ التواریخ قلمی۔ [2] مرآۃ سکندری ص ۲۰۴، بمبئی طبع دوم،

گجرات کی آمدنی

صوبۂ گجرات کے عہد بعہد کی آمدنی کا حال تو کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرا لیکن ایلیٹ صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ ۲۰ لاکھ تنکہ سالانہ تھی[1] مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں دس کروڑ لکھی ہے لیکن دونوں مصنفوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا اسلئے وثوق سے کہا نہیں جاسکتا کہ یہ صحیح بھی ہے البتہ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں اس کی آمدنی دو کروڑ تنکہ ضرور تھی جیسا کہ عفیف سراج نے لکھا بھی ہے[2] راقم الحروف نے سلطان محمود اول کے زمانہ کے تنکہ کو وزن کیا تو ایک تولہ سے زیادہ نہیں تھا، اس حساب سے گجرات کی صحیح آمدنی دو ہی کروڑ ہوسکتی ہے، سلاطین گجرات کے عروج کا زمانہ بہادر شاہ کے حملۂ مغل سے قبل کا زمانہ ہے، مرآۃ احمدی میں ہے کہ گجرات کے ۲۵ ضلعوں کی آمدنی تقریباً چھ کروڑ، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، برہان پور کا

---

[1] ایلیٹ جلد ۳ ص ۳۴۵ تا ۳۰؛ [2] فیروز شاہی عفیف ص ۲۲۱ کلکتہ،

خراج ایک کروڑ ۲۵ لاکھ اور بندرگاہوں کی آمدنی پانچ کروڑ، غرض کل آمدنی بارہ کروڑ سالانہ تھی[۱]، جب اکبر بادشاہ نے گجرات فتح کیا تو اس کی آمدنی (۱۶۲۷ء) ۴۳ کروڑ ۲۷ لاکھ دام تھی[۲]، شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت پچاس کروڑ ۴۲ لاکھ ۵۰ دام تھی، اس کے بعد ۱۰۵۰ھ میں ۵۳ کروڑ دام ہوگئی، پھر ترقی کرکے ۵۳ کروڑ ۶۵ لاکھ دام ہوگئی[۳]، اس کے بعد برادرانہ جنگ شروع ہوگئی، اس سے فارغ ہونے کے بعد عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کی آمدنی ۴۴ کروڑ ایک لاکھ دام ہوگئی، ۱۰۶۹ھ کے بعد اس کی آمدنی پچاس کروڑ ستر لاکھ تک پہونچ گئی، محمد شاہ کے عہد ۱۱۶۱ھ میں ۴۴ کروڑ ۳۴ ہزار ۹۶ دام تھی، اس کے بعد صوبہ دار خود مختار ہوگئے، اور ان دیوانی کا ذخیرہ مرہٹوں کے ابتدائی عہد میں برباد ہوگیا، اس عہد میں سکوں کا حال یہ تھا ۲۵ جیتل کا ایک دام، چالیس دام کا ایک روپیہ، پس ایک لاکھ دام کا گیارہ ہزار ایک سو روپیہ ہوا[۴]، لیکن کتاب معاشی ہند میں ہے کہ ایک لاکھ دام، ڈھائی ہزار روپیے کے برابر ہے[۵]، ایک روپیہ اکبری کے ۴۰ دام ہوتے، جو گجرات کے ۲۰ پیسوں کے برابر تھا، اور ایک محمودی (گجراتی روپیہ) کے ۲۰، ۲۲، ۲۴ پیسے ہوتے تھے،

---

[۱] ضمیمہ مرآۃ احمدی مطبوعہ کلکتہ، [۲] آئین اکبری ج ۱ ص ۲۱۲ [۳] عمل صالح ج ۳ ص ۴۹۶ کلکتہ [۴] آئین اکبری ج ۱ ص ۲۱۲ [۵] معاشی ہند ص ۵۲۵ حیدرآباد

رفاہِ عام کے کام

رفاہِ عام کے کاموں میں بھی گجراتی سلاطین کا بڑا حصہ ہے، سڑکیں، پل، لنگر خانے، شفا خانے، مسافر خانے، تالاب، یتیم خانے اس کثرت سے بنوائے کہ اُن کا شمار کرنا مشکل ہے، ان میں سے مشہور چیزوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے،

(۱) سڑکیں: سلطان احمد نے جب احمد آباد بسایا تو ہر جگہ وسیع سڑکیں بنوائیں، فرشتہ نے لکھا ہے کہ احمد آباد کی سڑکیں اس قدر کشادہ اور چوڑی تھیں کہ دس دس گاڑیاں آسانی کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں،[1] محمود اوّل کے وقت میں ایک بڑی سڑک پٹن سے بڑودہ تک تیار کی گئی تھی، جس کے دونوں کنارے سایہ دار درخت بھی لگائے گئے تھے، اسی طرح محمود ثالث کے عہد میں احمد آباد سے محمود آباد تک ایک سڑک تیار کی گئی تھی جس کے دونوں جانب دوکانیں تھیں،[2]

---

[1] فرشتہ جلد چہارم ص ۱۵۳ - حیدرآباد، [2] ہفت اقلیم امین رازی کلکتہ ص ۸۷

مخصوص احمد آباد میں جو سڑکیں تھیں اُن پر چورس پتھر بچھائے گئے تھے،
جس سے نہ گرد اُڑتی تھی، اور نہ کیچڑ ہوتا تھا، اور نہ موسمِ گرما میں بہت زیادہ
تپتیں کہ جس سے پیدل راستہ چلنے والوں کو تکلیف ہوتی، جیسا کہ آج کل
ڈامر کی سڑکیں گرمیوں میں تپ جاتی ہیں، کہ اُن پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے،
تین دروازے کی سڑک ۱۶ - ۱۷ ہاتھ کے درمیان تھی،[۱]

(۲) پل بھی بکثرت بنائے گئے، ان میں سے دو بہت مشہور ہیں، ایک
تو پایۂ تخت احمد آباد میں جو سابرمتی ندی پر بنایا گیا تھا، اور دوسرا سلطان
محمود اوّل کے عہد میں ملک ایاز نے جزیرہ دیو پر تیار کرایا تھا، قسطنطنیہ کے
درۂ دانیال کی طرح، جزیرۂ دیو کے پاس اس نے زنجیروں کے ذریعہ جہازوں
کی آمد و رفت بند کر دی تھی تاکہ کوئی جہاز بغیر اجازت کے نہ آسکے،

حمام | جس طرح دوسرے اسلامی ممالک میں حمام کا رواج تھا، اسی طرح
احمد آباد اور گجرات کے دوسرے شہروں میں بھی حمام بنائے گئے، چنانچہ ایک
دستاویز جس پر ۱۵۹۹ء تحریر تھا، نظر سے گذری، اس سے معلوم ہوا کہ محلہ
صدر جہاں (موجودہ پیر محمد شاہ روڈ) گھی کانٹے کے نزدیک موجودہ سول
ہاسپٹل کے بازو کی پشت پر ایک جگہ تھی، جس کا نام "حمام پول" تھا، یہاں دو
حمام تھے، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا، اسی لئے یہ جگہ حمام پول کے نام
سے مشہور ہوئی، اس میں ٹانکہ اور نہریں بھی تھیں۔ آج کل اس جگہ
مسند رہے،

---

[۱] تذکرۃ الملوک قلمی،

سیف خاں کا حمام | سیف خاں احمد آباد کا مشہور گورنر تھا، اوس نے قلعۂ احمد آباد کے دروازے کے سامنے یہ حمام ۱۰۳۲ھ میں بنوایا تھا، جو اسی کے نام سے مشہور ہوگیا تھا، یہ بعد میں بہت مرمت طلب ہوگیا تھا، جن کی دیوانِ صوبہ نے ۱۰۸۰ھ میں شاہی حکم کے بموجب شاہی خزانہ سے عالمگیر کے عہد میں مرمت کرائی[1]

غرض صوبہ گجرات کے تمام بڑے بڑے شہروں میں حمام بنے ہوئے تھے، لیکن افسوس ہے کہ کتابوں میں اُن کے نام اور مقامات بہت کم ملتے ہیں،

لنگر خانے | غریبوں اور مسافروں کے لئے متعدد لنگر خانے جاری تھے، جن میں سے ایک احمد آباد میں سلطان احمد کے مقبرہ پر آج تک جاری ہے، ایک سلطان محمود کے عہد میں قحط کے زمانہ میں سلطانی حکم سے جاری کیا گیا تھا، جب تک قحط دور نہیں ہوگیا جاری رہا[2]

اسی طرح بہادر شاہ کے عہد میں ایک مرتبہ پانی نہیں برسا تو اس نے بڑے بڑے لنگر خانے غریبوں کے لئے جاری کئے، اُن کے علاوہ تمام مدرسوں اور خانقاہوں میں بھی لنگر خانے قائم تھے[3] کہ جو لوگ باہر سے آئیں اُن کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو، سرکاری لنگر خانوں کے علاوہ امرا اور ساہوکاروں نے بھی متعدد برت جاری کئے تھے، جن سے غریب

---

[1] مرأۃ احمدی جلد اوّل ص ۲۹۲ کلکتہ [2] ظفر الوالہ جلد اوّل ص ۲۹۔

[3] خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۰۰، کلکتہ،

مجاوروں اور مسافروں کو مفت کھانا ملتا تھا،

یتیم خانے مستقل طور پر یتیم خانہ تو نہیں تھا، لیکن جن مدرسوں سے متعلق دارالاقامے ہوتے، ان میں یتیم اور غیر یتیم طلبہ دونوں رہتے، اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہت معقول انتظام کیا جاتا، چنانچہ محلہ استوریہ میں مولانا نورالدین کے مدرسہ کے ساتھ جو بورڈنگ تھا، اس کے آثار اب تک موجود ہیں، اسی طرح شیخ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں جو بورڈنگ تھا، وہ آج بھی دوسری شکل میں موجود ہے۔

شفا خانے شفا خانے اس عہد میں بہت تھے۔ جن کا شمار بہت مشکل ہے، سرکاری شفا خانوں کے علاوہ حکیموں اور ویدوں نے بھی اپنے پرائیویٹ مطب عوام کے لئے کھول رکھے تھے۔ سلطان محمود نے داگھبٹ کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا، تاکہ ہندی طریقۂ علاج سے بھی فائدہ اٹھایا جائے مدرسوں کے ساتھ جو بورڈنگ تھے، ان میں بھی حکیم اور وید مقرر تھے، چنانچہ مظفر آخر کے عہد سے مغلیہ زمانہ تک حضرت شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ کے لئے ایک حکیم اور ایک وید باقاعدہ سرکاری طور پر مقرر ہوتے تھے[1]، سیف خان کا شفا خانہ احمد آباد میں بہت مشہور[2] تھا، ۱۰۸۸ء میں اس کی مرمت عالمگیر نے کرائی تھی، ۱۱۱۵ئہ میں احمد آباد میں جو جنرل ہسپتال تھا، اس کے اعلیٰ افسر حکیم محمد تقی شیرازی تھے۔ ان کے بعد ۱۱۱۶ھ میں حکیم رضی الدین مقرر ہوئے،

---

[1] تاریخ دہلی قلمی نسخہ [2] مراۃ احمدی ص ۱۹۹۔

مسافرخانے | مسافرخانوں کا رواج تو مظفر اوّل ہی کے عہد سے تھا، لیکن زیادہ تر یہ کام مسجدوں اور مندروں سے لیا جاتا، جہاں مسافروں کے لئے کچھ کمرے تعمیر کر دیئے جاتے،

سلطان احمد اوّل نے جب احمد آباد بسایا تو اُس نے مسافرخانہ الگ تعمیر کرایا، چنانچہ حلوی شیرازی نے اپنی منظوم تاریخ گجرات میں اس کا ذکر کیا ہے، سلطان محمود اوّل کے عہد میں سرکاری طور پر دو بڑے عالی شان مسافرخانے تعمیر ہوئے، جن میں عام طور سے لوگ قیام کرتے تھے،

اسی زمانہ میں عالم خان فاروقی نے بھی ایک مسافرخانہ بنوایا تھا، جس کے ساتھ ایک نامکمل روضہ بھی تھا، سلطان محمود نے اس کو مکمل کرکے ایک ایک گاؤں (ویرل پور) متصل جوناگڑھ اس پر وقف کیا، اس مسافرخانہ میں چار میوہ فروشوں کی اور اٹھارہ دوسری چیزوں کی دوکانیں تھیں، اور تین بنگلے تھے، اور انہی کی آمدنی سے غالباً وہ چلتا رہا ہوگا، یہ سنہ ۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۰ء تک آباد رہا، اور مرہٹوں کے عہد میں برباد ہوگیا[1]،

دوحد میں بھی سلطان احمد نے ایک سرائے بنوائی تھی، ایک سرائے مسجد کے ساتھ عالمگیر نے سنہ [illegible] میں چھتر ہزار تین سو خرچ کرکے تیار کرائی[2]، احمد آباد میں ایک سرائے کھڑکی خانہ کے پاس تھی، ایک مسافرخانہ احمد آباد میں بہت مشہور تھا، جس کا نام سرائے کھڑکر تھا، اس میں دو ہزار لوگ ٹھہرتے تھے سنہ ۱۱۲۶ھ میں حاجی علی اکبر جن کی ۵۰ برس کی عمر تھی،

---

[1] تاریخ عزیزی قلمی ص ۲۱۵، [2] مرآۃ احمدی جلد اوّل ص ۲۹۱، کلکتہ

بغرضِ تجارت احمد آباد آئے، تو اسی مسافرخانہ میں قیام پذیر ہوئے تھے[۱]
شہر پناہ سے باہر رائے پور اور سارنگ پور کے درمیان "سرائے افضل خاں"
بہت بڑی اور پتھر کی تھی، جس کو افضل خاں بنیانی نے تعمیر کرایا تھا ۹۵۱ھ
میں دستور خاں آصف نے استوریہ میں ایک سرائے تعمیر کرائی تھی جس
کا کتبہ بمبئی میوزیم میں محفوظ ہے[۲] نہروالہ میں سالوی واڑہ متصل بھائی دروازہ
میں ایک سرائے ۱۲۲۴ھ تک موجود تھی، قلعہ ارک احمد آباد کے متصل دروازہ
نقارخانہ میں صوبہ دار گجرات (شاہجہانی) اعظم خاں نے ایک سرائے بنوائی
تھی، جو "سرائے اعظم خاں" کے نام سے مشہور تھی، یہ آج بھی موجود ہے، اور
عدالتی کاموں کے لئے مشہور تھی ہو رہی ہے[۳]،

اسی طرح اعتماد خاں کی سرائے، سکندر کی سرائے[۴] وغیرہ نام کی
بکثرت سرائیں تھیں،

اسارو ہ میں ایک بائی حریر کی سرائے تھی، جس میں ایک باولی
بھی تھی،

باولی | یہاں باولیاں بھی متعدد بنائی گئیں، مسلمانوں سے پہلے جوناگڑھ
قلعہ میں وہاں کے راجاؤں نے دو باؤلیاں بنوائی تھیں جن تو وہ بہت بڑی
اور وسیع لیکن اُن میں درجے نہیں تھے، یعنی اُن کے چاروں طرف درجہ

---

[۱] مرآۃ احمدی جلد اول ص ۴۰۸ کلکتہ [۲] کتبہ بمبئی میوزیم میں احمد آباد کے
کتبات ۱۴۷ء [۳] مرآۃ احمدی ص ۲۱۲ -
[۴] خاتمہ مرآۃ احمدی اردو ص ۱۸ تا ۲۰،

بدرجہ مسافروں کے آرام کے لئے حجرے نہیں تھے، اساروہ میں جو احمد آباد سے متصل ہے ایک باولی ماتا بھوانی کی ہے، اور دوسری اسی اساروہ میں دائی (دایہ) حرم سلطانی کی ہے، یہ سلطان محمود اعظم کے عہد حکمرانی میں قہرمانہ کے عہدہ پر ممتاز تھی، جس کو محلات حرم شاہی کی منتظمہ کہہ سکتے ہیں، اسی عہد کی ایک باولی اڈالج احمد آباد کے متصل ہے، جو "اڈالج باولی" کے نام سے مشہور ہے،

تالاب | تالاب بنانے کا رواج گجرات میں قدیم زمانہ سے ہے، چنانچہ متعدد تالاب پٹن اور دھولکا وغیرہ میں آج تک موجود ہیں، جو اسلامی عہد سے پہلے راجاؤں نے بنوائے تھے، مسلمانوں میں خان سرور پہلا شخص ہے، جس نے پٹن میں تالاب بنوایا[1]، محمد شاہ ثانی کے زمانے میں متعدد تالاب بنے، ان میں سے ایک جانپانیر میں ہے، جو محمد شاہ ثانی نے خود بنوایا تھا، حالانکہ جانپانیر اس وقت تک فتح نہیں ہوا تھا، محاصرہ میں تھا، اسی زمانہ میں دوسرا تالاب شیخ احمد کھٹو جینے سرکھیج میں تیار کرایا، جس کے مصارف کا کل بار انہی نے خود اٹھایا[2]، بادشاہ وقت کی شرکت قبول نہ کی، سلطان قطب الدین احمد نے خان جہاں احمد آباد میں مشہور کانکریہ تالاب بنوایا، جس کا نام حوض قطبی رکھا، جو آج تک موجود ہے، جس کا مفصل ذکر آگے آرہا ہے، اسی کے بعد سلطان زین العابدین نے کشمیر میں (وڈلی) میں جو تالاب بنوایا، وہ اسی

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۳۰ (اردو ۔ لاہور) [2] مرآۃ سکندری (بمبئی)

کی نقل ہے، جیسا کہ راقم الحروف نے اپنی تاریخِ گجرات جلد دوم میں ثابت کیا ہے،

یہ شوق بادشاہوں اور سلاطین سے گذر کر، وزراء و امراء کو بھی ہو گیا تھا، چنانچہ سلطان قطب الدین کے وزیر ملک شعبان نے جب باغ لگوایا تو اس میں ایک تالاب بھی بنوایا۔ جو احمد آباد سے تھوڑے فاصلہ پر موضع رکھیال میں تھا، اس کے مقبرہ پر جو کتبہ ہے، اس میں بھی اس کا ذکر ہے، اسی زمانہ میں ایک تالاب نڑیاد میں تھا جس کا نام برنامہ تھا، اس میں برہمن اور عام ہندو غسل کرتے تھے[۱] سلطان محمود اول کو بھی اس سے دلچسپی تھی، اس نے محمود آباد میں ایک بڑا تالاب بنوایا تھا، الپ خان بھوکانی جو سلطان محمود اول کے درباری امراء میں سے تھا، اس نے دھولکا میں ایک تالاب تیار کرایا تھا، سلطان مظفر کے عہد کے ایک ہندو امیر گوپی چند نے سورت میں ایک تالاب تعمیر کرایا، آج کل وہ پٹ کر ایک محلہ کی صورت میں آگیا ہے، غرض اس طرح کے تالاب تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ میں بکثرت بنے، جن کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں،

محمود ثالث رفاہِ عام کے خیال سے سردیوں میں غریبوں کو قبائیں تقسیم کرتا تھا، اس نے محتاج خانے بھی قائم کئے تھے، جہاں فقراء اور مساکین رہتے تھے، اس نے اُن کی خبر گیری اور دیکھ بھال کے لئے ۹ ملازم رکھے تھے، وہ جاڑوں میں ہزاروں کمبل اور گرم کپڑے بھی غریبوں کو بانٹتا تھا، اس نے حکم دیا تھا کہ ہر چوراہے پر لکڑی کے بڑے بڑے کندے جلائے جائیں تاکہ غرباء تاپیں اور گرمی حاصل کریں[۲]

---

[۱] مراۃ سکندری بمبئی [۲] ایضاً ص ۲۹۰ بمبئی

کانکریہ تالاب

(حوض قطب)

اس کا اصلی نام حوض قطب ہے، مگر عوام اس کو کانکریہ تالاب کہتے ہیں، یہ شہر سے ۴½ میل پر واقع ہے، طول ۵۰۰ گز اور عرض قاعدہ کے مطابق مدور، جس کا پانچواں حصہ نکال کر چار لاکھ پچاس ہزار گز ہوتا ہے ۴۵۰۰۰۰ فی بیگہ تین ہزار چھ سو گز جس کا مجموعی رقبہ ایک سو پچیس بیگہ ہوتا ہے، پتھر اور گچ سے اس کے چاروں طرف زینے بنائے گئے ہیں[1]، وسط میں ایک مکان ہے اور اسی کے ساتھ ایک باغیچہ ہے، بڑی فرحت بخش جگہ ہے، خشکی سے ملانے کے لئے ایک پل بنایا گیا ہے۔ جس میں ۴۴ طاق ہیں؛ سلطان قطب الدین نے ۸۵۵ھ میں اس کو تیار کرایا تھا،

سلطان کا ارادہ تھا کہ اس کے اردگرد باغ لگائے جائیں، و

---

[1] مرآۃ احمدی کا خاتمہ کلکتہ ص ۱۹۔

عمارتیں تعمیر کی جائیں، لیکن ارادہ کی تکمیل سے پہلے ہی وفات پا گیا۔ اس کے جنوب میں ایک باغ کی بنیاد پڑ چکی تھی، اور اس میں حوض، آبشار، اور کچھ عمارتیں بھی بننی شروع ہو گئی تھیں، جو اس کی وفات سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکیں، مراۃ احمدی کے مصنف کے عہد (۱۱۶۱ھ) میں اس کے کچھ آثار باقی تھے، یہ باغ مو گرہ کے نام سے مشہور تھا،[1]

وجہ تسمیہ | جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس تالاب کا اصل نام تو "حوض قطب" ہے لیکن عوام میں کانکریہ تالاب کے نام سے مشہور ہے، مراۃ سکندری میں اس کا ذکر چند لفظوں میں تو ہے لیکن اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، وہ لکھتا ہے، کہ سلطان قطب الدین جب شاہ مالوہ سلطان محمود خلجی کو شکست دیکر احمد آباد واپس آیا تو مختلف عمارتوں کی تعمیر و بنا میں مصروف ہو گیا، مثلاً حوض کانکریہ جو کہ بے مثل ہے، باغ نگینہ جو کہ وسط احمد آباد میں واقع ہے، محمد پور کے محلات جو بہشت کے باغوں اور محلوں کی یاد دلاتے تھے، مراۃ سکندری کے مصنف نے بچشم خود ان سب کو دیکھا تھا لیکن ۹۶۱ھ میں یہ سب ختم ہو گئے، صرف کانکریہ تالاب اور نگینہ باڑی باقی رہ گئے،[2] گو اس بیان سے اس کی وجہ تسمیہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، تاہم مراۃ احمدی میں مندرجۂ ذیل توجیہات ملتی ہیں،

(۱) سلطان قطب الدین چاہتا تھا کہ اپنے سوتیلے بھائی محمود بیگڑا کو جو شاہ عالم دہلی کی پناہ میں تھا، قتل کر ڈالے، اس لئے اس نے یہ تالاب بنوایا

---

[1] مراۃ احمدی خاتمہ ص ۱۹ [2] مراۃ سکندری ص ۱۰ (بمبئی طبع دوم)

کہ شاید وہ اس کو دیکھنے کے لئے آجائے، تو اس کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے
مگر وہ ناکامیاب رہا، ایک مرتبہ خود حضرت شاہ عالم اس تالاب کو دیکھنے
آئے تو ایک کنکر اُن کے پیر میں چبھ گیا، فرمایا کہ یہ کیا کنکر ہے، اس طرح یہ
لوگوں میں کنکر تالاب مشہور ہو گیا،

(۲) ایک روایت یہ ہے کہ خود سلطان قطب الدین نے حضرت شاہ عالم
سے مشورہ کیا کہ تالاب کہاں بنایا جائے، تو انھوں نے ایک کنکر اٹھا کر
پھینکا اور فرمایا کہ جہاں یہ گرے وہیں تالاب بناؤ، اس نسبت سے وہ کانکریہ
کے نام سے مشہور ہوا[1]،

احمد آباد گزیٹیر نے دو باتیں مزید لکھی ہیں، اول یہ کہ سلطان قطب الدین شاہ
ایک دن کہیں جا رہا تھا کہ ایک کنکر اس کے جوتے میں آگیا، تو اس نے کہا
کہ یہ کیسا کنکر ہے، دوم یہ کہ اس تالاب کو کھودتے وقت بکثرت کنکر نکلے، اسلئے
اس کو کانکریہ تالاب کہنے لگے،

سنسکرت، گجراتی، اور اردو میں کانکر یا کنکر پتھر کے چھوٹے ٹکڑوں
کو کہتے ہیں[2]، مذکورۂ بالا اسباب تسمیہ میں سے کوئی سبب دل کو لگتا نہیں، یہ
کسی قدر لگتی ہوئی بات ضرور ہے کہ اس تالاب کے کھودتے وقت بکثرت
کنکر نکلے ہوں، اور عوام اس کی وجہ سے کنکریہ یا کانکریہ کہنے لگے ہوں،
۱۹۵۲ء میں بلدیہ احمد آباد نے پانی نکال کر اس کو صاف کرایا تو اس میں بہت
کنکر نکلے، اس لئے اس کی مزید صفائی موقوف کر دی،

---

[1] مرآۃ احمدی، خاتمہ ص ۲۰ و ۲۱ [2] گجراتی شبد کوش ص ۲۵۰،

تالاب | یہ تالاب کس قسم کا تھا، اُس کو بہت مفصل طور پر آرکی ٹکچر آف احمد آباد کے مؤلف نے لکھا ہے [1] جس کو احمد آباد گزیٹیر نے نقل کیا ہی، اس نے لکھا ہے کہ رائے پور دروازہ سے ۱/۲ میل کے فاصلہ پر یہ حوض قطب واقع ہے یہ ۷۲ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے، اس کا دور ایک میل سے زیادہ ہے، اس کے ۳۴ گوشے ہیں، اس کے ہر جانب ۱۹۰ اطراف ہیں، اس کو سلطان قطب الدین نے ۸۵۵ھ میں پائیہ تکمیل کو پہنچایا، چاروں طرف پتھر کے زینے ہیں، چھ راستے ہیں جن کے اوپر گنبد ہیں، وسط میں ایک جزیرہ تھا، جو ۴۰ کمانوں کے پل کے ذریعے خشکی سے ملا ہوا تھا، ایک باغ بھی تھا، جس کو نگینہ باڑی کہتے تھے، اس سے آگے ایک محل تھا، جس کا نام گھٹامنڈل تھا، سلطان قطب الدین موسم گرما اسی محل میں گذارتا تھا، وسط تالاب میں ایک چھوٹا حوض بھی تھا، جس میں فوارہ لگا تھا، شمالی جانب ایک کمرہ [2] تھا، (جو غالباً مالی کے لئے ہوگا) اس خیال سے کہ یہ گرمیوں میں خشک نہ ہوجائے، اس کو گیارہ میل کی طویل نہر کھود کر کسی ندی سے ملا دیا گیا تھا [3] لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مہی ندی احمد آباد سے بہت دور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں اس کی کوئی شاخ ادھر رہی ہو، اور نہر اسی سے آکر ملی ہو، اور پھر بعد میں پٹ گئی ہو، یا مرآۃ احمدی کے مصنف نے غلطی سے کھاری ندی کے بجائے مہی ندی لکھدیا ہو، احمد نگر کے لوگوں کا خیال ہے کہ بات میں ایک

---

[1] آرکیٹکچر احمد آباد ص ۵۰ (۱۸۶۶ء) [2] گزیٹیر احمد آباد (۱۸۷۹ء) [3] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۲ کلکتہ،

نہر نکالی گئی تھی جو پرانتیج تک لائی گئی، اور پھر وہاں سے کانکریہ میں ملا دی گئی، اور یہ آج تک موجود ہے،

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گھٹا منڈل نامی محل اور کھانندرول ایک ہی عمارت کا نام ہے، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، گھٹا منڈل کی عمارت نگینہ باڑی کے بعد والی زمین پر تعمیر کی گئی تھی، اگلے زمانہ کے بادشاہوں کو اس قسم کا ذوق بہت تھا کہ وہ کسی بلند مقام مثلاً پہاڑی یا ٹیلہ پر محل تیار کرتے، یا دریا کے کنارے یا تالاب کے وسط میں محل تعمیر کرتے، سلطان زین العابدین نے کشمیر کے ڈل میں ایک جزیرہ بنا کر اُس پر ایک عمارت تعمیر کی تھی، سورت کے گوپی تالاب میں بھی اسی قسم کا ایک مکان وسط میں بنایا گیا تھا، اکبر کے عہد میں حکیم علی نے بھی ایک حوض کے وسط میں تیار کرائی تھی، شاہجہان کے زمانہ میں اس کے ولیعہد سلطنت شہزادہ داراشکوہ نے بھی حوض کے بیچ میں عمارت بنوائی تھی محمد شاہ بادشاہ دہلی نے لال قلعہ کے اندر حوض کے وسط میں ایک مکان بنوایا تھا، جس کا نام اوس نے ساون بھادوں رکھا تھا، پس اس عمارت کا نام جو کانکریہ تالاب کے قریب قطب الدین نے تعمیر کرائی تھی، اس نے گھٹا منڈل رکھا تو بالکل صحیح، اور اس وقت کے ذوق کے عین مطابق تھا،

اب رہا کھامندرول تو وہ درحقیقت ایک گانوں کا نام تھا، جیسا کہ پاٹ نگر کے مؤلف نے لکھا ہے، اس کی تائید مرآۃ احمدی سے بھی ہوتی ہے، اس نے لکھا ہے کہ کھان مندرول پور ہ ایب حامد پور

وغیرہ مرہٹہ گردی میں تباہ ہو گئے۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اساول ایک ایک مستقل آبادی تھی، اور بعد میں احمد آباد کی آبادی میں شامل ہو گئی، (آج بھی آسا بھیل کا ٹیکرہ مشہور ہے) اسی طرح کھان مندرول جو شاہ عالم (رسول آباد) اور کانکریہ تالاب کے درمیان واقع تھا، ایک پورہ بن گیا تھا۔

ا کھان مندرول کس زبان کا لفظ ہے اس کا پتہ مجھے سنسکرت، گجراتی اور فارسی کے لغت کی کتابوں سے نہ چل سکا، لیکن میرے دل میں اس کی کھٹک ایک عرصہ تک رہی، اتفاق سے کسی ناگر کی لکھی ہوئی فارسی کی ایک نامکمل کتاب احمد آباد کی تاریخ میں میری نظر سے گذری، اس میں لکھا تھا کہ یہ کولی زبان کا لفظ ہے، جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالباً یہ گانو کولیوں سے آباد ہوگا، کھان مندرول محل، ویسے ہی ہے، جیسے چاندنی چوک کا محل یا مانک چوک کا محل،

ب قطب الدین نے یہاں ایک محل کانکریہ تالاب کے بنوانے سے قبل تعمیر کرایا تھا، جیسا کہ مرآۃ احمدی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، اس میں لکھا ہے کہ اس نے تالاب بنانے کا حکم دیا اور خود کھان مندرول کی عمارت میں مقیم ہوا[2] قطب الدین کی اصل اسکیم یہ تھی کہ کھان مندرول میں جہاں ایک محل اور دوسری عمارتیں پہلے سے موجود تھیں، وہیں تالاب کے اندر گرد عمارتوں اور باغات کا ایک سلسلہ بنائے، چنانچہ تالاب کے جنوب میں ایک

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۴ کلکتہ، [2] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۵۳ کلکتہ

باغ اور محل کی تعمیر شروع بھی کر دی تھی کہ وہ وفات پا گیا، اگر اس نے کچھ اور عمر پائی ہوتی تو تالاب کے گرد محلات اور باغات تعمیر کر کے اس کو ایک فرحت بخش جگہ بنا دیتا،

قطب الدین کے بعد اس کا سوتیلا بھائی محمود بیگڑا جس کو اس نے مار ڈالنا چاہا تھا تخت نشیں ہوا، اس نے اپنے پچاس سالہ عہدِ حکومت میں کثرت باغ لگائے، اور بے شمار عمارتیں تعمیر کرائیں، وہ موسم سرما جوناگڑھ میں اور گرما اور برسات احمد آباد میں گذارتا تھا، درختوں اور باغوں سے اس کو عشق تھا جس کی تفصیل تاریخوں میں مذکور ہے، اس نے ایک باغ کانکریہ تالاب کے پاس لگایا جو سلطان مظفر سوم کے آخر عہد تک موجود تھا[1]، اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۹۱۸ھ تک تالاب اور نگینہ باغ پورے عروج پر رہے ہوں گے،

اس کے بعد مظفر اور سلطان بہادر یکے بعد دیگرے سریر آرائے حکومت ہوئے، ان دونوں کے عہد میں بھی جیسا کہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے، اس تالاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، ۹۴۲ھ میں جب ہمایوں بہادر شاہ کو شکست دے کر احمد آباد آیا ہے تو اسی تالاب پر خیمہ زن ہوا تھا، بہادر شاہ کی آخری عمر میں بدامنی شروع ہو گئی، پھر سلطان محمود، احمد اور مظفر کے زمانہ میں امراء کی خانہ جنگی نے احمد آباد کے امن و امان کو اور زیادہ غارت کر دیا، یہاں تک کہ ۹۸۰ھ میں جب اکبر نے احمد آباد پر قبضہ کیا تو اکثر شاہی محلات اور دوسری

---

[1] طبقات اکبری جلد سوم ص ۲۵۳ - کلکتہ،

بنیاد گذار شاہی عمارتیں تباہ و برباد ہو گئیں، اور تالاب کی مرمت نہ ہونے کے باعث، باغ ویران، محل برباد اور پل شکستہ ہو گیا، مرآۃ سکندری کے مؤلف کے بیان کے مطابق ۱۰۲۷ھ میں صرف حوض اور باغ باقی رہ گئے تھے[۱]،

اکبر کے عہد میں اس تالاب اور باغ کا کوئی ذکر نہیں ملتا، سوائے اس کے کہ اس کی فوجیں شہر سے نکل کر کانکریہ تالاب پر خیمہ زن ہوئیں، یا شہر میں داخل ہونے سے پہلے تالاب پر اُن کا پڑاؤ ہوا تھا، اس عہد کا ایک واقعہ البتہ تاریخوں میں ہے جس کو جہانگیر نے اس طرح بیان کیا ہے،

مصنف طبقاتِ اکبری نظام الدین احمد گجرات میں بخشی کے عہدہ پر تھا، اس نے ایک باغ تالاب کے کنارے لگایا تھا، جس پر اس کے بعد اس کا لڑکا عابد خاں قابض تھا، امیر عبداللہ خاں نے دشمنی سے اس کے کچھ درخت کٹوائے، جہانگیر احمد آباد آیا، اور اس کی اطلاع ہوئی تو امیر کے عہدہ میں کمی کر دی، اور ایک معقول رقم بطور جرمانہ اس سے وصول کی[۲]،

جہانگیر ۱۰۲۷ھ میں گجرات آیا، اس کی آخری منزل کانکریہ تالاب تھی، وہ لکھتا ہے کہ اس تالاب کو قطب الدین نبیرۂ سلطان احمد بانی احمد آباد نے بنوایا تھا، اُس کے چاروں طرف پتھر اور چونے کے زینے ہیں، اس کے وسط میں ایک معمولی باغیچہ اور ایک عمارت ہے، تالاب کے کنارے سے باغیچہ تک آمد و رفت کے لئے ایک پل ہے، چونکہ مدت

---

[۱] مرآۃ سکندری ص ۱۰ بمبئی [۲] تزک جہانگیری ص ۲۲۰۔

سے اُس کی مرمت نہیں ہوئی ہے، اس لیے اکثر جگہ سے شکستہ ہوگیا ہے، اور بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں رہی، جب میرے احمد آباد آنے کی خبر ہوئی تو صفی بخشی خاں نے شاہی خرچ سے اس کی مرمت کرائی، باغیچہ کی صفائی کرائی، ایک نئی عمارت اس میں تعمیر کی، یہ بہت اچھی جگہ ہے، اور مجھے بیحد پسند آئی،

پھر لکھتا ہے کہ ربیع الاوّل ۱۰۲۷ھ میں شبِ جمعہ کو میں نے حکم دیا، کہ تالاب کے چاروں طرف چراغاں کیا جائے، جس کو دیکھکر میں بہت خوش ہوا، مالوہ سے جب وہ دوبارہ یہاں واپس آیا، تو اسی تالاب پر اس نے جشن منایا،[1]

۱۴ رشعبان ۱۰۲۷ھ کو پھر اس نے چراغان کا حکم دیا، اور خود قلعہ سے نکل کر تالاب پر اس کا تماشا دیکھنے آیا، وسط میں جو عمارت تھی اس میں مختلف قسموں اور رنگوں کی روشنی کی گئی تھی، آتش بازی کا بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر انتظام تھا، کئی دن پہلے سے ابر و باد کا سلسلہ تھا، لیکن اس دن اس کا کوئی اثر نہیں تھا، خدا کے فضل سے حسب دلخواہ چراغاں ہوا، جہانگیر نے حکم دیا کہ کل شبِ جمعہ کو بھی اسی طرح چراغاں کیا جائے، خدا کی شان دیکھئے کہ دن بھر تو بارش ہوتی رہی، اور چراغاں کے وقت بادل چھٹ گیا، اور مطلع بالکل صاف ہوگیا، اور خوب چراغاں ہوا،

جہانگیر لکھتا ہے کہ اس کے کنارے ایک جوگی نے ایک کٹیا بنالی تھی

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۲۵ لکھنؤ،

اور اسی میں خلوت نشیں ہوگیا تھا، وہ فقیروں کی زندگی بسر کرتا تھا، ترکِ لذات وخواہشات سے بڑے بلند مرتبہ پر پہنچ گیا تھا، میں اس سے ملنے گیا، وہ تصوف کے تمام مسائل سے واقف تھا، اس فرقہ میں اس سے بہتر آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گذرا[1]،

پھر لکھتا ہے کہ ۲۲ رمضان ۱۰۲۷ھ کو آگرہ جانے کے لئے میں قلعۂ احمد آباد سے نکلا، اور کانکریہ تالاب پر خیمہ زن ہوا، اس دن میرا جشن شمسی تھا یعنی میری عمر کا پچاسواں سال شروع ہو رہا تھا، میں نے حسب دستور اپنے کو سونے چاندی اور دوسری چیزوں سے وزن کرا کے خیرات کیا، مروارید اور گل زریں ۱۲ اوپر نچھاور کیا، رات کو تالاب پر چراغاں کرایا، دوسرے دن جمعہ کو تمام مشائخ اور ممتاز لوگوں کی افطار کی دعوت کی، جو لوگ میرے پاس نہ آسکے تھے، اُن کو بلاکر مدد معاش کے طور پر زمین اور نقد روپیے دیئے، ۲۶ رمضان ۱۰۲۷ھ سہ شنبہ کے روز یہاں سے آگرے کی طرف کوچ کیا[2]،

شاہجہان کے عہد میں اس کے متعلق تاریخوں میں کوئی بات نہیں ملتی، البتہ اس کے زمانہ میں ۱۰۴۸ھ، ۱۶۳۹ء میں ایک جرمن مسافر منڈل سو احمد آباد آیا تھا، اس نے کانکریہ تالاب کے متعلق لکھا ہے کہ میں پتھر کا ایک پل طے کرکے باغ میں گیا، جس کا نام نگینہ باغ ہے، باغ کوئی بڑا نہیں، بلکہ ایک مکان

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۲۹ لکھنو، [2] اسٹنڈیزان دی ہسٹری آف گجرات ص ۱۰۲،

[3] خاتمہ مراۃ احمدی ص ۱۹ کلکتہ،

کے برابر ہے، بہت دلکش جگہ ہے، وسط میں مچھلیوں کا ایک حوض ہے جس میں بارش کا پانی سردیوں تک جمع رہتا ہے، گرمیوں میں گہرے کنوؤں سے بڑے بڑے چرس سے پانی نکالا جاتا ہے جن کو بیل کھینچتے ہیں، اور اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا، جس جگہ چرخیوں سے پانی نکالتے ہیں، وہاں کسی کو جانے نہیں دیتے لیکن مجھے اجازت مل گئی، میں وہاں گیا، اور لوگوں سے باتیں بھی کیں[1]، عوام یہاں بہت کم آتے ہیں۔

منیر الدولہ حیدر قلی خاں ناظم صوبہ گجرات کے عہد ۱۱۳۳ھ میں سرکاری طور پر اس کی مرمت ہوئی، پل کے چند طاق جو شکستہ ہو گئے تھے، اُن کو پھر سے درست کرایا گیا، جب اس کا انتظام دیوان صوبہ کے تحت آ گیا، تو چار آدمی باغبانی اور دیکھ بھال کے لئے اور چار بیل آب کشی کے لئے مقرر کئے گئے،

اس کے بعد سے مغلوں کے آخری عہد تک تاریخوں میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا، مرہٹوں کے عہد ۱۱۸۵ھ میں فاربس نامی ایک مسافر آیا تھا، وہ لکھتا ہے کہ اس وقت یہاں مرہٹوں کا راج ہے، کانکریہ تالاب میں گھٹا منڈل نام کا جو محل موسم گرما کے لئے تھا، وہ ویران ہو گیا ہے، باغ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے، پل جس میں ۴۸ کمانیں تھیں، اور جو تالاب کو خشکی سے ملاتا تھا، وہ بھی شکستہ ہو گیا ہے۔ اس میں میں نے پالمیرا کے درخت دیکھے، یہ درخت تاڑ یا کھجور کے مثل سیدھا اور اونچا چلا جاتا ہے۔

---

[1] اسٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات ص ۱۰۳

اور گچھے دار پتیاں اس کے سرے کی شاخوں میں نکل آتی ہیں، یہ درخت بڑا نایاب ہے، اور اکثر لوگ اس کو دیکھنے آتے ہیں[1]

غرض ۱۷۹۱ء سے ۱۸۲۰ء تک اس کی کسی نے خبر نہیں لی، نتیجہ یہ ہوا کہ (۱۲۰۹ھ — ۱۱۷۵ھ)
اس درمیان میں اس جزیرہ میں نہ باغ باقی رہا، نہ محل، سب ویران ہو گئے، پل بھی ٹوٹ گیا۔ زینے بھی جا بجا سے قابلِ مرمت ہو گئے، تالاب کے ارد گرد بھی کوئی محل، مکان اور باغ باقی نہیں رہا۔ وہاں ایک ہو کا عالم تھا،

۱۸۷۲ء میں مسٹر بورا ڈیل کلکٹر ضلع احمد آباد نے حکومت میں اس کی رپورٹ کر کے مرمت کی اجازت حاصل کی، اور چوراسی ہزار خرچ کر کے نگینہ باغ، کانکریہ تالاب، اور شاہ عالم کی مسجد کی مرمت کرائی،[2] موصوف نے کانکریہ تالاب سے رائے پور دروازہ تک ۰۰۰۰ فٹ طویل ایک سڑک بھی بنوائی، تالاب کے کناروں کو درست کرایا، درخت لگوائے، شمالی جانب جو راستہ تھا، اس کی مرمت کرائی، حوض کے تہ میں مٹی اور کیچڑ ہو گئی تھی، اس کو نکلوا کر صاف کرایا، جنوب کی طرف کی دیوار دوبارہ بنوائی، شمالی جانب پل پر جانے کے لئے زینے بنوائے، جزیرہ کے چاروں طرف بھی زینے بنوائے، تاکہ لوگ کشتی پر سوار ہو کر آ جا سکیں، جزیرہ کے چاروں طرف دیوار اٹھوائی، تاکہ کوئی اچانک اس میں گر نہ پڑے، وسط تالاب میں ایک چھوٹا حوض اور اس میں فوارہ تھا۔ اس کی نئے سرے سے مرمت کرائی، شمال میں ایک کمرہ تھا، اس کو بھی تعمیر کرایا، باغ کی بڑی

---

[1] اسٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات ص ۱۰۳ [2] مرآۃ احمدی ص ۳، ہسٹی،

مٹی کھود کر نکلوائی اور نئی مٹی اس میں بھروائی۔

۱۸۷۹ء ۱۲۹۷ھ میں ایک تجویز پیش کی گئی تھی کہ گیارہ میل لمبی ایک نہر کھود کر کھاری دریا سے لائی جائے، اور اس کو کانکریہ سے ملا دیا جائے اور پھر اس کو چنڈولا تالاب سے بھی ملا دیا جائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ پانی دریا سے حاصل کیا جاسکے[1] مگر اس پر عمل نہ ہوسکا ۱۹۵۲ء تک کانکریہ تالاب اسی طرح ہے، نقطۂ وسط کا فوارہ اب نہیں ہے، احمد آباد کارپوریشن آیندہ جنوری ۵۳ء میں احمد آباد کا پانچسو سالہ جوبلی جشن منارہی ہے۔ دیکھئے اس تاریخی تالاب کی طرف کیا توجہ کرتی ہے، جو احمد آباد کے عہد رفتہ کی ایک عظیم الشان تاریخی یادگار ہے۔

---

[1] گزیٹیر،

محکمۂ آب رسانی

(واٹر ورکس)

ہندوستان میں سب سے پہلے دکن کی بہمنی سلطنت نے اس محکمہ کو قائم کیا، مٹی کے نل بنواکر ہر طرف پانی کی نہریں جاری کیں[1]، افسوس ہے کہ اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہ ہو سکا،

سلطان ناصرالدین خلجی نے مانڈو (مالوہ) میں قلعہ کے اندر ایک محل تیار کرایا تھا جس کی مرمت بعد میں باز بہادر نے کرائی، جو مالوہ کا آخری خود مختار فرماں روا تھا۔ وہ نل لگا کر ایک چشمہ کا پانی اس محل کے اندر لے گیا تھا[2]، محل کے اندر گوشوں کے علاوہ غسل خانہ اور باغ تک بھی یہ پانی کا نل گیا تھا،

احمد آباد گجرات میں بھی یہ محکمہ موجود تھا، ملک شعبان گجراتی کی مسجد جو آج بھی سلاپس روڈ پر موجود ہے، اس کے پانی کے نل میں دیوان

---

[1] تاریخ دکن ہاشمی ص ۵۷۔ حیدرآباد، [2] تاریخ مالوہ ص ۵۵، لکھنو۔

علی محمد خاں متوفی سنہ ۱۱۵۰ھ کے زمانہ میں کچھ خرابی آگئی تھی، جس کی سرکاری طور پر مرمت کردی گئی[۱] اسی طرح احمد آباد کی جامع مسجد میں بھی نل کے ذریعہ پانی آتا تھا، مراۃ احمدی میں ہے کہ پانی کی نالیاں جن سے جامع مسجد اور دوسری مسجدوں میں پانی جاتا تھا، خراب ہوگئی تھیں۔ ان کی مرمت کے لئے دیوان صوبہ نے بارہ سو روپیہ کا بجٹ بنایا، اور عالمگیر کے پاس بھیج دیا، وہاں سے حکم آیا کہ ایسے نیک کاموں کے لئے حکم کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ جب بھی اس قسم کی ضرورت پیش آئے[۲] اس کو پورا کردینا چاہئے،

تذکرۃ الملوک میں ہے غازی الدین خاں صوبہ دار احمد آباد نے سنہ ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۸ء میں جامع مسجد کے صحن میں ایک سنگ مرمر کا حوض تیار کرایا، اور اس میں سابرمتی ندی سے پانی لاکر ڈالا۔

ایک قلمی تاریخ میں ہے کہ بانک ندی سے پانی، کالوپور دروازہ سے چوک ہوتے ہوئے رنچی روڈ کے پل کے نیچے سے گذر کر تین دروازہ کے پاس سے خاص بازار میں پہنچ کر جمع ہوتا تھا، اور وہاں سے نالیوں کے ذریعہ مختلف مقامات میں بھیجا جاتا تھا، اسی لئے اس جگہ کو کاریز (کاریز) کہتے ہیں، اسی جگہ سے محلات شاہی اور باغوں میں بھی پانی جاتا تھا[۳]

صوبہ گجرات کے دیوان علی محمد خان کا مکان جو ان کے وارثوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ آج بھی احمد آباد کے محلہ رائے کھڑ میں موجود ہے، اس

---

[۱] مراۃ احمدی ج ۱ ص ۳۱۶ - کلکتہ [۲] مراۃ احمدی ج ۱ ص ۲۷۹ -
[۳] تاریخ عزیزی قلمی،

وہ مینارے آب رسانی کے لئے بطور یادگار اب بھی موجود ہیں۔

اعظم خاں کے محل میں آج بھی ایک حوض موجود ہے جس میں سابرمتی ندی سے پانی آتا ہے، اور وہ ہمیشہ بھرا رہتا ہے۔ اس کا پانی کبھی خراب نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی ایک طرف سے آتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے لیکن آنے جانے کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا، آج تک اس کی تحقیق نہ ہو سکی۔

مذکورہ بالا واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ آب رسانی کا مکمل نظام احمد آباد گجرات میں موجود تھا، مگر آج کی طرح گلیوں، سڑکوں اور عام مکانوں تک پھیلا ہوا نہیں تھا: کہ اس سے سلاطین اور امراء کے علاوہ عوام بھی فائدہ اٹھاتے، پھر اسوقت بہت زیادہ اسکو پھیلانے کی درحقیقت ضرورت بھی نہیں تھی۔ پورے گجرات میں عموماً اور احمد آباد میں خصوصاً یہ رواج تھا کہ ہر مکان کے صحن میں ایک پختہ حوض بنایا جاتا جو زمین دوز ہوتا، یہ مسقف ہوتا تھا، برسات میں بارش کا صاف ستھرا پانی جو چھت سے گرتا اس کو حوض میں بھر لیا جاتا، اور پھر سال بھر تک استعمال کیا جاتا، اس حوض کو یہاں "ٹانکہ" کہتے ہیں، ٹانکا ٹانکی کا رواج بہترین اور بہت مفید تھا، جو اب ختم ہو گیا۔ اس کا پانی گرمیوں میں برف کی طرح سرد رہتا تھا، تر و تازہ ہوا کی آمد و رفت کی وجہ سے پانی بہت صاف اور پینے کے لائق ہوتا، اسی سبب سے یہاں کنواں بہت کم تھا، ندی کے قریب کے رہنے والے ندی کا پانی استعمال کرتے تھے۔

راقم الحروف کو احمد آباد اور کھنبایت میں اس کا پانی پینے اور اس سے غسل کرنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے۔ مجھے اُس کے مزہ، رنگ اور بو وغیرہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا، بلکہ نل کے پانی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صاف شفاف اور ٹھنڈا تھا لیکن جہانگیر نے تزک جہانگیری میں اس کی بڑی مذمت کی ہے، اُس نے لکھا ہے کہ جو لوگ صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں، وہ اپنے گھروں میں حوض بنا لیتے ہیں، اور موسم برسات میں بارش کا پانی اس میں جمع کر لیتے ہیں، اور دوسرے سال کے آنے تک برابر استعمال کرتے رہتے ہیں لیکن جس پانی میں ہوا کا گذر نہ ہو، اور بخارات کے نکلنے کا راستہ نہ ہو، اس کی مضرت ظاہر ہے[۵۱]

میرا خیال ہے کہ جہانگیر کو اس کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا، غیر گجراتیوں نے جیسا کچھ اس سے بیان کیا، اس پر اعتماد کر کے اُس نے لکھ دیا، اس نے ذاتی طور پر اس کا کوئی تجربہ نہیں کیا۔ نہ تو اُس نے اس کا پانی پیا نہ اور کسی ضرورت کے لئے استعمال کیا، میں نے تو جہاں جہاں ٹانکہ دیکھا، اُس میں ہوا کی آمد و رفت کا راستہ بھی مجھے دکھایا گیا، ممکن ہے جہانگیر نے کسی ایسے گھر میں دیکھا ہو، جہاں گھر والوں کی غفلت سے ہوا کی آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا ہو۔

بیجا پور دکن کے عادل شاہیوں کو عمارتوں کا بیحد شوق تھا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں اُن کی بعض عمارتیں بڑی لاجواب ہیں، جن کا جواب

---

[۵۱] تزک جہانگیری ص ۲۲۳ - جنتری ۱۳ - لکھنؤ۔

پورے ہندوستان میں نہیں ہے۔ ان عمارتوں میں پانی پہنچانے کا سوال پیدا ہوا، تو انھوں نے ایرانیوں کے مشورہ سے جن کی اس وقت آمد رفت زیادہ تھی، شیراز کے طرز پر پتھروں کی نالیاں بنوائیں، دور سے نہر لاکر پہلے شہر میں پھر قلعہ میں لے گئے۔ اور وہاں ایک بڑے حوض میں نہر کا پانی جمع کیا، اور اس حوض میں نالیوں کے ذریعہ پانی محلات، باغات، مساجد اور حمام وغیرہ میں لے گئے۔ بساتین السلاطین میں ہے :-

کاریزاز دو فرسنگ راہ جہ
جا سنگ صلب شکستہ در اندروں
شہر آوردہ بہ قلعۂ حوض بزرگ
بنا فرمودہ اند کہ آن را کاریخ
گویند"[۱]

(علی عادل شاہ ثانی (بیجاپور) کے حکم سے کشور خاں دو فرسخ (چھ میل) کی مسافت سے سخت پتھروں کو توڑ کر اور تراش کر ایک نہر شہر کے اندر لایا، اور پھر قلعہ میں ایک بڑا حوض بنا کر پانی اس میں جمع کیا، اس کو کاریخ (کاریز) کہتے ہیں"

یہ چیز بعد میں پورے دکن اور خاندیس میں عام ہوگئی۔ اور اس کی تقلید ہر جگہ کی گئی، چنانچہ خاندیس کے پایۂ تخت برہان پور میں واٹر ورکس موجود تھا، جس کے ذریعہ پانی تمام شہر میں تقسیم ہوتا تھا۔ مظہر الدین صاحب اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں :-

---

[۱] بساتین السلاطین ص ۲۰۱ (حیدرآباد)

"برہان پور شہر میں قدیم طرز کا واٹر ورکس موجود ہے، ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلے پر چند کنوئیں ہیں، انہی سے نہر کے ذریعہ پانی آتا ہے، اور تمام شہر میں پہونچایا جاتا ہے۔ پہلے شہر میں کئی ایک بڑے اور بلند مینارے بنے ہوئے تھے، اور اُن کے ذریعہ شہر میں پانی پہونچ جایا کرتا تھا، اب مینارے بند کر دیئے گئے ہیں، اور آہنی نلوں کے ذریعہ پانی پہنچایا جاتا ہے لیکن گرمیوں میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے، اور سارے شہر میں اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔"

مظفرالدین صاحب کا سفرنامہ چودہویں صدی کی ابتداء کا ہے جس کے معنے یہ ہوئے کہ نالیاں اس وقت تک موجود تھیں، اور محکمۂ بلدیہ نے جدید طریقہ کے مطابق پتھر کے بجائے نل استعمال کئے ہیں، باقی چیزوں کو اپنی جگہ پر بحال رکھا ہے، لیکن ان جدید نلوں کے لگاتے وقت انجینیر نے پانی کی سطح کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔[۵۱]

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ صرف اس وقت کے بڑے بڑے شہروں میں پانی کا انتظام تھا، اور چھوٹے چھوٹے شہر یا قصبے اس سے محروم تھے، بلکہ دکنیوں نے اس کو وسعت دے کر قصبوں تک پھیلا دیا تھا، چنانچہ ضلع برہانپور سے دو میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ "بہادر پور" تھا، اس میں نہر کے ذریعہ پانی آتا تھا، جو سارے قصبہ کی ضروریات کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا تھا۔[۵۲] یہ قصبہ آج بھی موجود ہے، اور پانی کا انتظام بھی اسی طرح قائم ہے۔

---

[۵۱] سفرنامہ مظفری ص ۲۲۔ ۲۳۔ [۵۲] ایضاً ص ۲۱۸۔

صوبہ برار میں بھی آب رسانی کا محکمہ موجود تھا۔ اس کا مشہور شہر "ایلچ پور" آج بھی موجود ہے۔ اس کو ایک امیر ایلچ خاں نے آباد کیا تھا، اس میں ایک قدیم واٹر ورکس ایلچ خاں کا بنوایا ہوا تھا، ۱۲۲۲ھ میں نواب صلابت جنگ نے اپنی صوبہ داری کے عہد میں اسکی از سرِ نو مرمت اور صفائی کرائی اور اس کی ساری خرابیاں دور ہوگئیں۔ منظر الدین صاحب اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ

"آج سے ۳۲ سال قبل پانی کی آمد پھر بند ہوگئی تھی، میونسپلٹی نے اُس کو درست کرانا چاہا، قدیم نل توڑ دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ جدید قسم کے لوہے کے نل لگائے گئے۔ لیکن اُن میں کسی طرح پانی نہیں چڑھتا، بے حد کوشش کی گئی، لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ افسوس کہ یہ کارخانہ ہی درہم برہم ہوکر رہ گیا۔"[۱]

"اسی طرح اورنگ آباد میں بھی یہ طریقہ رائج تھا، اور محکمۂ آب رسانی کے ذریعہ تمام شہر میں پانی جاتا تھا۔ لیکن یہاں بھی توڑ دیا گیا، اور پھر دوبارہ قائم نہ ہوسکا۔

آب رسانی کا نظام آگرہ میں بھی تھا۔ لیکن قلعہ، محلات اور حمام وغیرہ تک محدود تھا۔ مغلوں نے اس سے زیادہ اُس کو وسعت نہیں دی البتہ قلعہ سے چاندنی چوک تک ایک نہر لے گئے تھے۔ راقم الحروف نے اس کو دیکھا بھی تھا لیکن بخلاف اُس کے دکن والوں نے اُس کو بڑی

---

[۱] سفرنامہ منظری ص ۲۲۳

وسعت دی۔ اور نسلاً بعد نسلٍ بطور پیشہ کے اس کو اختیار کرتے رہے، آج بھی اس نسل کے لوگ وہاں موجود ہیں، جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو یہی لوگ آکر اس کو درست کر دیتے ہیں۔ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں[۱]"

گھوگھا | کاٹھیاواڑ میں ایک قدیم بندرگاہ کھلے سمندر میں واقع ہے۔ اسی لئے بڑے بڑے جہاز یہیں آکر ٹھہرتے تھے، یہ کھنبایت کے ماتحت تھا، ابھی حال میں اس بندرگاہ کے بعض مقامات کی کھدائی ہوئی ہے۔ وہاں بھی واٹر ورکس کے بعض حوض نکلے ہیں، یہ حوض اس قدر بڑے بڑے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں پانی کا ذخیرہ کافی رہتا ہوگا۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق ابھی معلومات نہیں مل سکے ہیں۔ سرکاری رپورٹ کا انتظار ہے۔

قطب آباد عرف بٹوہ | دسمبر ۱۹۵۸ء میں مجھے بٹوہ (قطب آباد متصل احمد آباد) جانے کا اتفاق ہوا، حضرت قطب عالم کے مقبرہ کے شمال جانب ایک تالاب ہے اس کے کنارے پر دو مینارے اب بھی کھڑے ہیں۔ میں نے اُن کو جا کر بغور دیکھا، پھر قطب الدین صاحب سجادہ نشیں درگاہ قطبی سے دریافت کیا، معلوم ہوا کہ یہ آب رسانی (واٹر ورکس) کے مینارے ہیں، اس قصبہ میں اس کا مکمل انتظام تھا۔ حوض سے پانی بلندی پر چڑھایا جاتا، اور پھر وہاں سے قصبہ

---

[۱] سفرنامہ مظہری ص ۲۲۳۔

کے تمام مکانوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ بڑے بڑے نل مٹی کے، زیر زمین
لوگوں کے مکانوں تک ہوتے تھے، اس طرح تمام شرفائے ٹپوہ کے
مکانوں تک پانی پہونچ جاتا تھا، اس قصبہ میں کوئی پرانا کنواں مجھے نظر
نہیں آیا، آج بھی جب کوئی پرانا کنواں کھودا جاتا ہے تو اُس کے نیچے
سے مٹی کے نل نکلتے ہیں، فی الحال نہر کے ذریعہ پانی آتا ہے، یہ نہر
قدیم ہے یا جدید میں اس کی تحقیق نہ کرسکا، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک
کسی دریا سے اس کا تعلق نہ ہو، سال بھر تک پانی کی بہم رسانی ناممکن ہے

رفاہِ عام کے کام

قحط کا انتظام | قحط کے موقع پر سلاطینِ گجرات بڑی فیاضی سے کام لیتے اور دل کھول کر رعایا کی خبرگیری اور مدد کرتے تھے، اُن کے عہد میں سب سے پہلا قحط قطب الدین کے زمانہ میں ہوا، اس وقت عماد الملک ملک شعبان وزیر تھا، اُس نے صرف اس خیال سے کہ غیرت مند لوگ مفت امداد لینا پسند نہیں کرتے ہیں، تالاب بنوانا شروع کر دیا، اور معماروں اور افسروں کو حکم دیدیا کہ جو شخص بھی آئے رکھ لو، خواہ وہ کتنا ہی ناکارہ، کاہل سست اور کام چور ہو۔ دیر، سویر، وقت اور ساعت کا خیال بالکل نہ کرو،

عماد الملک کو غریبوں کا بڑا خیال تھا، وہ جانتا تھا کہ جہاں ہزاروں مزدور اور معمار کام کرتے ہیں، وہاں کام کے نگراں اور افسر خورد بُرد بھی کر ڈالتے ہیں۔ اور غریب مزدوروں کی حق تلفی ہو جاتی ہے، اس لئے وہ خود روز شام کو موقع پر پہنچ جاتا تھا، اور اپنے ہاتھ سے مزدوری تقسیم کرتا تھا،

اور کوشش کرتا تھا کہ ایک متنفس بھی اجرت پانے سے نہ رہ جائے،

ایک دن حسب معمول شام کو مزدوری لے کر گھوڑا گاڑی پر جارہا تھا، اتفاق سے اس کی معیت میں آدمی کم تھے۔ کچھ لوگوں نے راستہ میں اس کی گاڑی کو گھیر لیا، اور زبردستی اس سے رقم چھین لینی چاہی، عماد الملک نے کہا کہ دیکھو یہ روپیہ ان غریب مزدوروں کی مزدوری کے ہیں جو صبح سے اس امید پہ کام کر رہے ہیں کہ شام کو ان کی مزدوری ضرور مل جائے گی، اگر یہ روپیہ اس وقت میں تم لوگوں کو دیدوں تو وہ مزدور اور ان کے بال بچے آج بھوکے رہ جائیں گے، اگر تم اس وقت جانے دو تو کل میں اسی قدر روپیہ تم لوگوں کو ضرور دیدوں گا،

چوروں اور ڈاکوؤں نے کہا کہ ہم اگر تم کو آج چھوڑ دیں۔ تو تم کب ہمارے ہاتھ آنے والے ہو، ہم اس غنیمت موقع کو کبھی جانے نہ دیں گے۔ عماد الملک نے قسم کھا کر کہا کہ تم بالکل اطمینان رکھو۔ جہاں کہو اسی قدر روپیہ تم کو پہنچا دونگا اور تمھارے ساتھ کسی قسم کی بدی نہ کروں گا، چوروں نے اس کی قسم کا اعتبار کیا، اور اس کو چھوڑ دیا، دوسرے دن ملک شعبان پورے خدم وحشم کے ساتھ اس مقام پر پہنچا جہاں چوروں سے ملنے کا وعدہ تھا۔ چور یہ ٹھاٹھ دیکھ کر منتشر ہو گئے تھے۔ مگر عماد الملک حسب وعدہ روپئے لیکر آگے بڑھا، اور انکو بلایا، انکو دم دلاسا دیا: وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آئے عماد الملک نے وہ سب روپیے ان کو دیدئے، پھر ان سے دریافت کیا کہ اس پیشہ کو آخر تم کیوں اختیار کر رکھے ہو، انھوں نے افلاس اور قحط کا عذر کیا عماد الملک نے

ان کو دوسرے دن دفتر میں بلوا کر ان میں سے ہر ایک کو اس کے لائق کام پر لگا دیا۔[1]

سلطان محمود اعظم کے زمانہ ۸۴۲ھ ۱۴۳۸ء میں بھی گجرات میں قحط پڑا تھا، اس موقع پر بھی بہت معقول انتظام کیا گیا، غریبوں کے لئے لنگر خانے کھول دئے گئے۔ اور دوسرے لوگوں کو طرح طرح کے کام پر مقرر کیا گیا تاکہ فقر و فاقہ سے وہ محفوظ رہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے زمانہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء میں بارش نہیں ہوئی اور امساک باراں سے مخلوق خدا بیحد پریشان ہوگئی۔ اس نے قحط دور کرنے کی جتنی ممکن تدبیریں ہوسکتی ہیں، وہ سب عمل میں لایا لیکن قحط دور نہ ہوا، اس نے پھر مذہبی اور روحانی طریقے اختیار کئے۔ خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا اگر یہ قحط میری برائیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ہے تو میری زندگی کا خاتمہ کردے لیکن میرے سبب سے ان غریبوں کو تکلیف نہ دے۔ خدا نے دعا قبول کرلی، اس دن خوب بارش ہوئی، اور قحط رفع ہوگیا۔[2]

سلطان بہادر شاہ کے عہد میں جب قحط ہوا تو اس نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر جگہ لنگر خانے کھول دیئے۔ اور جب محل سے نکلتا تو خزانچی کو ساتھ لے لیتا، اور روپیہ تقسیم کرتا ہوا جاتا، اور تقسیم کرتا ہوا واپس آتا۔ اس سے غریبوں کی مصیبت بہت حد تک کم ہوگئی،

احمد شاہ اول کے عہد میں بھی ایک مرتبہ قحط پڑا تھا۔ تو اس نے دکن

---

[1] ظفر الوالہ ص ۱۷ جلد اول لندن [2] مرآۃ سکندری ص ۱۲۵ بمبئی

سے غلہ منگوا کر گجرات میں تقسیم کرایا تھا۔[۱]

مغلیہ عہد میں شاہجہاں کے دورِ حکومت میں قحط پڑا تو بادشاہ نے کاشتکاروں کی مالگذاری معاف کر دی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا، غریبوں اور بیکوں کی مدد کے لئے لنگر خانے بھی کھول دیئے، باہر سے غلہ بھی منگوا کر تقسیم کرایا۔[۲]

سبیل | رفاہ عام کے کاموں میں ایک چیز سبیل بھی تھی، جس سے مسافر راہ گیر، اور ہر آیندہ و روند جو اُس کے پاس سے گذرتے اپنی پیاس بجھاتے، اس کا رواج مجھے صوبہ گجرات کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آیا، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہر چوراہے پر ایک شخص پانی کے چند گھڑے لے کر بیٹھ جاتا، اور وہ ہر آیندہ و روند کو پانی پلاتا، وہ اگر چاہتا تو پیسہ دیتا، اور نہ دیتا تو مانگا نہ جاتا۔ قدیم زمانہ میں یا تو سرکاری طور پر اس کا انتظام ہوتا، یا دولتمند اور مخیر لوگ ثواب کے طور پر اس کو جاری کرتے، آج کل بھی گجرات میں یہ جاری ہے۔

جدید شہر اور گانوں | گجرات کے بادشاہوں کو نئے شہروں اور گانوں کے آباد کرنے کا ہمیشہ سے خیال رہا، انھوں نے کبھی تو کسی فتح کی یادگار میں گانوں یا شہر بسائے جیسا کہ مظفر شاہ اوّل نے اپنی فتح کی یادگار میں پٹن کے پاس ایک گانوں جیت پور بسایا، یا کبھی کسی ولادت کے موقع پر کوئی شہر آباد کیا، جیسے سلطان احمد نے اپنے لڑکے محمد شاہ کی ولادت

---

[۱] تاریخ دکن مؤلفہ ہاشمی صاحب [۲] مرآۃ احمدی،

کے موقع پر جونذر باد کے قریب ہوئی تھی ایک شہر سلطان پور کے نام سے آباد کیا۔ یا کبھی کسی ضرورت کی بنا پر کسی شہر کی بنیاد رکھی، جیسا کہ احمد شاہ اوّل نے احمد آباد کی بنیاد رکھی، اور پھر ایڈر کے پاس احمد نگر کا شہر اور قلعہ تعمیر کیا، اسی نے بالاسنور گجرات میں ایک قلعہ جیتور نامی تعمیر کرایا۔ اسی طرح دھامودر نامی ایک قصبہ بسایا، اور ۸۲۳ھ ۱۴۲۰ء میں شہر پناہ بنوائی، دوحد (داہود) بھی اسی کا آباد کیا ہوا ہے[1]

سلطان محمود اوّل نے احمد آباد سے بارہ کوس پر اپنے نام سے ایک نیا قصبہ محمود آباد بسایا، جو آج تک موجود ہے۔ اسی نے جوناگڑھ فتح کرنے کے بعد قلعہ کے نیچے مصطفیٰ آباد کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا۔ اسی کو آج کل جوناگڑھ کہتے ہیں، جب چانپانیر فتح ہوا تو وہاں بھی ایک نیا شہر محمد آباد کے نام سے تعمیر کیا، جو سلطان بہادر کے عہد تک قائم رہا، اسی عہد میں مظفر شاہ نے بڑودہ کے قریب راج پورہ آباد کیا، محمود اوّل سے پہلے جزیرہ دیو کی کوئی اہمیت نہیں تھی، لیکن پرتگیزیوں کی بدنیتی سے اس پر خاص توجہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملک ایاز اس عہد کا مشہور امیر البحر تھا، اسی کے سپرد یہ جزیرہ کیا گیا، اس نے اس کو نہ صرف آباد کیا، بلکہ بحری مرکز بھی بنا دیا، بہادر شاہ کے عہد میں یہ اس قدر آباد اور پُر رونق ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے اس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، احمد آباد کے پاس عماد الملک نے ایک گاؤں عیسن پور آباد کیا، اور

---

[1] مرأۃ سکندری۔

اس کے گرد پختہ دیوار کی فصیل بنائی جس کو آخر میں احمد آباد کی وسعت نے اپنے دامن میں لے لیا۔ اور وہ اس کا ایک محلہ بن گیا۔ مظفر حلیم نے بڑودہ کے قریب ایک شہر بسایا جس کا نام دولت آباد رکھا۔ احمد آباد کے قریب ایک امیر نے محمود آباد کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ جو اکبر کے عہد تک موجود تھا۔[1] محمود ثالث کے عہد میں سورت کا شہر اور قلعہ بنایا گیا۔ اس سے پہلے وہ مچھلی والوں کا ایک گانوں تھا۔[2] امیر الامرا سید مبارک شاہ نے محمود آباد سے قریب سید پور ایک گانوں آباد کیا۔[3] سلطان محمود اوّل کے عہد میں عثمان نامی ایک بزرگ نے احمد آباد سے متصل سابرمتی دریا کے کنارے ایک گانوں آباد کیا، اور اس کا نام عثمان پور رکھا، آہستہ آہستہ وہ اس قدر آباد ہوگیا کہ اس میں دس ہزار گھر فقط کاریگروں کے تھے افسوس کہ مرہٹوں کے عہد میں یہ ویران ہوگیا، اب ایک چھوٹا سا گانوں ہوکر رہ گیا ہے۔

یہ چند شہروں اور آبادیوں کے قیام کا حال بطور مثال کے لکھا گیا ہے، ورنہ تاریخ کا تفحص سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بڑی فہرست تیار ہوسکتی ہے بعض شہروں کی آبادی ان شہروں کی رونق، آبادی، اور وسعت کا یہ حال تھا کہ آج بھی اُن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ احمد آباد اتنا بڑا تھا کہ ایک طرف وہ سرکھیج سے ملتا تھا۔ اور دوسری طرف محمود آباد سے، محمود ثالث کے عہد میں احمد آباد و محمود آباد کے درمیان کی سڑک کے دو رویہ دوکانیں اور

---

[1] ظفر الوالہ جلد دوم ص ۴۳۹، [2] تاریخ سورت قلمی کتب خانہ شیخ عبدہ دس،
[3] مرآۃ سکندری ص ۳۲۹، بمبئی۔

مکانات بنوا کر، اور درخت لگا کر ان کو ایک کر دیا گیا تھا، اس وقت احمد آباد کی آبادی بیس لاکھ تھی[۵] کھنبایت جو ایک بڑا بندرگاہ تھا۔ اس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ اسی طرح جوناگڑھ اور چانپانیر وغیرہ کی آبادی بھی لاکھوں کی تھی۔ احمد نگر بھی اس زمانہ میں آبادی کے لحاظ سے ایک بڑا شہر سمجھا جاتا تھا، چونکہ یہ سرحدی شہر تھا، اس لئے اس کے استحکام اور آبادی کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا، بھروچ کی آبادی بھی کچھ کم نہ تھی، مغلیہ عہد میں سورت کی آبادی بارہ لاکھ تھی۔

گجرات کے پایۂ تخت گجراتی راجاؤں کے زمانہ میں پایۂ تخت پٹن تھا۔ چاوڑا خاندان نے انہل واڑہ پٹن (نہروالہ) کی بنیاد رکھی، تو اس کو پایۂ تخت بنایا۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں گجرات فتح ہوا، تو یہی پایہ تخت رہا۔ جب سلطان احمد اول ۸۱۳ھ میں گجرات کے پایۂ تخت پر بیٹھا، اور اپنے رشتہ داروں کی بغاوت دور کرنے کے لئے اساول آیا تو اس کو خیال پیدا ہوا کہ پایۂ تخت وسط میں ہونا چاہیے۔ تاکہ جنوبی اور شمالی گجرات کے ساتھ کاٹھیاواڑ کی بھی آسانی کے ساتھ نگرانی کی جا سکے، چنانچہ انہی مصلحتوں کے مدنظر احمد آباد کو پایۂ تخت بنایا، اور شہر معظم کا خطاب اس کو بخشا، ریاست ایڈر کے راجا نے جب بار بار بغاوت کی، اور بغاوت کے استیصال میں دیر ہوئی، تو وہاں اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا،

---

[۵] تمدن عرب طبع اول آگرہ،

مندرباسی کے ساتھ ایک شہر آباد کیا جس کا نام احمدنگر رکھا، اس انتظام سے راجا کی بغاوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا، سلطان اس کو بھی پایۂ تخت بنانا چاہتا تھا تاکہ سال کا ایک حصہ یہاں گذارے، اور دوسرا حصہ احمدآباد میں، وہ احمدنگر کو شہر ہمایوں کہتا تھا، بعض سکوں پر جو یہاں ڈھالے گئے۔ ان پر "شہر ہمایوں" ہی لکھا ہے۔

(۱۴۲۶ء)

محمود اعظم بیگڑا جب تخت نشین ہوا، اور ۱۴۷۲ء میں قلعہ گرنار (جوناگڑھ) فتح ہوا تو قلعہ کے نیچے ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام مصطفٰی آباد رکھا، وہ سال میں کچھ مہینے یہاں رہتا تھا۔ اور کچھ مہینے احمدآباد میں۔ اس شہر کو اس نے شہر اعظم کے نام سے موسوم کیا، اور سکوں پر بھی یہی مسکوک کرایا۔ چونکہ کاٹھیاواڑ کو مکمل طور پر اپنے زیرنگیں رکھنا چاہتا تھا، اور سندھ کی سرحد کی حفاظت بھی مقصود تھی، اسلئے عرصہ تک یہی شہر اس کا پایۂ تخت تھا۔

۱۴۸۴ء میں چانپانیر فتح ہوا، اس کی سرحد مالوہ سے ملتی تھی، اس لئے سلاطینِ مالوہ کی نظر ہمیشہ گجرات پر رہا کرتی تھی، اس خطرہ سے بچنے کے لئے اُس نے پہاڑ کے دامن میں ایک شہر محمدآباد بسایا، اس کو شہر مکرم کے لفظ سے نوازا اور یہی سکوں پر مسکوک کرایا، وہ موسم سرما جوناگڑھ میں، گرما احمدآباد میں اور برسات محمدآباد (چانپانیر) میں گذارتا، اس سے تبادلۂ آب و ہوا کے ساتھ سرحد کی حفاظت بھی مدنظر رہتی تھی۔

سلطان محمود بن لطیف خاں نے جب امیروں کی گرفت سے نجات پائی، تو اس نے احمد آباد کے بجائے محمود آباد کو پایۂ تخت بنایا۔ اس شہر کی بنیاد سلطان محمود اوّل نے چانپانیر کی فتح سے پہلے رکھی تھی، اور چند ہی دنوں میں، وہ بہت آباد اور پر رونق ہو گیا تھا، یہ احمد آباد سے بارہ کوس کے فاصلہ پر دا ترک ندی کے کنارے آباد کیا گیا تھا، سلطان محمود نے اس کو رونق دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس نے یہاں اچھے اچھے محل تعمیر کرائے۔ غیاث الدین سلطان مالوہ کی تقلید میں کئی کوس کا ایک آہو خانہ تیار کرایا، بہت ہی اعلیٰ درجہ کا باغ لگایا، آخر میں احمد آباد اور محمود آباد کو آبادی کے ذریعہ ملا دیا، احمد آباد سے سڑک نکال کر محمود آباد تک لے گیا۔ اور اس کے دونوں کناروں پر دورویہ مکانات تعمیر کرا کے ایک شہر بنا دیا، جس کا نام اس نے سکھ آباد رکھا،

تعمیرات

ان بادشاہوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اپنے پیش رو کی بنوائی ہوئی عمارتوں پر اضافہ نہ کیا ہو، سلطان احمد اوّل نے جب احمد آباد بسایا تو قلعہ کے علاوہ متعدد محلات تعمیر کرائے، ان میں سے ایک کا نام فرح بخش محل تھا، ان شاہی محلات کا سلسلہ بھدر سے سابرمتی تک چلا گیا تھا، احمد آباد میں جہاں آج کل پارسی کلب ہے اور اس سے لگا ہوا بھدر تک جو وسیع میدان ہے۔ اس میں شاہی محلات واقع تھے، اور آج گردش زمانہ سے کف دست میدان ہے۔ اسی سے متصل خان پور میں چاند محل اور سورج محل بھی تھے،

احمد شاہ اوّل نے اپنے عہد میں احمد آباد، احمد نگر، بالاسنور، سلطان پور، دوحد، سنکھیڑا، ھاتم وغیرہ میں قلعوں کے علاوہ محلات بھی تعمیرات کرائے۔ جن میں سے بعض آج بھی موجود ہیں، سلطان محمد شاہ نے اپنے باپ سلطان احمد کا مقبرہ اور شیخ احمد کھٹو

کا مزار، مدرسہ وغیرہ تعمیر کرا رہا تھا کہ وفات پا گیا۔ اور اُن کی تکمیل نہ ہو سکی، بعد میں سلطان قطب الدین نے اپنے باپ محمد شاہ کی نا مکمل عمارتوں کو تکمیل تک پہونچایا، اس کے علاوہ کانکریہ تالاب اور نگینہ باڑی کے پاس ایک محل پُر فضا جگہ پر بنوایا، جس کا نام کھارمنڈ دل تھا۔ اسی طرح کھیدپور متصل رسول آباد میں محلات کی تعمیر پر لاکھوں روپئے خرچ کئے،

سلطان محمود شاہ اوّل کے پچاس سالہ عہدِ حکومت میں محکمۂ تعمیرات اتنا بڑھ گیا کہ اُس کی تفصیل مشکل ہے۔ جب اُس نے مصطفےٰ آباد بسایا۔ تو قلعہ اور اُس کے باہر عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اور اُس کی دیکھا دیکھی امراے دولت نے بھی عمارتیں تعمیر کیں، مرأۃ سکندری نے اس کو تفصیل سے لکھا ہے اسی طرح محمد آباد (چاپانیر) کو دارالسلطنت بنایا تو محلات شاہی کے علاوہ مختلف دفاتر اور محکموں کے لئے بے شمار مکانات بنوائے امراء نے بھی اُس کی تقلید کی، اور ہر جگہ پُر فضا مکانات اور باغات لگائے، غرض احمد آباد، محمود آباد، محمد آباد، مصطفےٰ آباد، مظفر آباد (کتیانہ) دولت آباد (بڑودہ) کھنبایت، دھولکا میں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں، مظفر حلیم بہت ہی نیک دل، اور مذہبی بادشاہ تھا، اُس نے گجرات کے علاوہ مکہ مکرمہ میں ایک مسافر خانہ، ایک مدرسہ، ایک دارالاقامہ، اور عوام کے لئے ایک سبیل جاری کی۔

بہادر شاہ سے پہلے احمد آباد میں ایک کوشک تھا جس کا نام "بعد مدب"

تھا۔ چانپانیر میں ایک عالیشان قصر تھا جس کا نام دلکشا تھا، بہادر شاہ اکثر اسی محل میں رہتا تھا، اسی سے متصل ایک بہت وسیع اور عظیم الشان مکان تھا جس کو دربار کہتے تھے، غالباً اسی میں بادشاہ دربار کرتا تھا، اور غیر ممالک کے سفراء بھی اسی کی خدمت میں باریاب ہوتے تھے، اسی کے عہد میں ایک محل اور تھا جس کی عام طور پر بڑی شہرت تھی، اس کا نام سندگار منڈپ تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام در و دیوار مطلا و مذہب تھے، دیواروں اور دروازوں پر سونے کے پانی کا ملمع کر دیا گیا تھا، جس سے پورا مکان سنہرا نظر آتا تھا،

محمود ثالث نے محمود آباد میں دو میل لمبا جو آہو خانہ تیار کرایا تھا، اس میں متعدد قصر اور مختلف قسم کی عمارتیں بھی بنوائی تھیں، وہ اکثر اوقات انہی میں قیام کرتا، اسی عہد میں دریا خاں نے احمد آباد میں ایک عالیشان گنبد تعمیر کرایا تھا، یہ تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ میں اپنے طرز کی واحد اور بے مثل عمارت تھی، اس وقت تک گجرات میں جتنی عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں، وہ جینی طرز کی، اور سنگی ستونوں پر قائم کی جاتی تھیں مگر یہ ایرانی اور عربی طرز کا، اور پکی اینٹوں پر قائم کیا گیا تھا، چونکہ یہ طرز تعمیر گجرات کے لئے بالکل نیا تھا، اس لئے اس گنبد کی بڑی شہرت ہو گئی،

بعض مقامات میں جو عمارتیں بنیں، وہ اپنی خوبصورتی، دلآویزی اور شان و شکوہ میں بہت بے نظیر تھیں، مثلاً منگلور، کھنبایت، بھروچ، احمد آباد کی جامع مسجدیں، ہلتے مینار (مینار لرزاں) اچھوٹ کا کی کی مسجد، جالی کی

مسجد (کھجوری مسجد) رانی سپری کی مسجد، احمد آباد میں صناعی کے بہترین نمونے ہیں، ضلع پٹن کے موضع سمہ میں ایک ایسی مسجد تعمیر ہوئی تھی، جس میں بارہ برجوں کے لحاظ سے بارہ خانے بنائے گئے تھے کہ ہر ماہ چاند اپنے برج سے دکھائی دے عالمگیر کے عہد تک یہ مسجد موجود تھی یہ تو مسلمانوں کے تعمیری کارنامے تھے،

ہندوؤں نے جو قابل دید مندر مسافر خانے، خانقاہیں، بنائیں وہ ان کے علاوہ ہیں، ان کا احمد آباد میں گوپی چند کا محل دربار سے متصل بہت مشہور تھا۔

شاہجہاں نے بھی احمد آباد میں شاہی باغ کے ساتھ دریا کے کنارے جو محل تیار کرایا تھا وہ آپ اپنی نظیر تھا۔ جس کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے خاص احمد آباد میں پانچ سو پتھر کی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ اس سے گجرات کی تعمیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر میں عمارتوں کے متعلق تاریخ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے گجراتی بادشاہوں کی عمارتوں کے متعلق صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

گجراتی عمارتوں کی خوبیاں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں، شاہ حسین لنگاہ شاہ ملتان متوفی ۹۰۸ھ (۱۴۹۵) کو عمارتوں کا بڑا شوق تھا، اس نے ملتان کے ایک ممتاز عالم قاضی محمد کو سفیروں کے ساتھ گجرات روانہ کیا، کہ وہاں کی شاہی عمارتوں کو دیکھ کر آئیں، اور اسی نمونہ کی ملتان میں

(حاشیہ ص ۱۴۷) ۱؎ احمد آباد کی قدیم مسجدوں میں اکثر دو ہی مینار ہوتے تھے۔

عمارتیں تیار کی جائیں، قاضی صاحب نے سلطان کی اجازت سے شاہی محلات، باغات اور ہر قسم کے مکانات وغیرہ دیکھے، واپسی کے بعد شاہ نے وہاں کی عمارتوں کے متعلق دریافت کیا تو کہا کہ وہاں کی عمارتیں اتنی شاندار اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ کہ اگر اُن کی نقل کی جائے تو حکومت ملتان کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا، شاہ یہ سُن کر بہت مغموم ہوا، وزیر نے بادشاہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ دنیا کی تمام خوبیاں خدا نے ایک ہی ملک کو عطا نہیں کی ہیں، گجرات اور دکن کی زمین اگر زرخیز ہے تو ملتان کی زمین مردم خیز ہے، یہاں ایسے ایسے خدا رسیدہ بزرگانِ کرام علماء اور فضلاء پیدا ہوئے اور آج بھی موجود ہیں۔ جو دوسرے ملکوں کو نصیب نہیں، شاہ کو وزیر کی ان باتوں نے مطمئن کر دیا،

شاہجہان گورنر کی حیثیت سے احمد آباد میں عرصہ تک رہا۔ یہیں کی عمارتوں کو دیکھ کر اس کو عمارتوں کی تعمیر کا ذوق پیدا ہوا: اسی ذوق کا نتیجہ تاج محل ہے۔ اُس نے یہاں بھی دریا کے کنارے ایک شاہی باغ اور شاہی محل تعمیر کرایا تھا،

بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸) جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک مینار کو ہلایا جاتا تو دوسرا مینار بھی ہلنے لگتا تھا، بعض انگریز انجینیروں نے بہت کوشش کی لیکن دونوں میناروں کا تعلق معلوم نہ کر سکے، راقم الحروف نے آزمایا تو صحیح پایا، ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں اکثر مسجدوں کے مینارے گر گئے، اسٹیشن کے قریب شارع عام پر حبشی کی مسجد میں، ور (گومتی پور) پل کے پاس کی دو مسجدوں میں مینارے باقی رہ گئے ہیں،

محلات شاہی | ذیل میں شاہی محلات کے نام درج کئے جاتے ہیں، جو تاریخوں کے تلاش و تفحص سے معلوم ہو سکے ہیں:

(۱) محل کھید پور[1] متصل رسول آباد (احمد آباد) (۲) محل لب ساجستی جس کے دریچے دریا کے رُخ پر تھے[2] (۳) محل گدیو[3] (۴) کوشک سلطانی جس کا نام بھدرب تھا[4]، (۵) دربار جس کو بھدر بھی کہتے تھے[5] (۶) گھامنڈل (۷) محمود آباد میں لب دریائے واترک ایک محل تھا جس کو پشتہ محل کہتے تھے[6] (۸) سنگار منڈپ، جس کی دیوار اور دروازے مطلّا تھے، یعنی سونے کے پانی سے اُن پر ملمع کیا گیا تھا، جس سے پورا محل سنہرا نظر آتا تھا، یہ محل احمد آباد میں تھا[7]، (۹) کوشک سلطانی چانپانیر، (۱۰) محل دلکشا چانپانیر[8] (۱۱) کھم دھردل کا محل، کانکریہ حوض کے پاس تھا[9]، یہاں پہلے کولی آباد تھے۔ کھم دھردل گجراتی نہیں کولی زبان کا لفظ ہے[10]، (۱۲) محل کھانندرول متصل پیر د شاہ عالم احمد آباد[11]، (۱۳) چاند محل، (۱۴) سورج محل یہ دونوں خان پور احمد آباد میں تھے۔ یہاں آج کل پارسیوں کا قبضہ ہے، ان محلات کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے (۱۵) مرأۃ سکندری ص ۲۷۲ میں ایک محل کھمرو کا حوض کانکریہ کے متصل ذکر ہے، میرا خیال ہو کہ

---

[1] مرأۃ سکندری ص ۶۵ [2] ایضاً ص ۷۰ [3] ایضاً ص ۷۱ [4] ایضاً ۲۰۵ [5] ایضاً ص ۲۷ [6] ظفر الوالہ جلد اص ۴۹ [7] مرأۃ سکندری ص ۲۰۶ [8] ایضاً ص ۲۰۹ [9] ایضاً ص ۲۰۷ [10] مخطوطہ سارابھائی ہتہ ۱۱۶۱/۱۷۴۸ [11] ایضاً ص ۱۴۔

یہ کھم دھرول جس کو کاتب نے دل سے بدل دیا ہے۔ (۱۶) چاند محل (۱۷) سورج محل، یہ دونوں محمود آباد میں تھے، جن کی شہرت آج بھی اس شہر میں ہے۔ (۱۸) جونی محل محمود آباد میں تھا، سلطان محمود ثالث کی شہادت اسی محل میں ہوئی تھی[1]۔ (۱۹) سلطان محمود ثالث نے محمود آباد کے آہو خانہ میں جس کو آج کل اکھانہ کہتے ہیں، متعدد محل تعمیر کرائے تھے، جہاں شکار کے وقت تھک جاتا تو آرام کرتا،

سلاطین گجرات کے مقبرے گجرات کی تعمیری یادگاروں میں وہاں کے بادشاہوں کے مقبروں بھی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) سلطان مظفر اول	(سنہ وفات آخر ماہ صفر ۸۱۳ھ ۱۴۱۰ء) اس کا مقبرہ قلعہ انہل واڑہ پٹن کے اندر تھا جس کی ایک دیوار عبرت کے لئے باقی رہ گئی ہے، قبر کا کہیں پتہ نہیں ہے،
(۲) محمد شاہ تاتارخاں	(شعبان ۸۰۵ھ ۱۴۰۲ء) قلعہ قدیم پٹن کے اندر تھا۔ اس کا بھی آج کہیں پتہ نہیں ہے۔
(۳) احمد شاہ اول	(ربیع الآخر ۸۴۶ھ ۱۴۴۲ء) مانک چوک احمد آباد کا مقبرۂ شاہی جس کو آج

[1] ظفر الوالہ ص ۳۰۳ لندن

احمد شاہ کا خطیرہ کہتے ہیں،

(۴) محمد شاہ دوم

(محرم ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱) ایک مکمل مقبرہ مع گنبد اور ایک چھوٹی سی مسجد کے جو جنوب جانب ہے، مقبرہ سنگ خارا کا ہے اور تعویذ سنگ مرمر کی، نوبت ونقارہ آج بھی بجتا ہے، اور زیارتگاہ خلائق ہے،

(۵) قطب الدین احمد شاہ ثانی

(رجب ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸) احمد شاہ کے مقبرہ میں باپ کے داہنے جانب محمد شاہ اور دادا کے بائیں جانب قطب الدین دفن ہوئے، یہ تینوں قبریں وسط مقبرہ میں ہیں،

(۶) سلطان داؤد

(شعبان ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸) خانقاہ شیخ ادہن رومی کے قبرستان میں دفن کیا گیا، آج اس کا کوئی نشان نہیں،

(۷) سلطان محمود اول

(رمضان ۹۱۹ھ / ۱۵۱۳) سرکھیج (متصل احمد آباد) میں شیخ احمد کھٹو کے مقبرہ کے متصل تالاب کے کنارے مدفون ہوا، ایک گنبد والا مقبرہ ہے بہترین سنگ مرمر

	کا تعویذ ہے، جو لوگ شیخ احمد کھٹو کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں، اس مقبرہ پر بھی جاتے ہیں،
(۸) مظفر شاہ ثانی	(جمادی الثانی ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) سلطان محمود کی قبر سے متصل ایک مقبرہ میں دفن کیا گیا
(۹) سلطان سکندر	(شعبان ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) موضع ہالول (چانپانیر سے دس کوس دور) ایک گنبد کے نیچے دفن ہوا
(۱۰) نصیر خاں محمود ثانی	(۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء) سکندر کے قبر کے متصل اسی گنبد میں مدفون ہوا،
لطیف خاں بن مظفر	(ھ ء) اسی گنبد میں شہزادہ لطیف خاں بھی دفن ہوا۔ اسی میں تین دوسرے شاہزادوں کی بھی قبریں ہیں،
(۱۱) سلطان بہادر شاہ	(رمضان ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء) دیو کے پاس سمندر میں غرق ہوگیا، اور اس کی لاش نہ مل سکی،
(۱۲) سلطان محمود ثالث	(ربیع الاول ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء) سرکھیج میں محمود اول کا جو مقبرہ ہے اسی سے متصل مظفر کی، اور اس سے متصل محمود ثالث کی قبر ہے،

(۱۳) سلطان احمد ثالث (شعبان ۸۶۲ھ) اس کی قبر سلطان احمد اوّل کے مقبرہ مانک چوک میں ہے، سلطان احمد کے کٹہرہ کی شمالی جانب کی دیوار سے متصل (حسب تصریح ظفر الوالہ)

(۱۴) سلطان مظفر ثانی (۹۹۱ھ) اس کا سر کاٹ کر آگرہ بھیج دیا گیا تھا، اور لاش موربی (کاٹھیا واڑ) سے چند کوس دور دفن کی گئی۔

رانی روپ سنجری زوجہ سلطان محمود جس کا لڑکا محمد کالا تھا، ان دونوں کی قبریں مانک چوک میں "رانی کے حظیرہ" میں ہیں، حظیرہ آج بھی موجود ہے۔ اسی میں دوسری بیگمات کی بھی قبریں ہیں، اسی طرح استورۃ احمد آباد میں رانی سپرانی کا مقبرہ بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس کے لڑکے ابو بکر کی قبر بھی اسی میں ہے۔ مرزا پور احمد آباد میں پتھر کی جو مسجد ہے اس میں رانی کی قبر ہے، شاہی قبروں پر چتر بھی ہوتا تھا۔ ان کے اخراجات کیلئے اوقات بھی ہوتے تھے۔ زمانہ کے انقلاب سے اب کوئی وقف باقی نہیں ہے۔ شیخ احمد کھٹو کے مزار پر جو وقف ہے اسی کے متعلق محمود اوّل کا بھی مزار ہے۔ سلطان احمد اوّل کے مقبرہ کے لئے گورنمنٹ نے کچھ ماہانہ مقرر کر دیا ہے، اس کے علاوہ آس پاس کی دو دکانوں کا کرایہ آتا ہے۔ رانی کے حظیرہ کے آس پاس جو دکان ہے اس کا کرایہ اخراجات کے لئے کافی ہے۔

اور یہ ایک وقف کمیٹی کے ماتحت ہے۔[1]

شیدی سعید کی مسجد شیدی فارسی لفظ ہے جو اہل فارس حبشیوں کے لئے استعمال کرتے تھے، جیسے وہ عربوں کے لئے تازی اور ترکوں کے لئے تاجک کا لفظ استعمال کرتے تھے، لیکن شیدی ایک قسم کا لقب ہو گیا ہے، جو صرف حبشیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

حبشی گجرات میں کب آئے، اس کا صحیح پتہ مجھے تاریخوں سے نہیں چلا، احمد شاہ بانی احمد آباد سے سلطان محمود اعظم سبیگڑہ تک ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا، سلطان محمود کے عہد میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کے حرم میں ایک حبشن عورت تھی، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ کچھ مرد حبشی بھی بطور غلام کے رہے ہوں گے،

سلطان بہادر شاہ کے زمانہ میں ترکوں کے ساتھ حبشیوں کا بھی عروج ہوا، ہمایوں سے جو جنگ محمود آباد کے قریب ہوئی ہے اس کا سپہ سالار عماد الملک حبشی تھا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں حبشیوں کی فوج کتنی مرتب اور منظم تھی،

سلطان محمود ثانی کے عہد میں ان کو اور زیادہ ترقی کا موقع ملا، اور وہ ترکوں کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس زمانہ میں .... بحری بیڑہ ترکوں کے، اور توپ خانہ حبشیوں کے ماتحت تھا، محمود کے بعد احمد اور مظفر کے زمانہ میں سلطنت کے سارے

---

[1] یہ تمام تفصیلات مرآۃ سکندری، ظفر الوالہ، طبقات اکبری اور فرشتہ سے ماخوذ ہیں

کاروبار اور معاملات میں وہ اس قدر دخیل ہو گئے کہ جس طرف یہ جھک جاتے اس کا پلہ بھاری ہو جاتا، چنانچہ امراے گجرات کی خانہ جنگی میں انھوں نے بڑا حصہ لیا، اور گجرات کے بڑے بڑے علاقوں پر قابض ہو گئے، ان میں سے ایک سردار بلال جھوجھار خاں تھا، اُس کے مرنے پر اُس کے لڑکے کو بھی یہی خطاب ملا، یہی جھوجھار خاں ہے، جو شیدی کا بہت بڑا دوست اور رفیق تھا، اسی نے چنگیز خاں حاکم بھروچ کو قتل کیا تھا، جس کے قصاص میں اکبر اعظم نے نشہ میں ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روندوا کر مروا ڈالا۔

شیدی سعید | شیدی سعید کی ولادت غالبًا حبشہ میں ہوئی، اور وہاں سے غالبًا یمن میں آکر ترکوں کی فوج میں داخل ہوا، اور پھر مصطفٰے رومی خاں کے ساتھ گجرات آیا، رومی خاں کے چلے جانے کے بعد جہاں اور ترکی اور حبشی ملازم ہوئے، سعید بھی ملازم ہوا، آخر میں ترقی کر کے سلطان محمود کے مقرب ملازموں کے زمرہ میں شامل ہو گیا، اسی لئے اس کو شیدی سعید سلطانی کہتے ہیں،

سلطان محمود کی شہادت کے بعد حبشی سرداروں نے ملک کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ تو شیدی سعید نے جھوجھار خان کی رفاقت اختیار کر لی، ان دونوں میں پہلے سے دوستی تھی شیدی سعید ایک بہادر آدمی تھا، اور مختلف جنگوں میں بڑے کارہاے نمایاں انجام دے چکا تھا: وہ ان دو جنگوں میں بھی شریک تھا، جن میں سے ایک خود جھوجھار خاں سے

جوئی تھی، اور دوسری محمد الغ خاں سے جوئی تھی، ناصر جنگ نے اُس کی ذاتی قابلیت ہی کی بنا پر چنگیز خاں حاکم بھروچ کے پاس اس کو بطور سفیر کے بھیجا تھا، پھر اُس نے فوجی خدمت ترک کر دی، اور جھوجھار خاں کے ساتھ رہنے لگا، جس سے اس کے پہلے سے تعلقات تھے، اس نے شیدی سعید کو اپنا بھائی سمجھا، اور اس قدر آپس میں محبت بڑھی کہ اس کا وہ بڑا معتمد علیہ ہوگیا، جھوجھار خاں اور اس کے بھائی نے اس کی نیکی، وفاداری اور سعادت مندی کے پیشِ نظر پچاس لاکھ ٹنکہ کی آمدنی کا ایک گاؤں اس کو دیا، اور وظیفہ علیحدہ مقرر کر دیا، شیدی سعید نے اس کے بعد بڑے کارِ خیر انجام دیئے،

شیدی کے سعید کام | شیدی سعید، بڑا صالح، نیک دل اور فیاض تھا، اس کے مشیر بھی اچھے تھے، اس نے اپنی دولت اپنے عیش و عشرت پر صرف نہیں کی، بلکہ غریبوں کے لئے مکانات بنوائے، حاجتمندوں کے لئے روزینے مقرر کئے، غلاموں کی مدد کی، اور مسکینوں کی ضرورتیں پوری کیں، اس نے ایک مسجد تعمیر کی جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، اس کے ساتھ ایک لنگر خانہ بھی قائم کیا، جس میں دشیشہ پکا کر لوگوں کو کھلایا جاتا، دشیشہ ایک قسم کی غذا ہے، جو گیہوں بھگو کر اور کوٹ کر پکاتے ہیں،

اس کے زمانہ میں غیر ملکیوں کے حملوں اور خانہ جنگی کی وجہ سے بیکاری، بے روزگاری، اور افلاس بہت بڑھ گیا تھا، خصوصًا متوسط سفید پوش لوگوں کا بہت پریشان حال ہوگیا تھا، شیدی نے اس لنگر خانہ میں ان سب لوگوں

بند و بست کیا، اور مفت کھانا کھلانا شروع کر دیا، جس کا خرچ رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا کہ بیس من گجراتی بھیگ منگے فقیروں کے لئے، اور بیس من سفید پوش غریبوں کے لئے پکتا، اس کا چوتھائی پانچ من الگ ایک مکان میں پکایا جاتا جو لنگر خانہ سے قریب تھا، جو لوگ آجاتے، ان کو وہیں دسترخوان بچھا کر کھلا دیا جاتا، اور باقی گھر گھر الگ الگ تقسیم کر دیا جاتا[۱]

خورشیدی کے دسترخوان پر دونوں وقت شرفاء کی جماعت بیٹھتی، جس میں حضرم (یمن کا ایک صوبہ) کے شرفا شہر کے علماء ارباب تصوف اور مخلص احباب بھی شامل ہوتے، مخصوص مصاحبوں کے لئے الگ دس من روزانہ مقرر تھا، خصوصیت کے ساتھ شیدی تارک الدنیا، اور گوشہ نشین لوگوں تک کھانا پہنچانے کی کوشش کرتا[۲]

سردی کے موسم میں صاحب حیثیت لوگوں کو بطور تحفہ قبائیں دیتا اور اکھڑ اور غوبار کو تقسیم کرتا، اس کا یہ دستور اکبر کے احمد آباد فتح کرنے تک برابر جاری رہا،

وہ زیادہ تر علم و فضل والوں کے ساتھ صحبت رکھتا، اس کی مجلس میں

---

[۱] آج بھی ایک مندر کے مہاراج یا متولی کی طرف سے جالن پور دروازہ کے باہر ایک لنگر خانہ کھلا ہے، جہاں ہزاروں آدمیوں کے علاوہ ایک ہاتھی کی خوراک بھی روزانہ ملتی تھی، اس لنگر کے کھانے والوں میں سادھوؤں اور سنتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے،

[۲] ظفر الوالہ جلد دوم، لندن،

بہترین آدمی جمع ہوتے اور انہی اصحابِ فضل و کمال سے اُس نے مختلف علوم و فنون حاصل کئے، اس کی علم نوازی ہی کا نتیجہ تھا کہ شیخ حمید بن قاضی عبداللہ سندھی محدث وقت نے جامع حمیدی کی تبویب ختم کی، تو اس کو سعیدی کے نام معنون کیا، اور اس کا نام جامع سعیدی فی تبویب الحمیدی رکھا۔

کتب خانہ | انہی بزرگوں کے فیضِ صحبت سے اس کو کتابوں کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اُس نے بڑی کوشش سے ایک کتب خانہ قائم کیا، شہر میں جس قدر کتابیں مل سکیں، وہ سب جمع کیں، پھر کتابوں کے اکٹھا کرنے کے لئے اُس نے ایک جہاز ٹھیک کر کے مصر روانہ کیا، اور اس کے ناخدا خواجہ سلامت اللہ شاطر مغربی کو ایک فہرست دی کہ اس کے مطابق کتابیں خرید کر اور اس جہاز پر لاد کر لائیں، یہ جہاز کتابوں کو لیکر جب گھوگھہ بندر (کاٹھیاواڑ) پہونچا تو بدقسمتی سے طوفان آ گیا، اور جہاز نے کروٹ لے لی جس کی وجہ سے کتابیں ضائع ہو گئیں، اُن میں سے جو بچ سکیں، وہ کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں، اکبر کے فتح احمد آباد کے بعد تاریخوں میں اس بیش قیمت کتب خانہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا،

ظفر الوالہ کا مصنف آصفی اس کی مہربانیوں کا بڑا معترف ہے، وہ لکھتا ہے کہ شیخ شیدی سعید مجھ پر بڑا مہربان تھا، اور میرے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا، اس نے شیخ کی تعریف میں ایک عربی نظم لکھی ہے جس کے پانچویں مسجد کے بنا کی تاریخ نکالی ہے،

وہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے بہترین آدمی تھا، بیحد مخیر، فیاض، اور بلند اخلاق تھا اور بڑے شان و شکوہ سے رہتا تھا، بیس سے زیادہ اس کے حبشی غلام تھے، ایک سو نوکر تھے تمیں گھوڑے، دس اونٹ، اور پچاس بیل تھے، جو بہل اور بار برداری کی گاڑیوں میں استعمال ہوتے۔ اپنے علاقہ کا اس قدر بہترین انتظام کیا کہ اُس کی آمدنی دوگنی ہوگئی تھی، وہ ظاہر کا بھی امیر تھا، اور اپنی نیکیوں سے باطن کا بھی،

وہ اپنے ابنائے جنس یعنی حبشیوں کا خصوصیت کے ساتھ بڑا خیال رکھتا تھا، اس کا یہ غیر معمولی عروج دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوگیا، اور یہ دیکھ کر کہ جھوجھار خان جیسا آدمی اس کا ادب کرتا ہے، وہ جل گئے، آخر میں جھوٹے بہتان لگا کر دونوں امیروں کو آپس میں لڑا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جھوجھار خان نے اپنے تمام گاؤں واپس لے لئے اور اتنا شدید اس میں جذبۂ انتقام پیدا ہوا کہ قتل تک کی دھمکی دے دی،

اس کا ستارہ پھر فوراً ہی اوج پر آگیا، کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الغ خان نے اُس کو اپنی وکالت میں لے لیا، اور جھجھار خاں سے کہیں بہتر گانوں اس کو بخش دئے،

اس کی منجملہ نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ تھی کہ اپنے جہاز پر اپنے ساتھ ایک جماعت کو حج کرانے کے لئے لے گیا، انہی کے ساتھ مدینہ منورہ کی بھی زیارت کی، اور حرمین میں بہت سے کام انجام دیئے، اکبر بادشاہ نے احمد آباد فتح کیا تو اُس کے تیسرے سال حکومت کی طرف سے امیر حج بنا کر بھیجا گیا، حج

سے واپس آیا تو ۳۰ر شوال ۹۸۰ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۵۷۲ء دوشنبہ کے دن احمد آباد میں اس کا انتقال ہوگیا، اور اسی مسجد میں جو اُس نے بنوائی تھی اور جس کا ذکر آگے آرہا ہے، دفن کیا گیا، اس کا آخری نیک عمل یہی حج تھا[1]

جالی والی مسجد یہ مسجد بہت قدیم اینٹ کی بنی ہوئی شیدی سعید کے مکان سے متصل تھی جس کو ایک مجذوب شیخ اتن نے بنوانا شروع کیا تھا کہ وفات پا گئے، اور اسی مسجد میں دفن کئے گئے۔ اُن کے بعد شیخ سعید اس کے متولی ہوئے، اور انھوں نے بھی اس کی تعمیر جاری رکھی، اُن کا جب انتقال ہوا، تو وہ بھی اسی میں دفن کئے گئے۔ شیخ سعید نے اس کی بنیاد بہت مضبوط اور بلند کردی، اُس کی چھت قبہ نما بنوائی، پتھروں کی جالیاں خاص اہتمام سے بنواکر اس میں لگوائیں، مسجد کو پہلے سے زیادہ نہ صرف وسیع کردیا، بلکہ آس پاس کی تمام زمینیں بھی خرید کر مسجد میں شامل کردیں، صحن کے ساتھ ایک چبوترہ بھی بنوایا، اور اس کے داہنے طرف اپنے لئے پتھر کی قبر بنوائی، وہ اس سے فارغ ہی ہوا تھا کہ پیامِ اجل آپہنچا[2] اور مسجد نامکمل رہ گئی،

مسجد کی جائے وقوع اور اس کا طول وعرض قلعہ سے کچھ ہی فاصلہ پر لال دروازہ سے متصل یہ مسجد واقع ہے، یہ شیدی سعید کی مسجد کہلاتی ہے عمارت کی حیثیت سے اُس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ طول میں ۴۰ اور عرض میں ۳۷ فٹ ہے، پہلے زمانہ میں ہندوؤں کے مندر کی طرح

---

[1] ظفر الوالہ جلد دوم لندن [2] ایضاً

آٹھ گوشے بنا کر اُن پر گنبد بنانے کا رواج تھا، اس میں کمانوں کے او
گنبد بنا کر سائبان بنایا گیا ہے، ایک ایک ستون پر چار چار کمانیں
رکھی ہیں، مینارے آٹھ گوشیے اور سادے ہیں، زینہ کی دیواروں پر
نقش ونگار بنا ہوا ہے، ساری دنیا میں اُس کی شہرت کا سبب اس کی
حسین وجمیل جالیاں ہیں، جن کی کہیں مثال نہیں ہے، بعض جالیوں پر درخت
اور پتیوں کی تصویریں ہیں، جو بہت خوبصورت اور نادر اور احمد آباد
اور گجرات کے آثار قدیمہ کے لئے باعثِ زینت ہیں، یہ درخت او
پتیاں اس تناسب اور خوبی کے ساتھ نقش کی گئی ہیں کہ ایک چھوٹے
سے باغ کا منظر بن گیا ہے۔ کھجور اور ناریل کے درختوں کی پتیاں
اس نزاکت سے بنائی گئی ہیں کہ انسان انھیں دیکھ کر انگشت بدندان
رہ جاتا ہے،

اس کے متعلق غیر ملکیوں کی رائیں

مسٹر ہوپ نے لکھا ہے کہ دنیائے مشرق میں ان
کی کوئی مثال نہیں ملتی، فرگوسن کا بیان ہے کہ
دہلی اور آگرہ کہیں بھی ایسی جالیاں نظر نہیں آئیں، ازمنۂ وسطیٰ میں جو
یونان وغیرہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، زار روس اپنی شاہزادگی کے زمانہ
میں جب احمد آباد آیا تو اُس نے ان جالیوں کو دیکھ کر کہا کہ ان میں مختلف
درختوں اور اُن کی پتیوں کو اس حسن ونزاکت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ ان کو
دیکھ کر لوگ گرد آباد اور ریگستان کو بھول جاتے ہیں[1]، حالانکہ اس وقت احمد

[1] جہانگیر نے احمد آباد کا نام گرد آباد رکھا تھا،

دنیا ویران ہوگیا تھا، اور اُس کی ساری رونق ختم ہوگئی تھی۔ سرجان
مارشل جیسا نکتہ چیں بھی اقرار کرتا ہے کہ یہ مسجد اپنی خوبصورت جالیوں کی
وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے، خصوصًا اس کی دو جالیوں میں پھول،
پھل، درخت اور بیل کا جیسا خوبصورت نقش و نگار کہیں دوسری جگہ
دیکھنے میں نہیں آیا، فرگوسن نے کہا کہ یہ مصنوعی نہیں بلکہ اصلی معلوم ہوتا ہے
ان کا بنانے والا اپنے فن کا ماہر بلکہ موجد تھا۔ اس نے اپنے دماغ اور
اپنی فکر سے نئے نئے نقشے بنائے، اور اُن کو عمل میں لایا، اُس نے پتھروں
پر اس طرح طرح طرح کے نقش و نگار بنائے ہیں کہ گویا وہ پتھر پر نہیں کپڑے
پر بنے ہیں ان میں زرگر، مصور، سنگتراش، معمار، نجار سب کی روحیں
جمع ہوگئی ہیں، اس کا نمونہ پہلے لکڑی کے تختہ پر بنایا گیا، جس پر ایک ہزار
خرچ ہوا پھر اس نمونہ کو پتھر پر اُتارا گیا، لندن اور نیو یارک کے عجائب خانوں
میں اس کی نقلیں موجود ہیں، اس زمانہ میں اس نقش و نگار کی نقل فرنیچر
میں بھی کرنے لگے تھے، سچ یہ ہے کہ یہ نقش و نگار اس وقت کے باکمال
اور ماہر کاریگروں کا ایک معجزہ ہے[1]۔

مرہٹوں کے زمانہ میں قلعہ بھدر کے قریب ہونے کی وجہ سے اگرچہ
اس کی عمارت کو سخت نقصان پہونچا، مگر خوش قسمتی سے اصل مسجد بچ گئی، اور
اس کو کوئی ضرر نہیں پہونچا،

فرگوسن سے لے کر ۱۹۴۲ء تک جن لوگوں نے اس کے حالات لکھے ہیں

---

[1] نگار جنوری ۱۹۵۳ء،

ان میں بعض ایسی باتیں ہیں، جن سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، اُن کا ازالہ اس موقع پر بہت ضروری ہے، اُن میں سے ایک نے لکھا ہے کہ احمد شاہ کے شیدی غلام نے پندرہویں صدی کے نصف اوّل میں یہ مسجد بنوائی، فرگوسن صاحب نے اس کی کمانوں کو دیکھ کر یہ گمان کیا کہ محمود اعظم کے عہد یعنی پندرہویں صدی کے آخر میں تعمیر ہوئی، ان لوگوں کے سارے قیاسات غلط ہیں، اس کو درحقیقت مشہور امیر جھوجھار خاں کے ہم قوم اور دوست شیخ سعید نے ۹۸۰ھ، ۱۵۷۲ء میں تعمیر کرایا تھا[1]،

اس میں صرف دو جالیاں ہیں، اور وسط میں کوئی جالی نہیں ہے، اس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ برطانوی عہد میں ایک انگریز بیچ کی جالی نکال کر لندن لے گیا اور یہی مشہور ہے، ایک روایت ہے کہ اس کے کسی متولی سے کسی امریکن نے خرید کر اس جالی کو نیویارک (امریکہ) بھیج دیا، لیکن ان باتوں میں کوئی صداقت نہیں ہے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسجد شیدی سعید کی اچانک وفات کی وجہ سے نامکمل رہ گئی، چنانچہ جس طرح وسط کی جالی بننے سے رہ گئی، اسی طرح جنوب کی طرف کی اندر کی کمانیں بھی نامکمل رہ گئیں، بدقسمتی سے جھوجھار خاں اور شیدی سعید میں نفاق ہوگیا اور جھوجھار خاں نے شیخ سعید سے وہ گاؤں واپس لے لیا جس کی آمدنی اس مسجد کی تعمیر اور اس کے بے نظیر نقش و نگار کے بنانے پر صرف ہو رہی تھی، گو الغ خاں نے اس کی تلافی کی، اور اس سے بہتر گاؤں

---

[1] کارجنوری ۱۹۵۲ء ص ۵۲ ایضاً،

اس کو دیدیئے، مگر اکبر اعظم کی فتح گجرات سے ایسا انقلاب آیا کہ گجراتی پھر سنبھل نہ سکے، الغ خان کی تمام جاگیر ضبط ہوگئی اور اسی میں شیدی سعید کے یہ گاؤں بھی سرکاری قبضہ میں چلے گئے،

مسجد کی موجودہ حالت

مرہٹوں اور انگریزوں کے ابتدائی عہد میں اس مسجد کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی، اس میں چونا وغیرہ لگا کر بہت گندہ کر دیا گیا تھا۔ انگریزوں نے اس کو لاوارث سمجھ کر اس میں "معاملت دار کی عدالت" قائم کر دی، اور ایک سرکاری محکمہ کا دفتر بنا دیا، عرصہ تک وہ اسی حالت میں رہی۔

لارڈ کرزن کو آثارِ قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی، وہ جب وائسرائے مقرر ہو کر ہندوستان آیا، تو اُس نے "آثارِ قدیمہ" کے نام سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا، اور اس کے قانون کے رو سے مسجد عدالت اور دفتر سے خالی خالی کرالی گئی، اور اس کی حفاظت کا باقاعدہ انتظام کیا گیا،

ابھی چند سالوں سے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے تحت سنی وقف بورڈ نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اُس نے مسجد کے لئے امام، موذن، وغیرہ مقرر کئے، وضو کے لئے پانی کا حوض اور روشنی کا انتظام کیا، اب یہ آباد ہوگئی ہے، اور پانچوں وقت باجماعت نماز ہونے لگی ہے۔

اس کے آس پاس کی زمین جو گورنمنٹ نے لے لی ہے، اگر وہ واپس مل جاتی، تو اُس کی آمدنی سے مسجد کی مرمت اور دوسری

ضروریات پوری کی جاسکیں،

آصفی نے اس مسجد کی تاریخ کہی ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:-

عمّروا لجامع لِلّٰہ

عا مرجاء سعیدٌ

صرف اللہ کے لئے اس نے مسجد بنائی، بنانے والا سعید آیا۔[1]

---

[1] ظفر الوالہ جلد دوم لندن،

فنونِ لطیفہ

گجرات میں اس دور کی نقاشی و سنگ تراشی کے نمونے اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے، شاہوں کے محلات، وزیروں کے عشرت کدے، امیروں کی حویلیاں، اور ارکینِ دولت کے قصر و ایوان تو اب باقی نہیں رہے لیکن اس زمانہ کی مسجدیں، مقبرے اور مندر موجود ہیں جن سے اس دور کے مذاقِ تعمیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مساجد میں احمدآباد کے قلعہ کی مسجد جو اس وقت گجرات کلب کے عقب میں ہے، جامع مسجد جو مانک چوک میں ہے اور شکر خاں کی مسجد جو کالوپور میں واقع ہے، قابلِ دید ہیں، استوریہ کی چھوٹی سی مسجد اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے' لال دروازے کے باہر کھوریہ کی (جالی والی) مسجد اپنی صناعی اور نقش و نگار کے لیے شہرۂ آفاق ہے، مرزاپور کی عالی شان مسجد فنِ تعمیر کے لحاظ سے غیر ملکی ماہرین کے لئے ہمیشہ باعثِ کشش رہی ہے۔

احمدآباد سے باہر محمودآباد، دھولکہ، احمد نگر، چانپانیر، جوناگڑھ وغیرہ

یں جو عمارتیں ہیں، وہ آپ اپنی نظیر ہیں، یہ چند عمارتیں بطور مثال کے پیش کی گئی ہیں، ورنہ مصنف مرأۃ احمدی علی محمد خاں کے بیان کے مطابق تو صرف احمد آباد میں پتھر کی پانچسو مسجدیں تھیں،

مقابر میں شیخ احمد کھٹو ی کا مقبرہ سرکھیج میں آج تک ماہرین فن کی نگاہوں کا مرکز ہے، اور اس فن کے طالب علم آج بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، شہنشاہ جہانگیر کا تخمینہ ہے کہ اس مقبرہ کی تعمیر پر پانچ لاکھ روپیے صرف ہوئے ہیں[۱]، حضرت شاہ عالم کے مقبرہ کے علاوہ دریا خاں کے مقبرہ کا گنبد تمام گجرات کی عمارتوں میں ممتاز ہے، سرکھیج میں محمود اول کے مقبرہ پر سنگِ مرمر کا جو کام ہوا ہے، وہ اپنی ندرت و باریکی کے لحاظ سے بہت پرکشش ہے۔ جامع مسجد احمد آباد کے شہ نشیں پر جو سنگِ مرمر کی محراب ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں کی ہر مسجد میں مصلّے کے پاس جو سورج مکھی بنی ہوئی ہے، وہ بھی نقش و نگار کا عجیب و غریب نمونہ ہے، اس زمانہ کی قبروں پر سورج مکھی کی تو بہت کم لیکن قندیل کی شکل بہت زیادہ سنگ مرمر کی بنی ہوتی ہے، صناعی کے لحاظ سے وہ بھی عجیب چیز ہے،

گجرات اور کاٹھیاواڑ میں اس عہد کے بے شمار مندر ہیں، جن کا طرز تعمیر جینی ہے، مغلیہ سلطنت سے پہلے گجراتی بادشاہوں کے عہد میں پتھر کی جتنی بھی عمارتیں بنی ہیں، وہ سب جینی طرز کی ہیں، جو اُن کو بہت مرغوب تھا، حالانکہ اُن کے سامنے عربی و ایرانی طرز کے نمونے تھے۔ اور عرب و عجم میں ان

---

[۱] ترک جہانگیری جشن دوازدہم بیان احمد آباد،

فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے، اگر وہ چاہتے تو اُن کو بلوا کر کام لے سکتے تھے، جیسا کہ سلطان محمود اوّل نے شروع میں باغبانی کے سلسلہ میں ایک ایرانی ماہر فن سے مدد لی تھی، لیکن انھوں نے تعمیرات میں اُن کے مقابلہ میں جینی ہی طرز کو ترجیح دی، اور اسی طرز کی عمارتیں بنوائیں، جو اس زمانہ میں احمد آباد میں رائج بھی تھا، اور وہ بتدریج گجرات کا طرزِ تعمیر بن گیا تھا، جیسا کہ احمد شاہ اوّل نے قلعہ بھدر (احمد آباد) پٹن کے طرزِ تعمیر کے مطابق بنوایا تھا۔

سنگتراش، معمار، منبت کار، مسلمان اور ہندو دونوں ہوتے تھے، چنانچہ احمد آباد کے گنیش رام اور کڑہی کالانا، نامی سنگتراش اپنے عہد کے مشہور سنگ تراش تھے[1]۔

فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ مصوری ہے لیکن ہم کو سلاطینِ گجرات کے عہد کی کوئی تصویر نظر نہیں آئی۔

موسیقی | اس کی دوسری شاخ موسیقی و رقص ہے۔ اور قدرتاً انسان اس کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتا ہے، اور روح کو اس کی طرف بڑی کشش ہوتی ہے، انسان تو انسان لایعقل حیوان بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، تقریباً دنیا کی ہر قوم کے لوگوں نے کسی نہ کسی شکل میں اس سے اپنی دلچسپی اور شغف کا اظہار کیا ہے، اور ہر جگہ اور ہر قوم میں آپ اس کا رواج پائیں گے، سلاطینِ گجرات کے عہد میں اس کا بڑا رواج تھا۔ اور خود اُن کو بھی اس سے بڑا شغف اور اشتغال تھا۔

---

[1] کتبات بڑودہ ص ۹۔

سلطان احمد اوّل کے زمانہ میں ایک مشہور اور مقدس بزرگ حضرت شیخ احمد کھٹو ی تھے، جن کو سماع کا بڑا ذوق تھا، اور ان کے یہاں قوالی خوب دھوم دھام سے ہوتی تھی، سلطان محمود اوّل کے زمانہ میں اس کو بڑی ترقی ہوئی، اور مختلف قسم کے آلات موسیقی تیار ہونے لگے، چنانچہ خاص سلطان محمود کے لئے ایک استادِ فن نے ایک رباب تیار کیا تھا، مظفر حلیم گجراتی ملایانہ طبیعت رکھتا تھا، مگر موسیقی سے اس کو اس قدر دلچسپی تھی کہ لوگ دیکھ کے متحیر ہو جاتے تھے، وہ خود بھی علم موسیقی کا بڑا ماہر تھا، رباب، جنتری، چترواٗ، سرمنڈل خوب بجاتا تھا، اور استادانِ فن اس کی استادی اور مہارتِ فن کا لوہا مانتے تھے، اس کے پاس "بانی چھا" ایک مشہور رقاصہ (پاتر) تھی اور موسیقی کی بڑی رازداں شناس، مظفر حلیم کے حکم سے ایک مرتبہ سرستی پارٹ اسی نے ادا کیا تھا، جس کو ماہرینِ فن نے بہت پسند کیا تھا،[۱]

سلطان بہادر کے عہد میں اس فن کو اور زیادہ عروج ہوا خود اس کو اس سے بڑی رغبت تھی، جشن میں بلکہ خلوت کی محفلوں میں بھی منتخب روزگار گویے اور موسیقار، اور پری جمال رقاصائیں موجود ہوتیں،

اس عہد کے مشہور گائین اور استادِ فن میاں منجھو تھے، جن کے سحر آفریں نغموں سے بہادر شاہ اس قدر مسحور تھا کہ میدانِ جنگ میں بھی ان سے علیحدگی پسند نہیں کرتا تھا، ہمایوں کی جس جنگ میں بہادر شاہ کا پانسہ پلٹ گیا، اور مصطفےٰ خاں رومی افسر توپ خانہ کی بروقت غداری سے ہمایوں نے فتح پائی

---

[۱] مرآۃ سکندری ص ۱۱۱، ۱۵۲، ص ۹، بمبئی،

ہوگیا، اس میں بھی میاں منجھو بہادر شاہ کے ساتھ تھے، جنگ ختم ہونے کے بعد ایک مغل نے ان کو گرفتار کرلیا، اور قریب تھا کہ اُن کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے کہ ہمایوں کو خبر ہوگئی، اور اس نے ازراہِ قدردانی ان کو اپنے مصاحبوں میں شامل کرلیا،

میاں منجھو کی جادو اثر موسیقی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ہمایوں کے مقابلہ میں گجراتیوں کو شکست ہوگئی، اور مغل رسم کے مطابق ہمایوں نے خونی لباس پہن لیا۔ اور قتل عام شروع کرادیا تو میاں منجھو اسی حالت میں اس کی خدمت میں باریاب ہوئے، اور اس کی فرمایش پر موسیقی کی ایسی تان کھینچی کہ ہمایوں بیخود ہوگیا، اور اس کے قدموں پر نثار ہونے لگا، اور فوراً سرخ لباس تبدیل کردیا۔ اس کے بعد منجھو نے اپنے ہزاروں گجراتی ہم وطنوں کو اپنا رشتہ دار ظاہر کرکے، اُن کی جان بچائی۔ ہمایوں نے میاں منجھو کی بڑی قدردانی کی، اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کے مصاحب اور ہم جلیس ہوگئے، لیکن اُن کا دل ان خونی مغلوں میں نہ لگا، اور بھاگ گئے، بہادر شاہ ان کا اتنا قدردان تھا کہ وہ جب اس کے یہاں پہنچے ہیں تو بہادر شاہ نے کہا کہ میاں منجھو تم مجھے مل گئے، تو سمجھو کہ گجرات کی سلطنت واپس مل گئی۔[1]

دریا خاں محمود ثالث کا بہت با اختیار وزیر تھا، لیکن وہ جس قدر فیاض اور صاحب تدبیر تھا، اسی قدر عیش پرست بھی تھا، وہ عیش و عشرت کی

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۲۴۹،

طرف اتنا راغب ہوا کہ کاروبار سلطنت تک سے غافل ہوگیا، اس کے عہد میں گھر گھر موسیقی کا چرچا ہوگیا تھا، اس کے دربار میں بے مثال خوبصورت عورتیں جمع ہوگئی تھیں، چا نپا نیر میں جب اُس کو آخری شکست ہوئی ہے تو گرفتار ہونے والوں میں پانچسو پری تمثال اور خوبصورت گانے والی عورتیں تھیں، اس سے اس فن سے اُس کے شوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے جشن کا دربار اتنا شاندار اور پُر رونق ہوتا تھا کہ وزراء تو الگ رہے، گجراتی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوا،[۱]

اس کے عہد میں اس فن کے بڑے بڑے ہندو اور مسلمان ماہر جمع ہوگئے تھے، اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں :-

(۱) نایک ابھو (۲) نایک گوپال (۳) نایک حسینی (۴) نایک بخشو (۵) رنگ خان (۶) مہی (۷) نایک چنیر (۸) کھیم ہرمن (۹) موہن راؤ (۱۰) جنگ راؤ (۱۱) دیسی راؤ (۱۲) کھنور،

خیال کرنے کی بات ہے کہ جہاں پانچ پانچ سو پاتریاں (رقاصائیں) ہونگی وہاں گویوں کا کیا حساب ہوگا، مندرجۂ بالا نام منتخب روزگار استادان فن کے ہیں، جن کے کمال فن کی اتنی شہرت ہوئی کہ ان کا نام کتابوں میں آگیا، اُن کے علاوہ ہزاروں ایسے ہوں گے جو بیچارے اس فن کی داد دے کر گمنام دنیا سے چل بسے،

حضرت شاہ وجیہ الدین گجرات کے ایک بہت برگزیدہ بزرگ اور

---

[۱] مرأۃ سکندری ص ۶۹ - ۲۲۸،

شیخِ وقت تھے، اُن کے تلامذہ، اور مسترشدین مالوہ، خاندیس اور تمام دکن میں پھیلے ہوئے تھے، اس بزرگی اور جلالت کے باوجود، جب حضرت غوث محمد گوالیاری احمدآباد تشریف لائے، تو اُن سے بیعت کر لی، اس تقریب سے احمدآباد میں گوالیار کے لوگوں کی بہت زیادہ آمد و رفت شروع ہو گئی،

احمدآباد تجارت، صنعت و حرفت اور طرح طرح کی کاریگری کا بھی مرکز تو تھا ہی، علوم و فنون کا بھی بہت بڑا مرکز ہو گیا، اور فنِ موسیقی کے بڑے بڑے ماہر وہاں جمع ہو گئے، کیا عجب ہے کہ اکبرِ اعظم کا مشہور مغنی تان سین، اسی سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوا ہو، اور یہاں سے دلی گیا ہو،

گجرات کے آخری بادشاہ مظفر کے عہد کا موسیقار اور شاعر ایک شخص کوتہ نامی تھا، اس کی لڑکی لال کور بہترین رقاصہ اور بڑی باکمال گاین تھی، اُس نے اپنے باپ کے فن میں، اپنی طرف سے کچھ چیزیں ایجاد کر کے اضافہ بھی کیا، ۹۶۳ھ ۱۵۴۸ء میں الغ خاں نے اس سے شادی کر لی، اس کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، احمد خاں اور جمال خاں، گجراتیوں نے اس فن میں جو کمال حاصل کیا، اس کا ذکر کتابوں میں موجود ہے[۱]،

دکن کی ریاستوں میں جو اس کا رواج ہوا تو اُس کے باعث درحقیقت گجرات ہی کے لوگ تھے، جو مغلوں کے فتحِ گجرات کے بعد منتشر ہو کر دکن

---

[۱] ظفر الوالہ جلد دوم ص ۵۰۴، لندن؛

پہنچ گئے تھے، اسی طرح گجرات کے علماء اور صوفیہ کا بھی وہ مرجع ہوگیا تھا،

گجرات کا ایک مشہور "رقص گربا" ہے، جس پر ایک مفصل مضمون آجکل[1]

دہلی میں پروفیسر ظہیر الدین مدنی سورتی ایم اے کے قلم سے شائع ہو چکا ہے، جس کو ذوق ہو، وہ اس کا مطالعہ کر سکتا ہے، ہم اس کو یہاں بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں، یہ درحقیقت ہندوؤں کا ایک مذہبی ناچ تھا جس کا سلاطینِ گجرات کے عہد میں بڑا رواج تھا، اور وہاں کے مشہور تہوار نوراتری کے موقع پر ہوتا تھا،

---

[1] ماہنامہ آجکل دہلی نومبر ۱۹۵۰ء،

علوم و فنون

کسی ملک کی شہرت اور نیک نامی کا تمام تر دار و مدار علوم و فنون کی ترقی پر ہے، اسی وجہ سے جس بادشاہ کا دربار اہل علم سے بھرا رہتا تھا، اس کا بڑا نام ہوتا تھا، چنانچہ آپ کو ہر بڑے فرمانروا کے دربار میں اہل علم نظر آئیں گے اور سچ پوچھئے تو یہی لوگ کسی سلطنت یا بادشاہ کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دلاتے ہیں، اور دنیا میں ان کا نام روشن رکھتے ہیں، اگر بکرماجیت کے نورتن نہ ہوتے، تو بکرماجیت کو کون جانتا، اسی طرح ابوالفضل اور فیضی کی بدولت اکبر کو شہرت حاصل ہے۔

گو گجرات کے بادشاہوں کا دربار بھی علماء اور فضلاء سے بھرا رہتا تھا، اور بڑی بڑی اہم کتابیں ان کے دور میں تصنیف و تالیف ہوئیں، مظفر شاہی، احمد شاہی، محمود شاہی، بہادر شاہی، ظفر الوالہ وغیرہ تاریخ کی کتابیں اسی عہد کی یادگار ہیں، شفائے قاضی عیاض کا اسی عہد میں ابن فراش نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا، اسی طرح ابن خلکان کا ترجمہ یوسف بن احمد بن عثمان نے کیا،

واگ بھٹ کی کتاب اشٹانگ رُدی کا ترجمہ فارسی میں علی محمد بن اسماعیل اساولی
کے ذریعہ ہوا، مشکوٰۃ شریف کو مولٰنا عبدالمومن بن شیخ عبدالوہاب
نے فارسی کا جامہ پہنایا، حصن حصین کو بھروچی نے فارسی میں تبدیل کیا، تصوف
میں لوائح اور جام جہاں نما کی شرح شاہ وجیہ الدین نے کی، لغت کی مشہور کتاب
قاموس کے خطبہ کی شرح قاضی علاء الدین عیسٰی بن عبدالرحیم نے لکھی، تفسیر
مہائمی شیخ علاء الدین علی بن احمد کی ہے، جن کے متعلق اہلِ علم کا خیال ہے کہ
پورے ہندوستان میں فنِ تفسیر میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، حدیث میں
موضوعات کے علاوہ محمد بن طاہر پٹنی نے مجمع بحارالانوار وہ لاجواب کتاب لکھی ہے جس کی
تمام دنیائے اسلام آج تک ممنونِ احسان ہے، یہ چند کتابوں کے نام
محض نمونہ کے طور پر لکھ دیئے گئے ہیں، ورنہ اُن کی فہرست بڑی طویل ہے،

اب ایک مختصر فہرست ان ماہرینِ فن کی ذیل میں درج کی جاتی ہے جو
اس عہد میں گذرے، اور جن کے بڑے کارنامے ہیں، سلطان احمد شاہ اول
کے عہد میں حلوی شیرازی ایک مشہور شاعر تھا، جس نے احمد شاہی نام کی
ایک منظوم تاریخ لکھی ہے، فتح کل شکل اس کا درباری نجومی تھا، محمد شاہ
کے عہد میں خداوند خان علیم ایک بہترین عالم اور علمِ جفر میں اپنے وقت کا امام
تھا، سلطان محمود اول کے زمانہ میں شیخ سراج الدین ماہرِ حساب، اور سید الملت
اور ملک امین اچھے شاعر تھے، اور اس کے دربار کی زینت تھے، سلطان مظفر دوم
کے وقت میں ملا شہیدی اور ملا قانعی دو بڑے ادیب اور شاعر تھے، مؤخر الذکر
تاریخ مظفر شاہی کے مصنف ہیں، جو جنگ مالوہ کے حالات میں جو بہادر شاہ کے دربار

میں اختیار خان بہت بڑا عالم اور شاعر تھا، فنِ نجوم، بدیہہ گوئی اور علم معما میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، سلطان محمود کے عہد میں مولانا محمد بن طاہر پٹنی ماہرِ حدیث اور علامہ شاہ وجیہ الدین علوم عقلیہ و نقلیہ میں امام تھے، مولانا عماد الدین طارمی، حسام الدین علی متقی، مولانا نور الدین احمد شیرازی، جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، صدر جہاں[1] بنبانی، شہاب الدین احمد عباسی، سید شیخ عیدروس، شیخ طیب سندھی، قاضی عماد وغیرہ اس عہد کے بڑے باکمال لوگ تھے،

وزراء میں خداوند خان، اختیار خان، افضل خان بنبانی، صدر خان عبدالحلیم، حمید الملک، خداوند خان، آصف خان، قیصر خان اس عظمت و شان کے تھے کہ آج تک اُن کا نام روشن ہے، اور آیندہ بھی دنیا اُن کو فراموش نہیں کر سکتی، یہ نہ صرف بڑے مدبر، سیاست داں، بلکہ بڑے زبردست عالم بھی تھے، اور علماء کے طبقہ میں بہت ممتاز تھے،

بادشاہوں میں سلطان مظفر دوم محدث اور مفسر و حافظ قرآن تھا، اور اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی، وہ ہر کوع روزانہ قرآن پاک لکھتا تھا، اور جب پورا لکھ لیتا تو مکہ یا مدینہ بھیج دیتا، تاکہ لوگ پڑھیں، وہ اس کے حق میں بخش دیں،

تعلیم و تربیت گجرات میں اعلیٰ خاندان کے لوگ تعلیم کے بڑے شائق تھے، جہاں تک ممکن ہوتا، اپنی اولاد کو تعلیم ضرور دلاتے، خصوصیت سے سادات

---

[1] طبقات محمود شاہی قلمی،

مشائخ، علماء اور اونچے درجہ کے لوگوں لوگوں کو اس کا بڑا خیال تھا، متوسط طبقہ کے لوگ اپنے لڑکوں کو تعلیم دلاتے، یا صنعت و تجارت میں لگا دیتے، ادنیٰ طبقہ کے لوگ زیادہ تر کوئی پیشہ اختیار کر لیتے، ملک یعنی سپاہی تعلیم کی طرف کم توجہ کرتے، لڑکے چودہ پندرہ برس کے ہوئے نہیں کہ ان کو فوج میں بھرتی کر دیتے۔ یہ بات ضرور تھی کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہوں یا ادنیٰ درجہ کے تربیت کا بڑا خیال رکھتے تھے، خصوصاً اپنے اپنے پیشہ کی تعلیم تو بہت ضروری سمجھی جاتی تھی، اس میں امیر وغریب کی کوئی قید نہیں تھی، فوجی، فوج کی تاجر تجارت کی کسی اور پیشہ کا اوس پیشہ کی تعلیم دلاتا، اور اس کے مناسب ترتیب دیتا،

محمد بن عمر بٹنی کہتے ہیں کہ ۹۹۱ھ میں شیخ محمد یانخی نے مجھ سے بیان کیا کہ گجراتیوں کی یہ خصلت ہے کہ وہ اپنے قرابت دار لڑکوں سے اپنی خدمت کرانے تھے، یہاں تک کہ وہ اس میں خوب ماہر ہو جاتے، چنانچہ میں ایک لڑکے کو روزانہ کام کرتے دیکھا کرتا، وہ کبھی کچھ کرتا، اور کبھی کچھ، یہاں تک کہ وہ گھوڑے کی مالش بھی کرتا، اس کو دانہ پانی گھاس دیتا، ٹہلاتا، غرض ہر وہ کام کرتا، جو دوسرے نوکر کرتے، اور میں سمجھتا کہ یہ بھی نوکر ہی ہوگا،

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ زرق برق قیمتی لباس میں ملبوس اعلیٰ درجہ کے گھوڑے پر سوار، خدم وحشم کے ساتھ جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ متعدد سوار اور بھی ہیں، مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، اور خیال ہوا کہ

میری نگاہ غلطی تو نہیں کر رہی ہے، لیکن میں نے بہت غور سے دیکھا تو وہی لڑکا تھا۔

میں نے ایک شخص سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ فلاں رئیس کا لڑکا ہے، (فوجی عہدہ دار ہوگا) محض تربیت کے خیال سے اس طرح کی ادنیٰ خدمت اس سے لی جاتی رہی۔ اب وہ جوان ہوگیا ہے، اور آج اس کی چچا زاد بہن سے شادی ہے، اور یہ اسی کی بارات ہے۔[۵۱]

---

۵۱ ظفرالوالہ جلد اوّل ص ۲۹۵،

گجراتیوں کی خصوصیات

گجراتیوں میں غیرت کا مادہ بہت تھا، وہ اپنے بچوں کو نہ پان کھانے دیتے تھے، نہ آنکھوں میں سرمہ لگانے دیتے تھے، وہ بچوں کو بالغ ہونے تک گھر سے باہر بھی جانے نہیں دیتے تھے، ۹۱۷ھ ۱۵۱۱ء میں مالوہ کا ایک شہزادہ احمد آباد آیا تھا، وہ نوعمر اور بہت خوبصورت تھا، اسی زمانہ میں ایران کا سفیر بھی آیا ہوا تھا، جس کے ساتھ پانچسو ایرانی تھے، اتفاق سے جہاں یہ ٹھہرے تھے، وہاں شہزادہ اپنے کسی ملاقاتی سے ملنے کے لئے آیا، ایرانی دیکھتے ہی اس پر مفتوں ہوگئے، اور کچھ چھیڑ بھی کی، شاہزادہ کو بڑی غیرت معلوم ہوئی، اور اس نے تلوار کھینچ لی، ایرانی بھی اس پر پل پڑے گجراتیوں نے یہ دیکھا تو فرط غیرت سے ایرانیوں پر اسقدر پتھر برسائے کہ کچھ ایرانی مرگئے، پولیس نے آکر ان سب کو الگ کیا، شاہزادہ فرط غیرت سے بالآخر گجرات سے چلا گیا[1]

---

[1] ظفرالوالہ جلد اول ص ۸۰، لندن،

ہیونگ سوانگ مشہور چینی سیاح نے لکھا ہے کہ مالوہ اور گجرات والوں کے خصائل یکساں ہیں، آب و ہوا بھی ان دونوں حصوں کی یکساں ہے، گجراتیوں کی تفوق پسندی کا یہ عالم تھا کہ کسی کے ماتحت رہنا اس وقت تک قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، جب تک کہ وہ پورے طور پر سرداری کا اہل نہ ہو، اگرچہ وہ مقرب سلطانی ہی کیوں نہ ہو، وہ ہر ذلت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، وہ کسی کی بڑائی برداشت نہ کرتے، اگر کسی کو اُن سے چشمک ہو جاتی، تو اُس کے مقابلہ میں نیزہ اور تلوار سنبھال لیتے، اور مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جاتے، کسی ہتھیار کا اپنے پاس رکھنا اُن کی عادت میں داخل تھا، وہ پڑوسیوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے، مہمان نوازی اُن کا خاص وصف تھا، اور مہمانوں کی خاطر پڑوسیوں سے بھی لڑ جاتے، اور بسا اوقات اُن کی وجہ سے آپس میں بھی جنگ ہو جاتی، وہ مہمانوں پر اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ خرچ کرتے، اُن کا یہ اخلاق موروثی تھا، اور نسلاً بعد نسلٍ بزرگوں سے چلا آرہا تھا، اور اُن کے یہ اخلاقِ حسنہ اور خصائلِ حمیدہ سلطان محمود ثالث کی شہادت تک برابر قائم رہے[1]، اس کے بعد غیر ملکی بکثرت آگئے، حکومت بھی بدل گئی، جس کا اثر لازمی طور پر گجراتیوں پر بھی پڑا، ان میں رفتہ رفتہ وہ تمام ذمائم اخلاق پیدا ہو گئے، جو یہ غیر ملکی ساتھ لائے تھے، اُن کی سب سے بڑی بُرائی اُن کی خود غرضی ہے،

---

[1] ظفر الوالہ جلد اوّل ص ۵۰، لندن،

غذا | کھچڑی گجراتیوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ اور وہ اس کو روزانہ استعمال کرتے ہیں، مسلمانوں میں اس کا کب سے رواج ہوا، اس کا سُراغ نہ لگ سکا، البتہ اتنا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلطان احمد شاہ اوّل کے عہد میں مسلمانوں میں کھچڑی کا رواج ہو گیا تھا[۱] (۸۴۵ھ) احمد آباد اور کاٹھیاواڑ میں رات میں کھچڑی کھائی جاتی تھی، اور سورت میں دن میں، رات میں کھانے کا دستور قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، احمد شاہ اوّل اور شیخ احمد کھٹو دونوں رات ہی میں کھچڑی کھاتے تھے،[۲]

ایک چیز گجرات کی سنبوسہ ہے، گو دوسرے شہروں میں بھی مستعمل ہے لیکن جس کثرت سے یہاں اس کا استعمال ہے، کہیں اور جگہ نہیں ہے کھنبایت میں بہترین سنبوسہ بنتا ہے،

ایک چیز "شکرانہ" ہے، یہ شکر، چاول اور گھی ملا کر پکائی جاتی تھی، سولہویں صدی میں اس کا بہت رواج تھا، چاول پکا کر پہلے اس میں شکر ڈالتے، پھر گھی ملا کر مہمانوں اور بزرگوں کے سامنے پیش کر دیتے،[۳]

مٹھائیاں بھی کثرت کھائی جاتی تھیں، سلطان مظفر آخر کے عہد میں ناشتہ کے وقت وزراء خاص طور سے کھاتے تھے،

سلطان محمود اوّل کے زمانہ میں یہ عام مذاق ہو گیا تھا، کہ کھانے

---

[۱] تحفۃ المجالس قلمی کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد، [۲] مرقاۃ الوصول قلمی، [۳] کوکب فلک قلمی،

کے بعد منھ صاف کرنے کے لئے خشک چاول چباتے تھے، سلطان محمود اوّل کی نسبت مرآۃ سکندری میں لکھا ہے کہ وہ اس طرح کھانے کے بعد گجرات کے وزن کے حساب سے پانچ سیر (۲½ ہندوستانی) چاول چبایا کرتا تھا،

کھانا جب ختم ہو جاتا تو پان اور عطر بھی استعمال ہوتا، گلاب پاشی بھی ہوتی تھی،

افیون کے استعمال کا بھی بڑا رواج تھا، مظفر حلیم کے زمانہ میں اس کو گولی کہتے تھے، افیون کے استعمال کا رواج گجرات میں غالباً محمود اوّل کے زمانہ سے ہوا، سلطان محمود کی والدہ مغلئی بی بی نے بچپن ہی سے محمود کو زہر کھانے کی عادت ڈلوائی تھی، تاکہ اس کا بھائی قطب الدین اگر پوشیدہ طور پر اس کو زہر دیدے، تو عادت کی بنا پر اس کا کوئی اثر نہ ہو یہ عادت آخر تک رہی، اور یہی عادتِ بد دیکھا دیکھی عوام نے بھی اختیار کر لی۔ اور افیون کھانے کا عام رواج ہو گیا،

محمود اوّل کی عام انسانوں سے جو زیادہ خوراک تھی، اس کا سبب بھی زہر تھا، اور وہ زیادہ سے زیادہ زہر کھا کر ہضم کر لیتا تھا،

دودھ بھی یہاں کی محبوب غذا تھی جس کو اب تک بڑے شوق اور رغبت سے استعمال کرتے ہیں،

گجرات میں پان کھانے کا بھی بڑا رواج تھا، ایک انگریزی سیاح نے لکھا ہے۔ کہ سلطان محمود اوّل پان کھا کر جس پر تھوک دیتا تھا وہ مرجاتا تھا، میرے خیال میں سیاح کو غلط فہمی ہو گئی، تھوک کے زہر سے کیڑے

کوڑے اور کھیاں مرجاتی ہوں گی، اور لوگوں نے اس کو اس قدر مبالغہ سے بیان کیا ہوگا کہ سیاح نے سمجھ لیا کہ انسان بھی مرجاتے ہیں،

لباس سنہ ۳۰۲ھ / ۹۱۲ کے عرب مسافروں نے یہاں کے باشندوں کا جو لباس لکھا ہے وہی آج بھی مروج ہے، عام مسلمان لبا کرتا، اس کے اوپر صدری، پھر عبا استعمال کرتے، سر پر عمامہ (پگڑی) باندھتے، اچکن اور چپکن جو مغلیہ عہد کا لباس ہے، ان کا اس دور میں پتہ نہیں چلتا، نیچے پائجامہ پہنتے، شاہی لباس بھی تقریبًا یہی تھا، البتہ پگڑی میں ذرا فرق ہوتا، یعنی اس میں ایک کلغی ہوتی، جس میں کوئی بیش قیمت ہیرا جڑا ہوتا[1]، ایک پرتگیزی کتاب میں بہادر شاہ کی ایک تصویر نظر سے گذری، جس میں وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پگڑی بادشاہوں کے لئے مخصوص تھی، اس کا باپ مظفر حلیم بھی پگڑی باندھتا تھا، یہ دو قسم کی ہوتی تھی، ایک ایسی کہ جب چاہیں باندھ کر کھول دیں، یہ عام طور پر روزمرّہ کے استعمال کی ہوتی، اس میں کوئی بیش قیمت چیز نہیں ہوتی تھی، دوسری وہ جو بندھی ہوتی کہ جب چاہیں پہن لیں، اور جب چاہیں اُتار لیں، اس میں بیش قیمت ہیرا ہوتا تھا، اس کو آپ تاج سے تعبیر کر سکتے ہیں، تاریخوں میں دونوں قسم کی پگڑیوں کا ذکر ہے، مظفر حلیم جب وضو کرتا، تو مسح کے وقت اُس کے سر سے پگڑی اُتار لی جاتی، اور جب اُس سے فارغ ہوتا تھا تو دو چار پیچ کھول کر پھر باندھ دیجاتی تھی[2]، یوہرول

---

[1] تحفۃ النظار، قلمی، کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد [2] مرأۃ سکندری ص ۲۰۳، قلمی،

کی خاص قسم کی پگڑی ہوتی جس سے وہ پہچان لیئے جاتے تھے جب کوئی دوسرا یہ پگڑی باندھتا، تو لوگ کہتے کہ تم نے تو بوہروں کی پگڑی باندھی ہے، یہ پگڑی غالباً ان عرب تاجروں کی نقل ہے، جو بغداد، موصل بصرہ، سیراف اور دوسرے عرب سواحل سے بغرض تجارت آتے تھے بزرگ بن شہریار جو تیسری صدی ہجری (سنہ ۳۰۰ھ) کا مشہور ایرانی سیاح ہے، اُس نے اپنی کتاب میں ان تاجروں کی جو تصویریں دی ہیں، ان میں وہ اسی قسم کی پگڑی باندھے ہوئے ہیں، اسی سے میں نے قیاس کیا کہ وہ اسی عہد کی یادگار رہے جو اب تک چلی جارہی ہے[1]

اس زمانہ میں علماء کی بھی خاص طرز کی پگڑی ہوتی تھی، مظفر حلیم نے ایک لڑکے سے جو گفتگو کی تھی[2] اس سے اس کا پتہ چلتا ہے،

عورتیں، پائجامہ، کرتہ، دوپٹہ اور برقعہ استعمال کرتی تھیں، مغلیہ عہد سے جامہ (ایک طرح کی ترکی یا تاتاری زنانہ عبا) کا بھی رواج ہوگیا تھا جسکا رواج آج گجرات کے شرفاء میں تو متروک ہوگیا ہے، لیکن ادنیٰ طبقہ کی عورتیں استعمال کرتی ہیں، شرفاء میں صرف برقعہ رہ گیا ہے، وہ بھی جدید تمدن کی بدولت بتدریج رخصت ہو رہا ہے،

مکان اور اسکی آرائش | فرشتہ اور امین رازی نے لکھا ہے کہ احمد آباد میں زیادہ تر مکانات یک منزلہ، دو منزلہ وہ بھی سفالہ پوش ہوتے تھے، اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اُن کی آرائش اور زیبائش کرتے تھے، جھولا

---

[1] عجائب الہند طبع لندن [2] مرآۃ سکندری ص ۳، ۱۴۶،

وہاں تمام گھروں میں ہوتا ہے، رات کو اسی پر سوتے بھی ہیں، کوئی مہمان آتا ہے تو خاص طور سے اس کو اس پر بٹھاتے ہیں،

جشن میں آرایش | جب کوئی دربار یا جشن ہوتا، تو مکان کو خوب آراستہ پیراستہ کرتے، قسم قسم کے رنگین فرش بچھائے جاتے، دیواروں کو مختلف رنگوں سے رنگا جاتا، سونے چاندی کے پانی سے نقش و نگار بنائے جاتے، پھول اور عطر سے سارا مکان بسایا جاتا، جب کوئی شخص اندر جاتا تو قدم رکھتے ہی اس کا دماغ معطر ہو جاتا، رنگ برنگ کے پردے آویزاں کئے جاتے، جن پر موسم بہار کا گمان ہوتا تھا، یہ ذوق بہت عام تھا، امیروں، درباریوں اور رئیسوں سب میں ہوتا، محمود ثالث ۸۵۹ھ ۱۴۵۵ء کا وزیر مختار دریا خان، ایسا جشن کرتا، اور اس قدر آرایش و زیبایش کرتا کہ اس کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ ہو جاتے، اس کے حالات تاریخوں میں موجود ہیں[۱]،

سلطان مظفر حلیم کے زمانہ میں سرستی کے نام سے جو جشن منایا گیا تھا، اور مکان کی آرایش، اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر تھی کہ خاص طور پر کتابوں میں اس کا ذکر کیا گیا[۲]، اسی زمانہ میں ملک گوپی چند نائب وزیر کے یہاں جو جشن ہوتا تھا اس کو دیکھنے کے لئے شاہزادے تک مشتاق رہتے، اس دن بازار میں پھول نایاب ہو جاتے، مظفر آخر کے عہد میں چنگیز خان کا دربار اور جشن کا مکان بہت آراستہ اور پیراستہ ہوتا، بہادر شاہ کو جب ہمایوں نے شکست دی، اور بہادر شاہ لشکر چھوڑ کر چلا گیا تو ہمایوں ہی کا

---

[۱] مرآۃ سکندری ص ۳۰۷، [۲] ۔ ص ۱۶۹

خیمہ دیکھ کر مبہوت ہوگیا، خیمہ کی ہر چیز اس قدر اعلیٰ درجہ کی تھی کہ اُس
زمانہ میں شاید ہی اور کسی کے پاس رہی ہو، فرش تک مخمل زریں کا تھا
سارا سامانِ آرائش ریشم کا تھا، برتن سب کے سب سونے اور چاندی
کے تھے۔

مخصوص جشنوں میں ایک عید کا جشن بھی تھا، اس دن تمام اراکین
سلطنت بیدر کے پاس دربار میں جمع ہوتے تھے، اور سب مل کر ایک
جلوس کی صورت میں عیدگاہ جاتے تھے۔ سلطان ہاتھی پر سوار ہوتا،
آگے پیچھے اپنی اپنی حیثیت اور مرتبہ کے لحاظ سے تمام اراکین دولت
ہوتے، ہاتھی پر سلطان کے پیچھے سب سے زیادہ معزز غلام ہوتا جس
کے ہاتھ میں چتر یا مورچھل ہوتا، اور ہلاتا رہتا۔ اسی طرح نماز پڑھ کر
عیدگاہ سے جلوس واپس آتا، لوگوں کی دعوت ہوتی، بہترین کھانے
دسترخوان پر چنے جاتے۔ اسی دن دوپہر بعد یا شب میں دربار ہوتا
جس میں لوگوں کو اُن کی حیثیت اور مرتبہ کے موافق خلعت اور نذرانے
دیے جاتے، آخر میں پان اور عطر دے کر رخصت کر دیا جاتا۔

عید میلاد: حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عید ولادت کا جشن بھی پایۂ تخت
گجرات میں خوب دھوم دھام سے منایا جاتا۔ بڑی بڑی محفلوں سے بیچ
اور قیام نعت خوانی ہوتی، جس میں سادات، ائمہ مساجد، مشائخ، صوفیہ
زہاد، عباد، صلحاء، فقراء، اور عوام سب شریک ہوتے، شاید ہی کوئی
مشہور آدمی اس کی شرکت سے محروم رہ جاتا ہو، یہ اجتماع

بارہ ربیع الاول تک جاری رہتا، اس میں نعت خوانی کے ساتھ قرآن خوانی، حدیث خوانی، ذکر اور آواز کے ساتھ درود خوانی بھی ہوتی، بارہویں کی شب کو آخری مجلس میلاد میں نعت خوانی ہوتی، اور جب ولادت کا ذکر قریب آتا تو سلطان بھی پہونچ جاتا، پھر خلعت لایا جاتا، جس میں سلے اور بن سلے کپڑے ہوتے، اور ترتیب کے ساتھ میلاد خواں کو پھر مخصوص لوگوں کو، پھر عام لوگوں کو دیا جاتا، کوئی وہاں سے محروم واپس نہ آتا،

اس کے بعد شکر کا خوشبودار شربت لایا جاتا، اور تمام لوگوں کو پلایا جاتا، پھر محل کے صحن میں اربابِ تصوف جمع ہوتے، اور وہ نعت خوانی کرتے، کچھ بغیر ساز کے اور کچھ ساز کے ساتھ گاتے، اُن میں کوئی روتا کوئی رُلاتا، اور بعض رقص کرتے، غرض اسی طرح صبح ہو جاتی، آفتاب بلند ہو جاتا، تو سلطان پانی لے کر کھڑا ہو جاتا، اور وزیر طشت، دونوں لوگوں کے ہاتھ دھلاتے، پھر امراء و مقربین دسترخوان بچھاتے، جو قیمتی کپڑے کا ہوتا، جگہ جگہ کھڑے ہو جاتے، اور طباق لا لا کر دسترخوان پر رکھتے، جو تقریباً بارہ ہزار ہوتے، اگر فی طباق چار آدمی بھی ہوں تو تقریباً اس دن پچاس ہزار آدمی کھانا کھاتے، اس میں امراء، ارکینِ سلطنت اور نوکر غلام شامل نہیں ہیں، جب لوگ کھانے سے فارغ ہوتے، تو پان، گلاب اور عطر سے تواضع کی جاتی، اس کے بعد کپڑے لائے جاتے، اور حسبِ مرتبہ سب کو تقسیم کیا جاتا، پھر فاتحہ پڑھکر لوگ واپس چلے جاتے،

اُن کے بعد وزراء، امراء، اراکینِ دولت و مقربین بارگاہ کی باری آتی، وہ مخصوص محل میں جاتے۔ ان کے لئے دسترخوان بچھایا جاتا، جس پر آصف خاں، سید مبارک، افضل خان جیسے بلند مرتبت لوگ بھی ہوتے۔ یہ کھا چکتے تو لشکر کے لوگ کھاتے، آخر میں خدام بارگاہ اور نوکروں اور غلاموں کی باری آتی،

اس کے بعد بھی کھانا بچ رہتا، تو یتیموں، مسکینوں، مسافروں، غریبوں بازاری فقیروں، مزارات کے مجاوروں، اور جو وہاں نہ پہونچ سکتے، اُن کو تقسیم کردیا جاتا۔ جشنِ میلاد کا دستور تو ہمیشہ سے تھا لیکن محمود اعظم بیگڑو کے عہد سے اس میں زیادہ اہتمام ہونے لگا، اور مظفر شاہ بن محمود اعظم نے بہ نیت ثواب یہ دستور نکالا، خود اپنے ہاتھ میں پانی کا لوٹا لیتا، لوگوں کے ہاتھ دھلاتا، اور دسترخوان کو دھلاکر اپنے لئے اس کے کپڑے بنواتا، اور تبرکاً استعمال کرتا، محمود ثالث اس پر عمر بھر عمل کرتا رہا۔

سلاطینِ گجرات کے ازدواجی تعلقات سلطان مظفر اول اور اس کے لڑکے تاتار خان کے متعلق تاریخوں میں پتہ نہیں چلتا کہ ان کی شادیاں کہاں ہوئی تھیں، لیکن احمد شاہ اول کے نسبت شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ اس کی شادی گجرات کے راجپوتوں میں ہوئی تھی، غالباً ان کی شاخ ٹانک میں جس سے خود اس کا تعلق تھا، اس کے لڑکے محمد شاہ ثانی کی ایک شادی تو راجہ ایڈر کی لڑکی سے ہوئی، جس کی سفارش سے باپ کی ضبط شدہ ریاست واپس مل گئی، دوسری سندھ کے

لے ظفر الوالہ جلد اول صفحہ ۲۰۰ ۳۰۲ لندن،

جام خاندان میں ہوئی، ملکہ کا نام مغلئی بی بی تھا، اُس کے ایک بیگم اور تھی، جس کا نام رانی بائی تھا، جس کی گود میں مظفر دوم نے پرورش پائی، ممکن ہے ایڈر کی رانی رہی ہو، قطب الدین نے ایک شادی مظفر شاہ اوّل کے بھائی شمس خاں وندانی کے پوتے کی لڑکی سے کی، اور دوسری کسی راجپوت خاندان میں جس کا نام رانی روپ منجری تھا، جس سے سلطان قطب الدین کے مرنے پر سلطان محمود نے شادی کی، سلطان محمود کے چار رانیاں تھیں اُن میں سے کوئی بھی نسلاً مسلمان نہ تھی، سلطان مظفر بن محمود کی ماں رانی ہیرا بائی مہی ندی کے کنارے کے ایک راجپوت رانا کی لڑکی تھی، سلطان مظفر دوم کی پہلی شادی سندھ کے جام خاندان میں ہوئی تھی، اسی سے اس کا لڑکا سکندر تھا، جس کو ولی عہد بنایا تھا، اور دوسری شادیاں اُس نے راجپوتوں میں کیں، بہادر شاہ ماں کے رشتہ سے راجہ چتوڑ کا بھانجا ہوتا تھا، خود بہادر شاہ کی ایک شادی بھلنہ کے راجہ (گوہل خاندان) کی لڑکی سے ہوئی جیجر بائی کھیدر راجہ گجرات کی نسل سے تھی، یہ خاندان علاء الدین خلجی کے عہد میں شکست کھا کر گجرات سے نکالا نہ چلا گیا تھا، اور اس وقت تک وہیں تھا، اس کی دوسری شادی جام فیروز (بادشاہ سندھ) کی لڑکی سے ہوئی محمود ثالث کی بیگمات میں ایک بیگم ایک راجپوت کی چشم و چراغ تھی جس سے مظفر پیدا ہوا،

اسی طرح سلاطین گجرات کی شاہزادیوں کی شادیاں زیادہ تر جام سندھ شاہانِ فاروقی خاندیس، اور اپنے ہی خاندان کے لڑکوں سے ہوتی رہیں، لیکن کبھی کبھی

اس ملکہ سے! بہر بھی جو میں بھیجے محمد شاہ دوم کی لڑکی محمد علیم خداوندخاں کے عقد میں تھی،

گجرات کے سلاطین اور امراء کی بیگمات میں سے کسی نے ملک کی سیاست میں حصہ نہیں لیا، سلطان مظفر حلیم کی سندھی بیگم البتہ درباری لوگوں پر حاوی رہی، حاکم بجروچ چنگیز خاں کی ماں پولیٹیکل دماغ رکھتی تھی، اور سیاسی معاملات میں حصہ بھی لیتی رہی، لیکن چنگیز خان کی موت نے اس کو اپنے کمالات دکھانے کا موقع نہیں دیا،

گجرات کے مدارس

گجرات میں مسلمانوں کی آمد و رفت ۱۵ھ ۶۳۶ء (بعہد حضرت عمرؓ) سے شروع ہو گئی[1]، اور سواحلِ گجرات پر مختلف مقامات میں اُن کی بستیاں قائم ہو گئی تھیں، بعض بعض مقامات کی آبادی دس دس ہزار کی تھی[2]، جس میں مستقل خاندان بھی تھے، ہندوستانی نسل سے جو اولاد ہوئی اس کو "بیاسرہ" کہتے تھے، بیاسرہ جمع ہے بیسرہ (بے سرا) کی، گجراتی میں بے کے معنی دو کے ہیں، اور سرا کے معنی سر، یعنی دو سر والے، مطلب یہ ہے کہ دو مختلف نسل کے مرد اور عورت سے جو اولاد پیدا ہو، عرب اور ہندوستانی سے مل کر جو اولاد پیدا ہوتی تھی، اس کو بیاسرہ کہتے تھے، آجکل گجراتی میں اس کے معنی حرام زادے اور احمق کے ہیں، ظاہر ہے کہ ان مخلوط النسل بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے گئے ہوں گے، لیکن ہم کو اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں نہیں مل سکی،

---

[1] بلاذری مصر فتح سندھ [2] مسعودی جلد اوّل مصر،

سوراشٹ کوٹ راجاؤں کے عہد میں مسلمان زیادہ آباد ہوئے، پھر سولنکیول نے اُن کی جو قدر افزائی کی، اس سے اُن کی ہمت اور بڑھ گئی، اور وہ اور زیادہ آکر آباد ہوگئے، اسی عہد سے مسلمانوں نے گجرات میں مدارس قائم کرنے شروع کر دیئے، چنانچہ سدھ راج سنگھ کے عہد میں شیعہ بوہروں کے ابتدائی مدارس قائم ہوئے،[1] لیکن مسلمان بچوں کے لئے مخصوص تھے، تغلق کے زمانہ تک اُن کا حال یہی رہا، سلاطینِ گجرات کے زمانہ میں حکومت کے محکموں اور دفتروں میں ہندوؤں کی بھرتی شروع ہوئی، تو انھوں نے ہر محکمہ کی طرح ان مدارس سے بھی فائدہ اُٹھایا، تعلیم کے حصول میں ناگروں نے سب سے زیادہ سبقت کی، اور اُس سے انھوں نے مغل سلطنت کے آخر زمانہ تک فائدہ اٹھایا،

مسلمانوں نے اپنے عہد میں مختلف قسم کے مدارس قائم کئے، اور ہر فن کی تعلیم و تدریس کی طرف انھوں نے توجہ کی، اُن میں سے چند مدارس کا حال ذیل میں لکھا جاتا ہے،

۷۵۵ھ/۱۲۵۵ء میں بمقام نہر والہ پٹن میں پتھر کی ایک عالی شان مسجد تعمیر ہوئی تھی، اس کی تاریخ میں بہت سے اشعار کندہ کئے گئے تھے، اُن میں سے چند شعر یہ ہیں :-

بسن ششصد و پنجاہ و پنج بود (۶۵۵)	ز ہجرتِ سیّدِ سالارِ محشر
رساندہ در مہِ ذیقعدہ اتمام	الغ خاں نامور سلطان سنجر

---

[1] موسم بہار جلد سوم مطبع صفدری بمبی،

اس وقت پٹن میں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی، یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس ہر قسم کی دینی تعلیم ہوتی تھی، اس کے منتظم مولانا ابو یوسف محمد یعقوب تھے،

۶۹۵ھ ۱۲۹۲ میں جب مظفر شاہ گجراتی اس ملک کا فرمانروا ہوا تھا اس وقت مولانا محمد یعقوب کے پوتے مولانا مخدوم عالم تھے،

سلطان احمد اول کے عہد میں بہت سے مدرسے قائم ہوئے جیساکہ علوی شیرازی نے اپنی کتاب احمد شاہی میں تحریر کیا ہے [۱] ان میں سے ایک مدرسہ کے مدرس اعلیٰ محمد بن ابی بکر مخزومی تھے، یہ دمامینی کے نام سے مشہور تھے، یہ اسکندریہ میں پیدا ہوئے، قاہرہ اور مکہ میں تعلیم حاصل کی، نحو، ادب اور فقہ کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، پہلے اسکندریہ کے مدارس میں درس و تعلیم کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر قاہرہ میں آئے، اور کچھ دن درس دے کر سرکاری عہدہ پر فائز ہو گئے تھے، پھر حج کر کے یمن چلے گئے، یہ ۸۱۹ھ ۱۴۱۶ کا واقعہ ہے، ۸۲۰ھ ۱۴۱۷ میں گجرات پہنچے [۲] یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، شاہی محکمہ کی طرف سے اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، کئی برس تعلیم دی، اس زمانہ میں کتاب وانی زیر درس تھی، طلبہ نے اس کی شرح کی خواہش کی، یہ اسی فکر میں تھے کہ بنیانی خاندان سے علمی مباحثہ ہو گیا، اس کی وجہ سے دونوں

---

[۱] احمد شاہی منظوم بحوالہ مرآۃ سکندری، بمبئی

[۲] الضوء اللامع باب میم، مصر،

میں اس قدر رنجش بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے کے درپے آزار ہوگئے،
بنیا خاندان گجرات میں بہت با اثر تھا، اس کے ارکان حکومت کے
بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے اُن کو
جیل میں ڈلوا دیا، جیل سے چھوٹے تو سلطان احمد بہمنی کے پاس دکن چلے
گئے، اُس نے اُن کی بڑی قدر دانی کی، جب اُن کو پورا اطمینان ہوگیا تو
جزیرۂ مہائم میں قیام کرکے وافی کی شرح لکھ ڈالی؛ اور ۸۲۵ھ (۱۴۲۱) میں گلبرگہ
میں اس کو صاف کیا، اور اس کا نام "المنہل" رکھا جو آج تک مشہور ہے[1]،

سرخیز کا مدرسہ | حضرت شیخ احمد کھٹو متوفی ۸۴۹ھ (۱۴۴۵) نے سرخیز (سرکھیج)
میں خانقاہ، مسجد، تالاب بنوایا تھا، وفات پاجانے پر محمد شاہ دوم نے
ان کا مقبرہ اور مدرسہ وغیرہ بنوایا، اس کے ساتھ طلبہ کے رہنے کے لئے
ایک دارالاقامہ بھی تھا، جو عرصہ تک قائم رہا، ۱۹۲۱ء تک اُس کے حجروں
کے آثار موجود تھے، جن کو راقم الحروف نے بچشم خود دیکھا تھا، محمود اور
اُس کے لڑکے مظفر کے عہد میں حسن العرب اس مدرسہ کے افسر اعلیٰ تھے

خان سرور کا مدرسہ | ۸۵۵ھ (۱۴۵۱) میں نہروالا پٹن میں خان سرور کے تالاب کے
پاس مذہبی علوم و فنون کا ایک بہت بڑا مدرسہ تھا۔ جہاں سے بڑے بڑے
لوگ تعلیم پاکر نکلے، سلطان قطب الدین گجراتی جب محمود خلجی سلطان مالوہ
کے مقابلہ کے لئے نکلا ہے تو اس مدرسہ کے طلبہ نے خلوص دل سے اس
کی فتح کے لئے دعا مانگی تھی، اس کے معلم اعلیٰ مولانا قاسم بن

---

[1] مقدمہ منہل قلمی کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد۔

محمود دهر تھے[۵۱]

مدرسہ شمع برہانی | شیخ محمد عثمان الملقب بہ شمع برہانی متوفی ۸۶۳ھ ۱۴۵۹ء

خلیفہ حضرت قطب عالم متوفی ۸۵۷ھ ۱۴۵۳ء بڑے پایہ کے بزرگ تھے، احمدآباد ابھی ابھی آباد ہوا تھا، سابرمتی ندی کے اس پار جہاں اب عثمان پور ہے اس وقت کوئی آبادی نہیں تھی، شیخ مذکور وہیں خیمہ کھڑا کرکے مقیم ہوئے، پھر ایک ہندو بنیے کو ترغیب دے کر آباد کیا، رفتہ رفتہ آبادی اتنی بڑھتی گئی، اس کا نام شیخ نے اپنے نام پر عثمان پورہ رکھا، آخر زمانہ میں اس کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ دس ہزار گھر فقط کاریگروں کے تھے[۵۲] یہاں ایک عالیشان مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا گیا، جس میں دینی تعلیم ہوتی تھی۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، اور اصول خصوصیت سے پڑھائے جاتے تھے، مسجد کے ساتھ طلبہ کے رہنے کے لئے متعدد حجرے بھی تھے، ان طلبہ اور شیخ کے اہل خاندان کے لئے جو اس مدرسہ کے معلم اور منتظم تھے، بادشاہ کی طرف سے وظائف مقرر تھے[۵۳] طلبہ اور مدرسین کے استفادہ کے لئے شاہی کتب خانہ سے اکثر کتابیں بھی دی جاتی تھیں، شیخ کے بعد، ان کے لڑکے محمد، پھر ان کے لڑکے احمد، پھر ان کے خلف مولانا یوسف اس مدرسہ کو چلاتے رہے، انہی موخرالذکر نے سلطان محمود بیگڑہ کے حکم سے تاریخ ابن خلکان

۵۱ ظفرالوالہ جلد ا ص ۶ طبع لیڈن ۵۲ مراۃ احمدی خاتمہ بیان پورہ جات

۵۳ ظفرالوالہ ج ا ص ۲۰۲

کا فارسی میں ترجمہ کیا، راجہ سلیم پور، لکھنؤ، حیدرآباد، اور لندن میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے، سلطان محمود بن لطیف خاں متوفی ۹۶۱ھ؁ ۱۵۵۴ء کے عہد میں سید عالم اس مدرسہ کے متولی تھے[1] مرہٹوں کی لوٹ مار میں جب عثمان پورہ تباہ ہوا ہے، تو اس مدرسہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بج گئی، ایک چھوٹا سا گاؤں مع مقبرہ اور مسجد کے بطور یادگار باقی ہے،

مدرسہ مزار شیخ حسام الدین | نہروالہ پٹن میں شیخ حسام الدین ملتانی کے مزار کے پاس ایک مدرسہ تھا جس میں مولانا تاج الدین درس دیا کرتے تھے، اُن کے بعد اُن کے لڑکے محمد بن تاج الدین معلم اعلیٰ ہوئے، یہ دونوں باپ بیٹے گجرات کے مشہور علماء میں تھے، اور اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے،

قاضی صاحب کا مدرسہ | قاضی برہان الدین نہروالی ایک مشہور عالم تھے اُن کے علم و فضل کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ دور دور سے طلبہ آکر فیض حاصل کرتے تھے، اُن کا مدرسہ طلبہ سے ہر وقت بھرا رہتا تھا، ظفرالوالہ کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے علم و فن کے فروغ و اشاعت میں بڑی کوشش کی، اور گجرات میں اُن کے تلامذہ نے علم کو بیحد ترقی دی، اُن سے قبل اُن کے والد شہاب الدین احمد بھی جو مخدوم بڑا کے لقب سے مشہور تھے، اشاعت علوم میں ساعی رہے اُن کے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، عبدالعزیز آصف خاں

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۲۹۶۔

وزیرِ مطلق ان ہی کا شاگرد تھا، جس کی لیاقت، تدبر، اور علمی قدر دانی کا شہرہ عرب اور عجم تک تھا، جب یہ سفیر بن کر سلطان سلیمان ترکی کے دربار میں گئے، تو وہ اُن کے اوصافِ حمیدہ اور علم و دانش سے بڑا متاثر ہوا، اُن کی شہادت کی خبر جب مکہ میں پہونچی، تو بہت سے لوگوں نے مرثیہ کہا، اُن کا مدرسہ پٹن میں بہت مشہور تھا، اور ہزاروں آدمی اس سے فیضیاب ہوئے،

شیخ متہ کا مدرسہ | پٹن میں شیخ متہ بہت بڑے عالم تھے، اُن کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا، اُن کا ایک مدرسہ تھا، جہاں طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے، علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اور بھی بہت سے لوگ اس مدرسہ سے فیضیاب ہو کر نکلے،

مدرسہ شاہ عالم | گجرات کے مشہور و معروف مقدس بزرگ حضرت شاہ عالم متوفی ۸۸۰ھ ۱۴۷۵ء کے جانشین نے اُن کی یادگار میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں ہر قسم کی علوم و فنون کی تعلیم ہوتی تھی، یہاں سے بڑے بڑے لوگ تعلیم پا کر نکلے، اس کے ساتھ دار الاقامہ بھی تھا، اس میں رہنے والے طلبہ کو وظیفے بھی ملتے تھے، اس پر کئی گاؤں وقف تھے، مولانا شیخ نور الدین شیخ الکل اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، سید محبوب عالم کے وقت میں یہ مدرسہ بڑے عروج پر تھا، مرہٹہ گردی میں پورا مدرسہ تباہ ہو گیا،

مدرسہ محمد بن طاہر | نہروالہ پٹن میں ایک اور مدرسہ تھا، جس میں ہر قسم

کے علوم پڑھائے جاتے تھے، مگر حدیث کی تعلیم کے لئے زیادہ مشہور تھا، علامہ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) اس کے مدرس اعلیٰ تھے، علامہ موصوف فن حدیث کے امام تھے "تذکرۃ الموضوعات" اور "مجمع بحار الانوار" انہی کی تصنیف ہیں، یہ اکبر اعظم کے ہم عصر ہیں، مہدویوں کے رد میں بڑے سرگرم تھے، در بالآخر انہی نے اُن کو شہید کر ڈالا، اُن کے بعد اُن کے لڑکے اور پوتے کے زیر اہتمام یہ مدرسہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، عہد عالمگیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا، تو یہ اسی میں منضم ہوگیا۔[1]

منگلور کا مدرسہ | کاٹھیاواڑ میں منگلور ایک مشہور بندرگاہ ہے، آج کل اُس کو "مانگرول" کہتے ہیں، جو ایک مسلمان نواب کے تحت ہے، آٹھویں صدی کے آخر میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس کو فتح کیا گیا، اور وہاں کے ناظم   نے ایک جامع مسجد کی بنیاد ڈالی، جو ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں مکمل ہوئی اسی کے ساتھ ایک مدرسہ بھی تھا، افسوس ہے کہ اس کے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے، راقم ۱۹۲۲ء میں وہاں گیا تھا، مسجد بالکل ویران اور جگہ جگہ سے مرمت طلب ہوگئی تھی، مسجد کے ساتھ طالب علموں کے لئے دو منزلہ حجرے بھی اس وقت تک تھے،

مدرسہ عالیہ علویہ | علامہ شاہ وجیہ الدین متوفی ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) کے عہد میں احمدآباد کے شاہی محل کے بالمقابل (جہاں آج پارسی کلب ہے) روضۂ شاہ وجیہ الدین کے متصل یہ مدرسہ قائم کیا گیا تھا، یہ درحقیقت اس زمانہ کی یونیورسٹی تھی

---

[1] تذکرۂ محمد بن طاہر پٹنی قلمی مصنفہ قاضی عبد الوہاب،

جس سے گجرات، خاندیس، کاٹھیاواڑ اور دکن کے مدارس ملحق تھے، اس مدرسہ میں منطق، فلسفہ، تصوف اور علوم دینی کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، اسی کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی تھا، جس کے شکستہ حجرے اب تک موجود ہیں، جہانگیر کے عہد میں طلبہ کے لئے وظائف بھی مقرر تھے، اس پر متعدد گاؤں وقف تھے، ۹۵۰ھ سے ۹۹۰ھ تک شاہ صاحب اس کو خود چلاتے رہے، پھر ان کے لڑکے اور پوتے چلاتے رہے، گیارہویں صدی کے آخر تک یہ پورے عروج پر تھا، مدرسہ ہدایت بخش قائم ہوا تو اس پر زوال آ گیا،

مدرسہ ہدایت بخش | مدرسہ ہدایت بخش کے ناظم مولانا شیخ نور الدین تھے، اس کے لئے ایک سرکاری طبیب مقرر تھا، جو طلبہ کی طبی نگرانی کرتا تھا، اور مفت علاج کرتا تھا، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا[۱]

مدرسہ اسحاق بھروچ | مولانا اسحاق علامہ شاہ وجیہ الدین کے شاگرد تھے، انھوں نے تکمیل تعلیم کے بعد بھروچ میں ایک مدرسہ عالیہ قائم کیا، جس کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی تھا، عہد جہانگیر میں اس کے اخراجات کے لئے کچھ موضع بھی وقف تھے، مولانا اسحاق کے بعد عرصہ تک یہ مدرسہ قائم رہا، پھر تنزل کرتے کرتے ایک معمولی مکتب کی شکل میں آ گیا، ۱۹۲۱ء میں راقم اپنی تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں بھروچ گیا تھا، تو اس وقت یہ مدرسہ بند ہو چکا تھا، مکانات خالی پڑے تھے، یہ مدرسہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۲ء) کے آگے پیچھے غالباً قائم ہوا تھا، وہاں ابھی حال میں طلبہ کے لئے ایک بورڈنگ تعمیر ہو گیا ہے، مشہور ہے کہ اس مدرسہ سے پہلے ۹۴۴ھ

---

[۱] خاتمہ مراۃ احمدی ص۱۰ کلکتہ،

میں ایک مدرسہ یہاں موجود تھا، ممکن ہے بعد میں اُس کے بند ہو جانے پر اسی کی تجدید کی گئی ہو۔

عالمگیری مدرسہ نہروالہ پٹن میں ایک مدرسہ عالیہ کی بنیاد عہد عالمگیر میں رکھی گئی، جس کا نام "فیضِ صفا" تھا، اس میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم ہوتی تھی، اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی۔ اس پر ایک کتبہ ہے، جس میں مندرجۂ ذیل شعر درج ہے،

بنا شد مدرسہ و مسجد پر فیض صفا ۔۔۔ در ہزار و نود و دو ز عنایات خدا

اس کے ساتھ دارالاقامہ بھی تھا، جس میں بڑے آرام سے رہتے تھے، احاطۂ مسجد و مدرسہ کے باہر طلبہ کے غسل کے لیے قدیم طرز کا ایک حمام بھی تھا، طلبہ کو وظائف بھی ملتے تھے، یہ مدرسہ بند ہو چکا تھا، لیکن حال میں پھر اس کا افتتاح ہوا ہے، اور اس کا نام "کنز مرغوب" رکھا گیا ہے، بعض اساتذہ بلا معاوضہ تعلیم دیتے ہیں، کسی قدر ریاست بڑودہ سے امداد ملتی ہے، کچھ چندہ اور کرایہ کی آمدنی ہے، اس میں ایک مخطوطات کا بہت اچھا کتب خانہ تھا، جو اب بہت خستہ حالت میں ہے، کاش اہل پٹن اس طرف توجہ کرتے،

صدر جہاں کا مدرسہ گجرات میں بنبانی ایک مشہور خاندان گذرا ہے، جس کے زیادہ تر افراد اہلِ علم اور مصنف ہوئے ہیں، اور اُن کی تصانیف گجرات کے تمام مدارس میں زیرِ درس رہی ہیں، اس خاندان کے گل سرسبد قاضی صدرالدین کے لڑکے ملک القضاۃ صدر جہاں حسام الدین

بنبانی تھے، جو بڑے جید عالم اور فاضل تھے، اُن کا ایک مدرسہ تھا، جو سلطان محمود اعظم کے عہد تک قائم تھا، اس خاندان کے لوگوں کی کتابیں زیادہ تر فنِ تفسیر، نحو، ادب، حدیث، تصوّف میں ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں انہی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، معقولات سے اس خاندان کو کم دلچسپی تھی، اس خاندان میں مولانا فیض اللہ، مولانا زین العابدین، مولانا حسام الدین قاضی صدر الدین مولانا منہاج الدین بن صدر الدینؒ بڑے پایہ کے عالم اور مصنف گذرے ہیں، اس مدرسہ میں بڑے اچھے لوگ تعلیم پاتے تھے اور بڑے بڑے علما، پیدا ہوئے، صدر جہاں قاضی صدر الدین کا اصل وطن چانپانیر تھا، لیکن بود و باش احمد آباد میں تھی، اور مدرسہ بھی یہیں تھا، میاں مخدوم جو حضرت شاہ عالم کے متوسلین میں تھے، اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے، صدر جہاں کی موت احمد آباد میں ہوئی، اور نور گنج میں علم و فن کا خزانہ دفن کیا گیا۔[۱]

مدرسہ عمادیہ | مولانا عماد الدین محمد بن محمود طارمی ایک مشہور اہلِ علم تھے، طارم شیراز کے پاس ایک گاؤں کا نام ہے، یہ یہیں کے رہنے والے تھے، تکمیل تعلیم کے بعد حضرت شاہ عالم کی ملاقات کے لئے گجرات آئے، جن کی دعا سے وہ پیدا ہوئے تھے، لیکن اُن کے آنے سے پہلے شاہ عالم وفات پاچکے تھے، گجراتیوں نے مولانا عماد الدین کی اتنی قدر دانی و حوصلہ

---

[۱] مولانا منہاج الدین بنبانی، شیخ احمد کھٹو ی متوفی ۸۴۹ھ (۱۴۴۵) کے جو سلطان احمد شاہ اوّل کے عہد میں تھے، ہم عصر تھے،

کی کہ وہ یہیں رہ پڑے، علوم نقلیہ وعقلیہ کے ماہر تھے خصوصاً علوم عقلیہ میں اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، علم سیمیا اور کیمیا سے بھی واقف تھے، تصوّف کا بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں، ان کے مدرسہ میں طلبہ بڑا مجمع رہتا، بڑے بڑے لوگ اس سے فارغ ہوکر نکلے، حضرت شاہ وجیہ الدّین علوی اور قاضی عیسیٰ انہی کے شاگرد رشید ہیں، انھوں نے متعدد سلاطین گجرات کا عہد دیکھا، محمود اعظم، مظفر شاہ اور بہادر شاہ کے بعد دیگرے اُن کے سامنے تخت نشیں ہوئے، حضرت ملک قطب الدین خلیفہ حضرت شاہ عالم کے مرید تھے، گجرات پر ہمایوں کے حملہ کرنے سے پہلے وہ پٹن نہروالہ میں تھے، دوسری جمادی الاوّل ۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے، اسی تاریخ میں اُن کا عرس ہوتا ہے[۱]۔

مدرسہ کردیہ یہ مدرسہ مولانا احمد بن سلیمان سے منسوب ہے، ان کا اصل وطن کردستان تھا، اُن کے والد مولانا سلیمان پہلے دہلی آئے، اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی سے فیضیاب ہوئے، پھر گجرات وارد ہوئے، مولانا احمد نے مولانا محمد شریف، مولانا ولی محمد، شیخ فرید، دیانت خان شاہ تباو سے تعلیم حاصل کی، اور فنِ حدیث کی تحصیل اپنے والد سے کی، اپنے وقت کے بہترین عالم تھے، علوم نقلیہ میں خاص کمال حاصل تھا، اُن کا مدرسہ بڑا بارونق تھا، ایک بڑی جماعت نے اُن سے استفادہ

---

[۱] ظفر الوالہ جلد اول ص ۲۴۴، لندن و خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۰۱ کلکتہ۔

کیا، اور وقت کے بڑے بڑے علما اور فضلاء انہوں نے ان کے مدرسہ سے پڑھ کر نکلے، جن پر گجرات بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، مولانا نورالدین جیسے کامل الفن بزرگ اُن کے ارشد تلامذہ میں تھے، یہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ "فیض القدس" اُن کی مشہور کتاب ہے، جس کا مصنف مرأۃ احمدی بڑا مداح ہے، کہتا ہے، کہ اس کتاب کو تو الہامی کہنا چاہئے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس کی بعض کتابیں درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہیں، اکبر اعظم کے عہد میں جب کہ خان اعظم احمد آباد کا ناظم تھا، بتاریخ ۲۰ رجمادی الثانی ۱۰۰۰ھ بروز دوشنبہ بوقت عصر وفات ہوئی، تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے،

شمعے کہ بود انجمن گل شد[۱]

۱۰۰۰ھ
۱۵۹۱

مولانا سلیمان اور مولانا احمد دونوں کی قبریں موسیٰ سہاگ کی مسجد کے پیچھے مغرب جانب ہے، اُن کے ایک چھوٹے بھائی تھے، جن کا ذکر آگے آرہا ہے،

مدرسہ عالیہ کتیانہ کتیانہ (کاٹھیاواڑ) میں ایک مدرسہ ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷) میں قائم تھا، اس کے بانی شیخ مخدوم ابراہیم بن سلیمان تھے۔ یہ احمد بن سلیمان کے

---

[۱] خاتمہ مراۃ احمدی ص ۱۰۲ کلکتہ،

سب سے چھوٹے بھائی تھے، اور اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ عمر پائی، یعنی تقریباً سوا سو برس زندہ تھے، مدرسہ کے ساتھ ایک بورڈنگ بھی تھا، جہاں طلبہ رہتے تھے، اخراجات کے لئے کچھ زمین بھی عطا ہوئی تھی، میرے دوست عبدالمجید صاحب قادری سجادہ نشین نے اس کے مفصل حالات لکھ کر مجھکو دئیے تھے، لیکن بمبئی میں میرے ایک عزیز کی غفلت سے جہاں میری بہت سی منتخب کتابیں ضائع ہوگئیں یہ بھی ضائع ہوگیا، جب میں کتیانہ گیا تو معلوم ہوا کہ چودھویں صدی کی ابتدا ہی میں یہ مدرسہ بند ہوگیا،

مدرسۂ اعظم سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں گجرات کا صوبہ دار (ناظم) اعظم خاں تھا، اس نے ایک محل، ایک سرائے اور ایک مدرسہ عالیہ پایہ تخت احمد آباد میں تعمیر کرایا تھا، یہ مدرسہ آخر زمانہ میں بڑا مشہور ہوا، احمد آباد میں قلعہ بھدر سے متصل جو سابق جنرل پوسٹ آفس کی عمارت ہے، وہی اعظم خاں کی سرائے تھی، فی الحال اس میں ایک کورٹ اور کچا جیل خانہ ہے، مدرسہ بھی اسی کے پاس تھا جس کی یاد اب کتابوں میں رہ گئی ہے۔

مدرسۂ سیف خاں نواب سیف خاں نے قلعہ احمد آباد کے سامنے سنہ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں ایک شاندار عمارت میں جس کی کوئی مثال تمام گجرات میں نہیں تھی، اس مدرسہ کا افتتاح کیا تھا، اس کا نام مدرسۃ العلماء تھا، غالباً مرہٹہ گردی میں تباہ ہوگیا، اب اس کا کچھ پتہ نہیں ہے

مدرسۂ عیدروس سید محمد عیدروس کے مزار کے پاس حاجی زاہد بیگ نے

بزمانۂ تولیت شیخ جعفر صادق بمقام سورت ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۱) میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا، جس میں عرصۂ دراز تک علوم و فنون کی تعلیم دیجاتی رہی،[51]

مدرسۂ مرجان شاہی | مرجان شامی کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم تھا، جس کے لئے نواب ظفریاب خاں نے ایک خاص عمارت تعمیر کرائی جس کی تکمیل نواب صاحب کے پوتے حاجی میاں نے کی،[52]

مدرسہ امانت خانی | ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱) میں امانت خاں متصدی سورت نے ایک مدرسہ عالیہ حضرت خواجہ دیوانہ کی خانقاہ میں قائم کیا تھا، تاریخ و سال بنا کے دو بیت مندرجۂ ذیل ہیں،

خانے کہ امانتش بدیں داد جلا — بہر علمار مدرسہ فرمود بنا

سال تاریخش از خردم پرسیدم — فی الحال بمن گفت مقام الفضلا

شجاعت خاں کا مدرسہ | عہد عالمگیر میں شجاعت خاں ایک بڑا بیدار مغز گجرات کا صوبہ دار تھا، جس سے عالمگیر عمر بھر خوش رہا، گجرات کے لوگ اس کے عہد میں بڑے مرفہ الحال رہے، اس نے اپنے مقبرہ کے ساتھ ایک عالیشان مدرسہ کی بھی بنیاد رکھی تھی، جو اسی کے سامنے ۱۱۰۴ھ (۱۶۹۲) میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، اس مدرسہ میں ہر قسم کی دینی تعلیم ہوتی تھی،[53] دارالاقامہ بھی تھا، طلبہ کے قیام کے ساتھ ان کے اخراجات کا بھی معقول بندوبست تھا، جب یہ بندوبست ختم ہو گیا، تو مدرسہ بھی بند ہو گیا، اب اس میں یتیم خانہ

---

[51] حقیقۃ السورت مطبوعہ بمبئی، [52] ایضاً [53] حقیقۃ الہند قلمی ص ۱۱۰ کتبخانہ بخشو میاں سورت،

کھول دیا گیا ہے، اور عمارت کو دو منزلہ کر دیا گیا ہے، جس سے اب ...... طلبہ کے لئے بڑی گنجائش ہو گئی ہے، مسلمان طلبہ کے لئے احمد آباد میں کوئی بورڈنگ نہیں تھا، جس سے اُن کو سخت تکلیف ہوتی تھی، مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس سے بورڈنگ کا کام بھی لیا جا رہا ہے، اور مسلمان طلبہ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں، اگرچہ اُن کی تعداد بہت محدود ہے، یہ جناب سر محبوب میاں قادری کے زیر انتظام تھا، ۱۹۴۰ء میں اُن کی وفات ہو گئی،

مدرسہ ہدایت بخش | شیخ الکل مولینا شیخ نور الدین کا مدرسہ بہت مشہور تھا، محمد اکرام الدین خاں شیخ الاسلام نے جو حضرت شیخ کے شاگرد اور مرید خاص تھے، بمقام احمد آباد محلہ استوریہ میں خاص آپ کیلئے ایک مدرسہ قائم کیا، اور اس کا نام "مدرسۂ ہدایت بخش" رکھا، ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں اُسی کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی، ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں ان عمارتوں کی ابتدا ہوئی، اور ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں مدرسہ، مسجد، دار الاقامہ وغیرہ تمام عمارتیں مکمل ہو گئیں، مدرسہ کی تاریخ "بنا فیہا الھدی للعالمین" سے نکلتی ہے اُن کی تعمیر میں ایک لاکھ ۲۴ ہزار روپیہ صرف ہوئے تھے، طلبہ کے رہنے کے لئے ایک بورڈنگ بھی بنوایا، اور اُن کے وظائف اور اخراجات کے لئے متعدد گانوں وقف کئے[1]، دور دور سے طلبہ یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء تک شیخ الاسلام خود اس کے ناظم رہے، اُن کے بعد لڑکوں اور پوتوں کے زیر نگرانی یہ مدرسہ چلتا رہا، جو اس وقت تک ترقی کر کے

---

[1] آثار الکرام جلد اول ص ۱۰۰، آگرہ،

فرسٹ کلاس کا کالج بن گیا تھا، اس میں دینی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ دنیوی علوم کی بھی اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم ہوتی تھی، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، ۱۱۷۱ھ تک یہ کالج قائم رہا، اور اسی کے بعد مرہٹہ گردی میں بالکل تباہ ہو گیا، مسجد آج تک محلہ والوں کے قبضہ میں ہے، بورڈنگ کی صورت مسخ کر کے کمروں کو کرایہ پر دیدیا گیا ہے، احمد آباد میں مسلم طلبہ کی جو تعداد ہے اسکے لحاظ سے کوئی بورڈنگ نہیں ہے جس سے اُن کو سخت تکلیف ہے، اگر مسلمان ان کمروں کی آمدنی ہی سے پھر ان کو بورڈنگ کی شکل میں تبدیل کر دیں، تو مسلمان طلبہ کی ایک اشد ضرورت پوری ہو جائے۔

اسی مدرسہ میں مولانا سید سعد اللہ بن سید مرتضیٰ بلگرامی بعد فراغت حج آکر مقیم ہوئے تھے، رات عبادت وریاضت میں اور دن درس وتعلیم میں صرف کرتے تھے، آپ کے مشہور شاگردوں میں شیخ محمد طاہر احمد آبادی ہیں، ۱۱۱۹ھ میں اسی جگہ ان کا انتقال ہوا، اور شاہ بھیکن کے روضہ میں مدفون ہوئے، "یشرب من کاس کان مزاجہا کافوراً" سے تاریخ وفات نکلتی ہے[۱]۔

اس مدرسہ کے سالانہ اخراجات کا کوئی بندوبست نہیں تھا، مدرسین اور طلبہ بجید پریشان رہتے تھے ۱۱۱۲ھ میں طلبہ نے شیخ غلام محمد منصب دار شاہی کے توسط سے ایک درخواست بادشاہ کی خدمت میں ارسال کی،

---

[۱] مآثر الکرام جلد اول ص ۱۰۸، آگرہ

اس درخواست کی نقل میرے عزیز اور لائق دوست حکیم بہاءالدین صدیقی (ہردوئی) کے پاس موجود ہے شیخ غلام محمد ان ہی کے جد امجد تھے، جو عالمگیری منصب دار تھے، اور شاہزادہ اعظم شاہ صوبہ دار احمد آباد (۱۱۲۰ھ) کی ملازمت میں رہتے تھے، یہ صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس عہدہ پر تھے، اور ان کا کیا کام تھا، لیکن اُن کے وارثوں کے پاس جو کتب اور فرامین وغیرہ حوادث زمانہ سے بچ گئے ہیں، ان میں زیادہ تر ایسی درخواستیں ہیں، جن کو بادشاہ تک پہنچانے کی اُن سے التجا کی گئی ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ درباری پیش کار تھے، ۱۱۲۰ھ میں احمد آباد میں اُن کا انتقال ہوا، اور جنازہ احمد آباد سے اُن کے وطن گوپامئو (ضلع ہردوئی) میں لایا گیا، اور وہیں دفن کئے گئے، پھر اُن کے لڑکے غلام حسن اور پوتے غلام نبی سرکاری ملازمت میں آئے،

انہی فرامین اور خطوط میں ایک نقل مدرسۂ ہدایت بخش کے طلبہ کی بھی ہے جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، اور اسی کی مدد سے مندرجۂ ذیل سطور کا اضافہ کرتا ہوں جس کے لئے میں شیخ غلام محمد کے پرپوتے محمد بہاءالدین گوپامئوی کا شکر گذار ہوں،

اس وقت اس مدرسہ میں سات ماہرفن اساتذہ تعلیم دیتے تھے، جن کے نام یہ ہیں، (۱) ملا محمد حسین (۲) ملا شیخ محمد (۳) سید ہاشم (۴) سید احمد (۵) ملا عبدالنبی (۶) شیخ اللہ بخش اور (۷) شیخ نورالدین استاد کل کے شاگرد رشید مولانا شیخ فرید گجراتی، لیکن بدقسمتی سے درخواست دینے سے پہلے ہی ان کی

وفات ہوگئی، خود شیخ نور الدین استاد کل اُس کے افسر اعلیٰ تھے، ان معلموں نے طلبہ کی درخواست پر اپنی اپنی سفارشیں بھی لکھی ہیں،

ان میں سے ایک نے لکھا ہے، ھذہ المدرسۃ الشامخۃ البناء مشحونۃ بالمحصلین والعلماء وھو مفتقرون الی کرم السلطان المزنی، للفضلاء، دوسرے نے لکھا ہے: ھذہ المدرسۃ الراسخۃ الاساس معمورۃ بتکمیل الناس واھلھا محتاجون الی تفضل الخلیفۃ الخارج اوصافہ عن القیاس، ایک صاحب نے لکھا ہے: ھذہ المدرسۃ الرفیعۃ الشان معمورۃ من الطلبۃ واھل العرفان، وھم محتاجون الی تفضل خلیفۃ الرحمان، ایک مدرس نے تحریر کیا ہے: ھذہ المدرسۃ العلیۃ موطن لاھل العلوم الدینیۃ والمعارف الیقینیۃ وھو فرقۃ ضعیفۃ الاحوال، شاغلین عن المعاش لشغلھم باموار المعاد راجین تفضل خلیفۃ اللہ، ملا عبد النبی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ھذہ المدرسۃ رفیعۃ القدر مسکونۃ للمساکین الفضلاء وطلاب العصر المفتقرۃ الی اعانۃ الخلیفۃ الساعی فی اعلاء کلمۃ اللہ الشریعۃ شیخ احمد لکھتے ہیں، ھذہ مدرسۃ منیفۃ مشحونۃ لطلبۃ حفیفۃ وھم محتاجون الی التفضل من باب الخلیفۃ الذی لا یعنی البیان باوصاف الجلیلۃ، ان میں سے ہر شخص نے اپنے آپ کو علامہ نور الدین کا شاگرد اور مرید بتایا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اور استاد نے ان سب کو اسی مدرسہ میں معلم رکھ لیا، اور یقیناً یہ اپنے تمام معاصرین میں درس و تدریس کے لحاظ سے ممتاز

رہے ہوں گے،

دوسری بات یہ ہے کہ اس عہد میں علمائے حق سفارش کرنے میں کس طرح اپنے وقار کو قائم رکھتے تھے، اور سوال سے پرہیز کرتے تھے، تیسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ ہر استاد نے اپنی سفارش میں تین باتوں کا اظہار کیا ہے۔ (۱) مدرسہ بڑا ہے۔ (۲) طلبہ سے بھرا ہوا ہے۔ (۳) بادشاہ کی توجہ اور عطیہ کے محتاج ہیں، چوتھی بات یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کو مختلف اساتذہ نے مختلف عبارتوں میں ادا کیا ہے۔ جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے،

درخواست چار غیر ملکی ممتاز طلبہ کی طرف سے لکھی گئی ہے، جن کے نام یہ ہیں عبدالکریم قطبی رضوی بخاری، زین العابدین شیرازی، رحمت اللہ مغربی، محمد عوض تورانی، تاکہ بادشاہ پر ان پردیسیوں کے سبب سے خاص اثر پڑے اور اس کے اندر ان پر رحم کا جذبہ جلد سے جلد پیدا ہو۔ باقی طلبہ کے دستخط اصل درخواست کے مضمون اور اساتذہ کی سفارشوں کے بعد ہیں

ان لوگوں نے درخواست میں لکھا ہے کہ احمد آباد کے مدرسۂ ہدایت بخش کے ہم طلبہ عرض پرداز ہیں کہ بادشاہ کے مبارک عہد میں صدر صوبہ شیخ محمد اکرام الدین کی سعی و کوشش سے مدرسہ، مسجد اور دار الاقامہ وغیرہ بڑے وسیع پیمانے پر تعمیر ہوئے، جہاں طلبہ دینی علوم حاصل کرتے ہیں، اور علماء دینی مسائل حل کرتے ہیں، بڑے بڑے علماء مدرسہ سے فارغ ہو کر اسی مدرسہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، مدرسہ احمد آباد اور دوسرے مقامات کے طلبہ سے بھر گیا ہے، جن کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے صدر مذکور ان

تمام طلبہ کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے، اس لئے ہم لوگ بڑی تنگی اور عسرت کے ساتھ گذارہ کر رہے ہیں، ہم لوگ امیدوار ہیں کہ کچھ بقدر کفاف طلبہ اور کچھ مدرسہ کے اخراجات کے لئے مرحمت ہو تاکہ فراغ بالی کے ساتھ ہم لوگ کسب کمال میں مشغول رہیں، اور دعائے خیر کرتے رہیں تاکہ ابدالآباد تک یہ مدرسہ جاری اور نیازی قائم رہے۔"

کسی کتاب سے اس کا پتہ نہیں چل سکا کہ عرضداشت کا کیا نتیجہ نکلا، لیکن علی محمد خاں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس مدرسہ پر چند گاؤں وقف تھے، اسی کیساتھ طرز بیان سے اس کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ صدر صوبہ شیخ الاسلام محمد اکرام الدین ہی کے وقف کئے ہوئے تھے، لیکن طلبہ کی درخواست دستیاب ہونے سے یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔[1]

---

[1] مرآۃ احمدی جلد اول ص ۳۴۴ کلکتہ میں ہے کہ

"بموجب التماس او بنا بر اخراجات مدرسین و طلبہ موضع سوندرہ معمولہ پرگنہ سانولی و موضع میٹھ عملہ پرگنہ کرڑی دو روپیہ یومیہ جہت لنگر از جناب اقدس مرحمت شد۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر صوبہ شیخ الاسلام اکرام الدین خاں کی درخواست پر بادشاہ نے یہ گاؤں دیئے، حالانکہ مرآۃ احمدی کے مصنف کی دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ طلبہ کی درخواست پر یہ موضع دیئے گئے تھے، یہ ہو سکتا ہے کہ صدر صوبہ نے بھی اس کے لئے سفارش کی ہو۔

مرأۃ احمدی میں ہے کہ

"موضع للسوندرہ عملہ پرگنہ سانولی متعلقہ پرگنہ سرکار چانپانیر در خرج مولود شریف حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم و موضع میٹھ عملہ پرگنہ کڑی و دناس عملہ پرگنہ پٹن و دو روپیہ یومیہ لنگر برائے صرف احتیاج طالب علمان مدرسہ مقرر وموظف شد"[1]

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کل تین گانوں وقف تھے، ایک میلاد مبارک کے اخراجات کے لئے اور دوسرا اور تیسرا طلبہ اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے اور دو روپیہ روزانہ اس خانقاہ کے لنگر خانہ کے لئے جہاں مسافر روزانہ آتے جاتے تھے،

طلبہ کی تعداد تقریباً ستر تھی، جو سب کے سب بورڈرس تھے، ڈے اسکالرس کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، شہر سے آنے والے لڑکوں کی تعداد کس قدر تھی، اس کا علم نہیں، اگر پچاس بھی فرض کرلیں تو احمد آباد جیسے شہر کیلئے جہاں کئی بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے عربی مدارس موجود تھے، یہ تعداد کم نہیں ہے، ان طلبہ میں سب سے زیادہ سادات تھے، ان کے بعد شیوخ، غیر ملکیوں میں توران، ایران، شام اور عرب کے تھے، باقی سب گجراتی اور ہندوستانی تھے،

افسوس ہے کہ مرہٹوں گردی میں یہ مدرسہ تباہ ہوگیا، مرأۃ احمدی کے

---

[1] مرأۃ احمدی کا خاتمہ ص ۵۰، کلکتہ لیکن بمبئی کے نسخہ میں موضع کا نام "لی وندرہ اور میٹھ" لکھا ہے،

مصنف نے لکھا ہے کہ اس وقت (سنہ ۱۱۷۰ھ) نہ مدرسہ ہے نہ طلبہ اور گاؤں پر مرہٹوں نے قبضہ کرلیا ہے[۱]،

فیروز جنگ کا مدرسہ | سنہ ۱۱۲۰ھ میں غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ جو مغلوں کے اوّل نمبر کے امیروں میں سے تھا، گجرات کا ناظم مقرر ہوا، اُس نے سلطنت کی ڈھیلی چول کو مضبوط بنا کر رفاہِ عام کے کام کرنے شروع کر دیئے، اس سلسلہ میں اس نے ایک مدرسہ بھی بنوایا، سنہ ۱۱۲۲ھ میں اسی جگہ اس کا انتقال ہوگیا، تو عارضی طور پر اسی مدرسہ میں مدفون ہوا،

ولی اللہ کا مدرسہ | احمد آباد میں موجودہ تیلیا مل کے پاس جو مسجد ہے، وہ اسی مدرسہ کی بقیہ یادگاروں میں سے ہے، پہلے یہاں بہت بڑا مدرسہ تھا، احمد بن سلیمان چونکہ فلسفہ، منطق، اقلیدس، حساب اور فلکیات میں بڑے ماہر تھے، اُن کے شاگرد بھی ان فنون میں بڑے ماہر ہوئے، چنانچہ ان فنون کی تعلیم اس مدرسہ میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی، مولانا عماد الدینؒ المتوجہ سنہ ۱۱۵۵ / ۱۳۳۲، مولانا نور الدینؒ مولانا ولی اللہ اپنے اپنے وقت میں اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ اور نگراں رہے، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، افسوس ہے کہ مرہٹوں کی لوٹ مار میں یہ مدرسہ تباہ ہوگیا، پھر معمولی طور پر اندرون شہر میں کالوپور کی اس مسجد میں جس کو آج کل ولی اللہ کی مسجد کہتے ہیں ایک مدرسہ قائم کیا گیا، یہ بھی بند ہوگیا،

مدرسہ خیریہ | اس کے بانی خیر الدین محمد زاہد سورتی ہیں، یہ مولانا محمد بن عبدالرزاق

---

[۱] مرآۃ احمدی جلد اوّل ص ۲۴۴، کلکتہ،

سعدی کے شاگرد تھے، حج کو گئے تو مولانا شیخ حیات سندی سے حدیث کی سند حاصل کی، ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء سے اس مدرسہ میں تعلیم دینے لگے، اس مدرسہ میں فن حدیث کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی، ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدی المصری حج کو جاتے ہوئے اسی مدرسہ میں کچھ دنوں رہ کر مستفید ہوئے تھے،

دارالارشاد احمد آباد میں ایک مدرسہ دارالارشاد کے نام سے قائم کیا گیا تھا جس میں علوم دینیہ کی تعلیم ہوتی تھی، یہ کب قائم ہوا، کس نے قائم کیا، کب بند ہو گیا، کچھ معلوم نہیں ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں یہ موجود تھا، اس میں ایک کتب خانہ بھی تھا، اس کتب خانہ کی ایک کتاب "مخازن المعروف" مجی قاضی نورالدین صاحب بھروچ کے کتب خانہ میں اس وقت موجود ہے۔ یہ معلومات مجھے اسی سے حاصل ہوئے ہیں،

بوہروں کا مدرسہ شیعہ اسماعیلیہ بوہروں کے ابتدائی مدارس آج کی طرح پہلے بھی پٹن، سدھ پور، کنبھایت، بھروچ، سورت میں تھے، مگر مدرسہ عالیہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۰ء سے پہلے تک صرف پٹن میں تھا، اس کے بعد احمد آباد منتقل ہو گیا، اور وہاں ۱۲۳۰ھ/۱۸۲۹ء میں بڑا با رونق ہو گیا، دور دور سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے آتے تھے، گجرات کے شیعہ بوہروں کے والی (مذہبی حاکم) اس کے حاکم اور نگراں ہوتے تھے[1]

۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں بوہروں نے مخصوص اپنے لئے احمد آباد میں ایک بڑے مدرسہ

---

[1] موسم بہار جلد سوم ذکر مولائی حسن صفدری بمبئی،

کی بنیاد رکھی، جس میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم ہوتی تھی، خصوصاً منطق، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، طب، مناظرہ، تاریخ، اور جغرافیہ کی تعلیم بڑے اعلیٰ پیانہ پر تھی، دینی علوم کی تعلیم کا بھی مکمل انتظام تھا، طلبہ کے اخراجات کا خود مدرسہ کفیل تھا، ایک دعوت فنڈ قائم تھا، اس کے علاوہ بوہرہ امرا، خاص طور سے اس کی مالی مدد کرتے تھے، غریب طلبہ کے علاوہ امرا، کے لڑکے بھی تعلیم پاتے تھے، سیدنا بدرالدین جام نگری جیسے علامہ اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے، ۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۴ء میں یہ مدرسہ جام نگر چلا گیا، اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے سورت، جہاں آج تک مدرسہ سیفیہ کے نام سے جاری ہے، عوام اور خواص دونوں طبقوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہے، اسی کے فارغ التحصیل اکثر مقامات پر حاکم (مذہبی) بنا کر بھیجے جاتے ہیں، جنھیں عامل، ملا، شیخ کہا جاتا ہے،

صنعتی مدارس

صنعتی مدارس بھی احمد آباد میں بکثرت تھے، مگر اُن کا طرز آج کل کے ٹکنیکل مدارس سے مختلف تھا، دستور یہ تھا کہ ایک کارخانہ کھولا جاتا تھا، کاریگر اس میں کام کرتے تھے، اور طلبہ کو اس میں عملی تعلیم دی جاتی تھی، ان میں بعض ایسے بھی ہوتے، جو نوشت و خواند سے بالکل محروم ہوتے لیکن اس تعلیم میں اُن کا نمبر پڑھے لکھے لڑکوں سے اچھا آتا، کارخانہ سے جو طلبہ فارغ ہو کر نکلتے وہ زیادہ تر اسی کارخانہ میں ملازم ہو جاتے اور ایسا اچھا کام کرتے کہ اُن کی مصنوعات کو دیکھ کر غیر ملکی حیرت زدہ رہجاتے،

اس میں تاجروں اور کاریگروں کے لڑکے زیادہ داخل ہوتے، اور بڑے شوق سے تعلیم حاصل کرتے،

اسی طرح انجینیرنگ، موسیقی اور دیگر چیزوں کے بھی متعدد مدارس تھے جن میں ہندو مسلمان بلا روک ٹوک تعلیم حاصل کرتے تھے، اور وہاں سے فارغ ہوکر گجرات کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے، سنہ ۹ھ (۱۴۸۵ء) میں "گنیشا" نامی ہندو اس عہد کا ایک ماہر انجینیر تھا، اور ایشرداس ناگر پٹنی مصنف فتوحات عالمگیری گیارہویں صدی ہجری میں اپنے وقت کا بہترین ادیب،

موسیقی کے مدارس

موسیقی کے مدارس بھی یہاں بہت تھے، بہادر شاہ کے عہد میں اس کو بڑا عروج تھا، اور اس کی دریا دلی نے بہت سے لوگوں کو اس فن کی طرف مائل کر دیا، اور بڑے بڑے استاد اس فن کے پیدا ہوگئے، دریا خاں وزیر محمود ثالث کو اس کا بڑا ذوق تھا، اور اُس نے خاص طور سے اس فن کی ترقی اور عروج کی طرف توجہ کی، اُس کے عہد میں اس قدر استادانِ فن گجرات میں جمع ہوگئے کہ اس کی مثال نہیں ملتی،

گجرات کے اسلامی کتب خانے

ممکن ہے گجرات میں کتب خانہ اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے وہاں کے نوآباد کار مسلمانوں کے عہد میں بھی رہا ہو، جیسا کہ مولینا محمد یعقوب صاحب الموجود ۶۵۶ھ (۱۲۵۸) کے جامع مسجد پٹن میں قیام سے خیال ہوتا ہے، لیکن تاریخ میں صراحتہً اس کا کوئی ذکر نہیں ہے[۵۱]

گجرات کا شاہی کتب خانہ

گجرات میں سلطان احمد متوفی ۸۴۶ھ (۱۴۴۲) نے خودمختار حکومت قائم کی، تو اس کے دربار میں تمام علوم وفنون کے اہل کمال جمع ہوگئے، اُن کے فیض صحبت سے اُس نے رفاہ عام کے جن کاموں کو شروع کیا، ان میں ایک کتب خانہ بھی تھا، سلطان محمد ثانی بن احمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ (۱۴۵۱) نے مدرسہ شمع برہانی کے طلبہ کے لئے اسی شاہی کتب خانہ سے کتابیں نکال کر وقف

---

۵۱ خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۲، ۳، بمبئی،

کی تھیں[۱]، اکبر نے جب گجرات فتح کیا، تو اس کی کچھ کتابیں اگرہ لے گیا، اور کچھ لوگوں میں تقسیم کر دیں، چنانچہ اسی تقسیم میں کچھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور کچھ ملا عبدالقادر بدایونی کے حصہ میں بھی آئیں۔ اور کچھ اکبری دربار کے مشہور شاعر فیضی کو بھی ملیں، باقی شاہی کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں[۲]۔

عثمان پورہ کا کتب خانہ مدارس کے ضمن میں آپنے پڑھا ہوگا کہ شیخ محمد عثمان شمع برہانی خلیفہ حضرت قطب عالم متوفی ۸۶۲ھ/۱۴۵۲ء بڑے پایہ کے بزرگ تھے، سابرمتی ندی کے اس پار ایک محلہ نون بسا کر اس کا نام عثمان پورہ رکھا تھا، اسی محلہ نون میں سلطان محمد شاہ کی مدد سے ایک مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، جس میں اور کتابوں کے علاوہ شاہی کتب خانہ کی وقف شدہ کتابیں بھی تھیں، ۸۶۳ھ/۱۴۵۸ء تک تو شیخ عثمان خود اس کے نگراں اور منتظم رہے، پھر ان کے لڑکے اور پوتے اس کے ناظم ہوئے مرہٹوں کی لوٹ مار میں یہ تباہ ہو گیا، مسجد اور مقبرہ اب تک بطور یادگار کے قائم ہیں۔

سرخیز کا کتب خانہ سرخیز میں شیخ احمد کھٹوی مستقلاً قیام پذیر تھے، جہاں اپنی زندگی میں انھوں نے مسجد، تالاب اور خانقاہ تعمیر کرائی، محمد شاہ نے آپ کے بعد اسی جگہ مقبرہ اور ایک مدرسہ بنوایا، جس میں کتب خانہ بھی رہا ہوگا لیکن شیخ احمد کھٹوی کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، چنانچہ ایک موقع

---

[۱] ظفر الوالہ ج ا ص ۲۲۳ لندن [۲] تاریخ بدایونی جلد دوم ص ۲۰۰ کلکتہ۔

حدیث کی کتاب مصابیح اپنے کتب خانہ سے نکال کر حاضرین مجلس کو ایک حدیث سنائی تھی[۱]، مرقاۃ الوصول میں ہے کہ قاضی عبدالرزاق مبارک ابواسحٰق جو آپ کے مخلص ملازموں میں سے تھا، وہ اس کتب خانہ کا ناظم اور کاتب تھا، لوگ آپ کو قاضی بڈھہ مبارک بھی کہتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتنی زیادہ کتابیں تھیں کہ اُس کے انتظام کے لئے ایک مستقل ناظم اور کاتب رکھنا پڑا، حضرت شیخ کتابوں کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے[۲]

شاہ عالم کا کتب خانہ | گجرات کے مشہور بزرگ حضرت محمد شاہ عالم متوفی ۸۸۰ھ بڑے زبردست عالم بھی تھے، مطالعۂ کتب کا بڑا شوق تھا، مطالعہ کے لئے ٹیک لگانے سے دونوں ہاتھوں میں نشان پڑ گئے تھے، ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا[۳] جس میں عام کتابوں کے علاوہ نایاب اور نادر کتابیں بھی تھیں، چنانچہ جب مولانا صدر جہان اُن سے ملنے گئے، تو اُن کو امام رازی کی ایک کتاب کا ایسا نسخہ دکھایا، جس کی موصوف کو خبر نہ تھی[۴] اُن کے جانشین بھی اس کتبخانہ کو برابر ترقی دیتے رہے، سید جعفر بدر عالم متوفی ۱۱۷۴ھ کے زمانہ میں یہ بڑے عروج پر تھا، ہزاروں کتابیں خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر کتب خانہ میں داخل کیں، ایک مرتبہ رات کے وقت راستہ میں ایک سائل نے قرآن پاک کا ایک نسخہ طلب کیا، فرمایا صبح کو آنا، کتب خانہ سے دیدوں گا، اُس نے کہا کہ اس وقت آپ کے پاس جو موجود ہے، اسی کو دیدیں، آپنے مجبوراً

---

[۱] تحفۃ المجالس قلمی مجلس ۲۰ [۲] مرقات الوصول ص ۵، و ۱۳۰ قلمی [۳] مرآۃ احمدی ج ۱ ص ۲۰۵ کلکتہ [۴] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۴۴ قلمی،

دے دیا، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک یہ کتب خانہ بہترین حالت میں تھا، مرہٹوں کی جنگ میں اس کا بڑا حصہ جل گیا، جو بچا، لوٹ مار کے ڈر سے آپ کے اخلاف شہر پناہ کے اندر لے آئے، لیکن کافی حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ کتب خانہ برباد ہو گیا، کچھ بچی کھچی کتابیں اب تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہیں،

| کتب خانہ آصف خاں | عبدالعزیز آصف خان متوفی ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ گجرات کے بہترین

وزیروں میں سے تھا، بہت بڑا عالم، فاضل، صاحب ذوق، اہل علم کا قدردان اس کا ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس میں بڑی نایاب کتابیں تھیں، وہ مکہ سے اپنے کتب خانہ کے لئے بہت سی کتابیں بھی خرید کر لا رہا تھا، لیکن منگلور پہنچا تو دریا میں طوفان آ گیا، خود تو بچ گیا، لیکن جہاز ڈوب گیا، اور اس کے تمام تحائف سفر ضائع ہو گئے، اس کو اپنی بجلی کی تلوار، غلام، اصیل گھوڑے، اور بیش قیمت اور نادر کتابوں کے تلف ہو جانے کا عمر بھر افسوس رہا، ان میں ایک نسخہ مشکوٰۃ شریف کا بھی تھا، جو اُس کے مؤلف ولی الدین خطیب تبریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، یہ کتاب اُس نے مکہ معظمہ میں خریدی تھی، اور قیمت میں اُس کے وزن کے برابر سونا دیا تھا، اس کے علاوہ چالیس اشرفی اس کے دلال کو دی تھی[۱]،

| امرتھیا کا کتب خانہ | امرتھیا (کاٹھیاواڑ) میں ایک کتب خانہ تھا، جس کے منتظم

شیعہ بوہروں کے عامل تھے، اس میں دینی تاریخی اور معقولات کی کتابیں

---

[۱] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۰۰ لندن،

زیادہ تھیں، یہ سیدنا داؤد بن عجب شاہ کا زمانہ تھا، انھوں نے اپنے دورے کے سلسلہ میں اس کا معائنہ بھی فرمایا تھا[۱]

مولانا طارمی کا کتبخانہ | مولانا محمد بن محمود طارمی علومِ عقلیہ کے بڑے ماہر تھے، شیراز سے گجرات تشریف لائے، تو اپنا کتب خانہ بھی ساتھ لائے، یہاں انھوں نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، کتب خانہ بڑا لاجواب تھا، جس میں ایران کی بہت سی نئی کتابیں بھی تھیں، ہمایوں کے آنے سے پہلے ہی مُن میں ان کا انتقال ہو گیا،[۲]

مسند عالی کا کتب خانہ | مسند عالی شمس خاں بن شیخ داؤد قریشی نائب شمس خان المعروف بہ کردری بہت بڑے عالم، فاضل اور مدبر تھے، کتابوں کا بحد شوق تھا، ان کا کتب خانہ ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء میں موجود تھا، فقہ کی مشہور کتاب نصاب[۳] الاحتساب جو درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، وہ اسی کتب خانہ کی ہے، یہ کب ضائع ہوا، اس کا پتہ نہ چل سکا، کیا عجب ہے کہ اکبر کے قبضۂ گجرات کے وقت لوٹ کے نذر ہو گیا ہو، مذکورۂ بالا شمس خاں کا کوئی ذکر گجرات کی تاریخوں میں نہیں ملتا، لیکن ستہ رسائل میں ایک شمس خاں نولی وزیر مظفر شاہ آخری کا البتہ ذکر ملتا ہے،

احمد بن سلیمان کا کتب خانہ | مدارس کے سلسلہ میں احمد بن سلیمان کا ذکر آچکا ہے[۱۱] ان کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا، اُن کے بعد اُن کے ورثا جس طرح اُن کا مدرسہ چلاتے رہے، کتب خانہ کی بھی حفاظت کرتے رہے، لیکن ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ء میں اُن کے

---

[۵] مرسم بہار جلد سوم بمبئی [۵۲] ظفر الوالہ جلد اص ۲۴۶ لندن،

پوتے محمد رضا بن غلام محمد بن احمد بن سلیمان کے زمانہ میں جب ترکہ تقسیم ہوا تو کتب خانہ کے بھی حصے بخرے ہوگئے، اُن کی ایک بہن فاطمہ تھیں، کچھ کتابیں اُن کے حصہ میں بھی آئیں، اُن میں سے بعض کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہیں۔

آمود کا کتب خانہ آمود (ضلع بھروچ) کے ٹھاکر صاحب کا کتب خانہ اس عہد کا مشہور کتب خانہ تھا، ۱۲۰۲ھ میں ایک انگریز نے اس کو دیکھا تھا، اس میں صرف فارسی کی تین ہزار خوشخط کتابیں تھیں، جن کی مراکو کے سُرخ چمڑے کی حسین جلدیں تھیں، کل کتابوں کی قیمت بارہ ۱۲ لاکھ تھی، حفاظت کے خیال سے تمام کتابوں پر گلی کا کپڑا چڑھا ہوا تھا، جس پر سنہرا کام بنا رہتا تھا، کتب خانہ کا خاص عملہ تھا، جن میں خطاط، نقاش، خوش نویس، جلد ساز، اور ناظم کتب خانہ سب شامل تھے، یہ کتب خانہ اب بھی ٹھاکر صاحب کے وارثوں کے پاس موجود ہے لیکن سُنا ہے کہ کتابیں بہت تھوڑی رہ گئی ہیں[1]،

علامہ محمد بن طاہر کا کتب خانہ نہروالہ پٹن میں علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ ایک مشہور محدث گذرے ہیں، اُن کے بیٹے اور پوتے حکومت میں بڑے بڑے منصب پر فائز تھے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں انھوں نے عرب و عجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان میں علم رہا، کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ ضائع گئیں، اُن کا کچھ حصہ آج بھی اُن کے وارثوں کے پاس موجود ہے، میں نے جب ۱۹۳۲ء میں اس

---

[1] بمبئی گورنمنٹ ریکارڈ نمبر ۱۶ نیو سیریز ص ۲۲۳،

کتابخانہ کو دیکھا تو بہت افسوس ہوا کیونکہ اس وقت اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا اگر آئندہ کوئی سامان نہ ہوا تو جتنا بچا کھچا رہ گیا ہے وہ بھی تلف ہو جائے گا، کتاب مجمع بحار خاص مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کتب خانہ سے نکال کر لوگوں نے مجھے دکھائی تھی، مگر کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہ ہو سکی،

علوی کتب خانہ | علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ ۱۵۸۹ء کی احمد آباد میں ایک مقدس ہستی تھی، آپ نے ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو آپ کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۰ء تک قائم رہا، اسی کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، جو اتنا بڑا تھا کہ شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس کی کوئی کتاب اس میں موجود نہ ہو، بزرگوں کا بیان ہے کہ دو بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں، جب خاندان سے علم جاتا رہا، تو کتابیں بھی ضائع گئیں، اس صدی کی ابتدا میں مولوی عبدالمنعم صاحب مرحوم خطیب جامع مسجد بمبئی، اور جناب یوسف صاحب بی اے، کھٹکے مرحوم بمبئی بہت سی کتابیں اٹھالے گئے، میں نے ۱۹۲۱ء میں جب اس کتب خانہ کو دیکھا تو محض چند صندوقوں میں کتابیں رکھی تھیں، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے ان میں سے، کچھ کتابیں احباب کے نذر ہو گئیں، اور کچھ دریا سے سابرمتی کی لہروں نے اپنے آغوش میں لے لیں، کچھ کتابیں بطور یادگار میرے دوست سید منظور الحسن صاحب عرف حسینی پیرا اور بڑے میاں صاحب موجودہ متولی درگاہ کے پاس ہیں،

پٹن کا کتب خانہ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں پٹن میں "فیض منعا" کے نام سے جو مدرسہ قائم ہوا تھا، اسی کے ساتھ مسجد میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، راقم نے ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں جب اس کو دیکھا تو بڑے برے حال میں تھا، نایاب کتابیں بہت کم رہ گئی تھیں، پھر بھی قلمی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا،

مخدوم ابراہیم کا کتب خانہ کاٹھیاواڑ میں کتیانہ ایک مشہور قصبہ ہے ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷ء) میں یہاں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا تھا، اس کے بانی مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان تھے، اُن کی وفات ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں ہوئی، یہ مدرسہ پچھلی صدی تک قائم تھا، راقم الحروف نے جب ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں اس کو دیکھا تو بہت معمولی درجہ پر آگیا تھا، جس میں مطبوعات کے علاوہ کچھ قلمی کتابیں بھی تھیں، متولی صاحب فرماتے تھے کہ اس کا بڑا حصہ جوناگڑھ کے لوگ اٹھالے گئے،

کتبخانہ مدرسہ ہدایت بخش مولانا شیخ نورالدین احمد آباد میں یگانۂ روزگار عالم تھے، متقی صوفی، عالم اور فلسفہ و منطق و ریاضی کے بڑے ماہر، شیخ الاسلام نے "ہدایت بخش" کے نام سے اُن کے لئے جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس میں ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، خواص کے ساتھ عوام بھی اس کتب خانہ سے فیضیاب ہوتے تھے، مرہٹہ گردی میں مدرسہ و کتب خانہ دونوں برباد ہوگئے، اس کتب خانہ کی کچھ کتابیں، کتب خانہ، درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں موجود ہیں، اور کچھ قاضی نورالدین (قاضی بھروچ) کے کتبخانہ میں،

کتب خانۂ سیفیہ | دسویں صدی ہجری کے وسط تک احمد آباد شیعہ بوہروں کا مرکز تھا، اُن کا والی یا داعی یہیں قیام کرتا تھا، داعی کے زیر نگرانی جو مدرسہ تھا اسمیں ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں تھیں ۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۴ء کے بعد یہ کتب خانہ جام نگر (کاٹھیاواڑ) منتقل ہوگیا، پھر سورت چلا گیا، جہاں داعیِ وقت سیدنا ملا طاہر سیف الدین کے زیر نگرانی اچھی حالت میں ہے، اور اس فرقہ کے مخصوص علماء اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، ملا صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی اس کتب خانہ کو دیکھ نہیں سکتا[۱]

سلیمانی کتب خانہ | ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء کے آخر میں احمد آباد میں ایک اور کتب خانہ سلیمانی بوہروں کی طرف سے قائم کیا گیا، جس میں مذہبی کتابیں زیادہ تھیں، یہ کتب خانہ آج تک سلیمانی بوہروں کے داعی کے پاس موجود ہے،

ولی اللہ کا کتب خانہ | ۱۱۵۵ھ میں مولانا عماد الدین کے زیر اہتمام جو مدرسہ قائم کیا گیا تھا، اسی کے متعلق ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں تقریباً ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، اور فن کے لحاظ سے بعض بڑی نادر تھیں، مرہٹہ گردی میں مدرسہ اور کتب خانہ دونوں کا حال ابتر ہوگیا، مولانا عماد الدین کے خاندان میں رفتہ رفتہ علم کا چرچا کم ہوگیا، جس کے نتیجہ میں کتبخانہ کی حفاظت کا خیال بھی جاتا رہا، کچھ کتابیں ایک اہل علم کو دیدی گئیں، اور کچھ کیڑوں کی نذر ہوگئیں، اس کی بقیہ کتابیں جو ہمارے پیش نظر ہیں،

---

[۱] موسم بہار جلد سوم بیان سیدنا داؤد بن عجب شاہ،

ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا کتبخانہ رہا ہوگا، اور اس میں کیسے کیسے گوہرِ نایاب رہے ہوں گے، اس خزانۂ علم کے بے دردی کے ساتھ لُٹ جانے کے بعد بھی کچھ نایاب اور بیش قیمت کتابیں موجود ہیں جن میں سے ایک پانچویں صدی کی حدیث کی کتاب ہے، ایک اور نادر کتاب ابوریحان بیرونی کی ہے، جس کا کوئی دوسرا نسخہ یورپ اور ایشیا میں آج تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے، اس کتب خانہ کا بقیہ ذخیرہ کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں موجود ہے،

کھنبایت کا کتب خانہ کھنبایت ایک مسلمان نواب کی چھوٹی سی ریاست ہے، مومن خان اول کے وقت سے یہاں عربی، ایرانی اور ہندوستانی علماء کا مجمع رہا ہے، ایک زمانہ میں اس کی آبادی بارہ لاکھ تھی، یہاں متعدد کتب خانے تھے، ریاست پر زوال آیا تو اس کا سارا علمی شیرازہ بکھر گیا، کتب خانے بھی برباد ہو گئے، کھنبایت کے بعض خاندانوں میں ان کتبخانوں کا بچا کھچا سرمایہ موجود ہے، میں نے سید غلام عباس محمد علی صاحب کے یہاں ۱۹۲۱ء میں کچھ کتابیں دیکھی تھیں، ان میں ایک قرآن پاک بخط نستعلیق تھا، جس کو حضرت علیؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا سمجھ کر بڑی قدر کرتے تھے، ایک کتب خانہ محکمۂ قضاۃ کا بھی تھا، جو ضائع ہو گیا، اس کی چند معمولی کتابیں موجودہ قاضی صاحب کے پاس رہ گئی ہیں، ایک کتب خانہ عبداللطیف دیوان صاحب کا تھا، جس کو ان کے ورثاء سنبھال نہ سکے اور وہ ضائع ہو گیا، بقیہ کتابیں ایک بنیے نے قرض میں لے لیں، مجھکو

اس نے دکھائیں، اُن میں کوئی کام کی کتاب نہیں تھی، سب معمولی فارسی کی کتابیں تھیں،

احمد آباد کے محکمۂ قضا کا کتب خانہ

اسلامی عہد میں احمد آباد کے قاضی شہر کا پایہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا، پورے گجرات کے محکمۂ قضاء کا نگراں بھی وہی ہوتا تھا، اس کے پاس کتب خانہ کا ہونا بھی ضروری تھا، آج بھی احمد آباد کے قاضی شہر کے پاس ایک کتب خانہ ہے، جو اسلامی حکومت کے زمانہ سے عہدۂ قضا کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے، اخلاف کی ناقدردانی سے اس کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا، راقم الحروف نے بار بار اس کے دیکھنے کی خواہش کی، لیکن نامعلوم مصالح کے پیش نظر قاضی نے دیکھنے کی اجازت نہیں دی اور بلطائف الحیل ٹال دیا،

شیخ حضرمی کا کتب خانہ

احمد آباد میں شیخ عبداللہ در حضرمی متوفی ۱۰۳۸ھ ۱۶۲۸ء ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں[۵]، اُن کی تصنیفات میں النور السافر فی اعیان القرن العاشر بڑی مشہور کتاب ہے۔ سول ہاسپٹل احمد آباد کے پورب میں ایک گلی گئی ہے، اسی کے اختتام پر ایک مقام جوہری باڑہ ہے، وہیں موصوف کا مزار ہے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، چونکہ یہ بڑے مورخ، محدث اور صوفی تھے، اس لئے اس کتب خانہ میں تصوف، حدیث اور تاریخ کی کتابیں زیادہ رہی ہوں گی،

چانپانیر کا کتب خانہ

چانپانیر ایک زمانہ تک گجرات کا پایۂ تخت رہا،

---

[۵] خلاصۃ الاثر ج ۲ ص ۲۰۰۴، مصر،

سلطان محمود اول اور سلطان مظفر ثانی کے زمانہ تک یہ بڑا آباد شہر تھا، انہی کے عہد میں مولانا نصر اللہ یہاں قاضی شہر تھے، بڑے عالم اور متقی تھے، مشتبہ مال سے ہمیشہ احتراز کرتے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس کا تعلق محکمۂ قضا، سے تھا۔

بھروچ کے محکمۂ قضا، کا کتب خانہ

بھروچ گجرات کا بڑا قدیم شہر ہے، یونان کی فوجیں جب ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں، تو اس وقت بھی یہ شہر موجود تھا، یہاں ہمیشہ قضا، کا محکمہ رہا، آخری عہد میں یہ مولانا سید احمد شیرازی کے خاندان میں آگیا، ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس کا بچا کھچا حصہ اُن کے اخلاف میں اب تک موجود ہے، ۱۹۳۲ء میں جب راقم نے اس کو دیکھا تھا، تو اس وقت بھی بعض نایاب کتابیں موجود تھیں، مکرمی قاضی نور الدین کا بیان ہے کہ میرے ہوش سنبھالنے تک اس کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا تھا، مثنوی مولانا سے روم مکتوبہ ۹۰۹ھ جلد پنجم بطرز جدید، سرخسی کی محیط جلد ثانی مکتوبہ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء حدیث کی کتاب المخازن المعروف جلد ثانی بطرز جدید، کتاب الخلاصہ فی الفتاوی مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید، مجمع البحرین، ترجمہ ابن کمت پر مجنس از اتھر وید، وغیرہ چند کتابیں اس کتب خانہ کی قابلِ ذکر ہیں، افسوس ہے کہ یہ بقیہ کتابیں بھی آہستہ آہستہ گجرات سے باہر جارہی ہیں۔

مبادق الازھار فی شرح مشارق الانوار، اس کے مصنف عبد اللطیف ابن عبد العزیز المشہور بہ ابن الملک ہیں، احمد آباد کے باشندے تھے، حدیث

کے ماہر اور دینیات کے عالم تھے، مشارق کی یہ شرح عربی میں ہے احادیث میں حدیثوں کی تعداد ہندسوں میں لکھی ہے، احمد آباد کے قاضی محمد صالح ابن شیخ نورالدین نے اس پر فارسی میں حاشیہ لکھا ہے، اس کا ایک نسخہ میرے دوست قاضی نورالدین صاحب بھروچ کے کتب خانہ میں ہے، مصنف کا سنہ وفات ۹۱۵ھ ہے۔

مرأۃ احمدی کے مصنف نے خاتمہ میں ایک محمودی امیر ملک عبداللطیف محمودی داور الملک مشہور بہ شاہ داول کا جن کے والد کا نام محمود (ملک محمود) تھا، ذکر کیا ہے، وہ کوئی علمی آدمی نہیں تھے، بلکہ صوفی منش ایک امیر تھے، جو ایک سپاہی سے ترقی کرتے کرتے محمود بیگڑہ کے امراء میں شامل ہوگئے تھے، ۹۱۰ھ میں ایک دشمن کے ہاتھ سے شہید ہوگئے، قصبہ آمرون میں اُن کا مزار ہے، لوگ شہید اور ولی سمجھ کر مزار کی زیارت اور منت کے لئے آتے ہیں، شاہ عالم کے مرید اور خلیفہ تھے، میرے دوست قاضی نورالدین صاحب نے معارف ج ۴۳ ن ۵ ص ۵۹ میں اس کتاب کے زیر عنوان مصنف کا نام عبداللطیف بن عبدالملک المعروف بہ داورالملک متوفی ۹۱۵ھ امیر کبیر سلطان محمود بیگڑہ لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، اس نام کے تین بزرگ ہیں، ایک تو وہی ملک عبداللطیف داورالملک بن ملک محمود، دوسرے عبداللطیف بن عبدالملک جو عالم فاضل تھے اور تیسرے عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک جو فنِ حدیث کے بڑے ماہر تھے، مشارق الانوار کے شارح یہی بزرگ ہیں،

نور القاری فی شرح بخاری، یہ علامہ نور الدین بن حاجی محمد صدیق احمد آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ کی شرح بخاری شریف ہے، جو نایاب ہے:

تفسیر شاھیہ: یہ سید محمد محبوب عالم بن سید جلال جعفر بدر عالم شاہی رضوی متوفی ۱۱۱۱ھ کی تصنیف ہے، فارسی زبان میں ہے، تمام تر اہل بیت کی روایت سے تفسیر کی ہے، یاد ایام مؤلفہ مولانا حکیم عبدالحی کے ص ۱۶ پر اسی تفسیر کا ذکر ہے، تین جلدوں میں ہے، حاشیہ میں جا بجا تصحیح ہے، اس کتبخانہ میں اس کی صرف دو جلدیں ہیں،

نصاب الاحتساب عربی عمر بن محمد بن عوض کی تصنیف ہے ۱۰۸۲ھ میں عبدالملک ولد کریم محمد بن راجی محمد بن حسن محمد بھروچی نے اس کی کتابت کی ہے، اس کا دوسرا نسخہ مع فارسی ترجمہ کے بھی ہے، اس کا نام نوریہ، شیخ فتح اللہ اس کے مترجم ہیں، اکبرآباد (آگرہ) میں ۱۱۱۱ھ میں ترجمہ مکمل ہوا، اس سے دو سو برس پہلے بھی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا، جس کا نام دستور الاحتساب ہے، وہ بھی اس کتب خانہ میں ہے، ترجمہ سوال و جواب کے پیرایہ میں ہے، مترجم کا نام خواجہ بن احمد بن محمود ہے دیباچہ میں ہے کہ یہ ترجمہ سلطان مظفر شاہ ثانی حلیم بن سلطان محمود اعظم بیگڑہ کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا تھا، سلطان مظفر حلیم ۹۱۷ھ سے ۹۳۲ھ تک تخت نشین رہا، وہ حافظ قرآن، فقیہ اور محدث تھا، اور علم کا قدردان اس لئے ترجمہ اس کے دوران حکومت ہی میں ہوا ہوگا، مترجم نے بادشاہ کے لئے چند دعائیہ اشعار بھی لکھے ہیں، جو ذیل میں درج ہیں،

خدایا تا جہاں را بادشاہی — مظفر شاہ را دہ تاج شاہی

ز عدلش مملکت آباد گرداں — دلش از ہر چہ خواہد شاد گرداں

گلے آراستہ از بوستانش — نگہداری ز تاراج خزانش

ہر آنکہ بخت بد با وے ستیزد — چناں افتد کہ ہرگز بر نخیزد

ہمیشہ دولتش معمور بادا — معاندرا ہما مقہور بادا

یہ کتاب آخر سے ناقص ہے، اس پر قاضی القضاۃ قاضی نظام الدین کی مہر ثبت ہے، جس پر ۱۱۵۲ھ لکھا ہے،

الاشباہ والنظائر: بڑی مشہور کتاب ہے، مصر میں طبع ہو گئی ہے، مصنف زین الدین بن نجم الدین مصری ہیں، مصنف کے اصل نسخہ سے میاں شیخ عبد الوہاب مفتی ولد شیخ احمد بن شیخ الاسلام مولانا شیخ محمد طاہر صدیقی پٹنی نے ۲۷ رجب ۱۰۱۶ھ میں نقل کیا تھا، یہی نسخہ اس کتب خانہ میں ہے،

ایک کتاب ۱۹۷ھ کی **رحمۃ الامۃ** فی اختلاف الائمہ بھی ہے جو علامہ صدر الدین محمد بن عبد الرحمن حسینی قرشی عثمانی شافعی کی تصنیف ہے، ایک کتاب ۱۰۰۹ھ سے قبل کی شیخ ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی شرح: سید شریف شیخ بن عبد اللہ العیدروس کی ہے اس کے کاتب جعفر بن جلال مقصو عالم ہیں، جو حضرت شاہ عالم کے خاندان کے مشہور عالم ہیں،

عین الوفا فی ترجمۃ الشفاء، شفا قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ کی سیرت نبوی میں مشہور اور مستند کتاب ہے، عین الوفار کے نام سے ابو بکر بن احمد بھروچی نے خود مصنف کے اشارہ سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ قاضی عیاض اور ابوبکر بھروچی دونوں ہم عصر ہیں (۵۴۴ھ) بھروچ میں فتح گجرات کے قبل آباد کار مسلمان تاجروں کے علاوہ علماء بھی تھے، انہی میں سے ایک یہ تھے، قاضی محمد صالح احمد آبادی کی مہر ۱۲۲۹ھ آخر میں ہے، محمود اعظم کے عہد میں ابن اخرش نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا،

لطائفِ شاہیہ: سید محمد بن سید جلال الدین شاہی رضوی متوفی ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے، ۶۳ بابوں میں تقسیم ہے، ہر باب کو لطیفہ سے تعبیر کیا ہے، اس میں حضرت شاہ عالم کے حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں،

سفینۃ السادات: مؤلفہ سید محمد قاسم بن سید عبدالرحمٰن بڈھہ حسنی بخاری، اس میں بخاری سادات کے حالات درج ہیں، ۱۰۷۳ھ کی تصنیف، اور ۱۲۰۳ھ کی مخطوطہ ہے،

صحائف السادات: تین جلدوں میں ہے، بخاری، بھکری، شیرازی سادات کے حالات ہیں، ہاشم بن کمال الدین محمد کہار کی تصنیف اور ۱۲۰۳ھ کی منقول ہے،

رسالہ شاذلیہ: اس کے صرف دو ورق ہیں، اس کے حاشیہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے دستِ خاص سے ایک اجازت نامہ ہے، اس طرح ان کے قلم کے اصلی حروف آج تک محفوظ ہیں جن کی بڑی اہمیت ہے،

شرح منیۃ العارفین : اس کے شارح سید احمد بن سید رفیع الدین ابن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر شیرازی ہیں، یہ شرح ۹۹۲ھ کی ہے، لیکن کتابت ۱۰۲۰ھ کی ہے، تصوف میں ہے۔

انھی کی ایک دوسری کتاب **فتوحات احمدی ورفیعی** ہے، اس میں سید احمد جعفر شیرازی اور سید رفیع الدین کے مناقب ہیں، اور مصنف ہی کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی ہے۔

نور العرفان : مؤلفہ شیخ محمد عرفان متوفی ۱۱۴۷ھ کی تصنیف ہے، جس میں مدرسہ ہدایت بخش کے اوصاف درج ہیں،

نور المعرفت : مصنفہ شاہ محمد ولی، یہ بھی مدرسہ ہدایت بخش کے اوصاف میں ہے۔

حکیم سید روح اللہ بھروچی کا کتب خانہ

حکیم سید روح اللہ بھروچ کے باشندے تھے، اُن کے والد کا نام سید صبغۃ اللہ شطاری ہے، حاذق حکیم اور نامور عالم تھے، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں تینوں شاہنشاہوں کا زمانہ دیکھا، اکبر کے حکم سے ۹۹۷ھ میں فوائد الانسان کے نام سے ایک طبی کتاب تصنیف کی، اس میں ادویہ کے نام، اُن کے خواص، مفردات و مرکبات وغیرہ فارسی میں منظوم ہیں، جہانگیر اور نورجہاں کے معالج تھے، شاہجہاں نے بھی بڑی قدردانی کی، ان کا ایک کتب خانہ تھا، جو برباد گیا، البتہ اُن کے وارثوں کے پاس اس کی تھوڑی سی کتابیں ہیں، اُن ہی سے ایک وہی فوائد الانسان ہے، دوسری تقویم الابدان مؤلفہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ متوفی

سنہ ھ، تیسری لذۃ الحیات مؤلفہ روح اللہ ثانی سنہ ۱۱۱۱ھ، چوتھی فرحت الناس مؤلفہ محمود بن برہان بن محمود بن جلال حسینی سنہ ھ۔

مولانا اسحاق کا کتب خانہ | مولانا محمد اسحاق بن عبدالوہاب متوفی سنہ ۱۲۰۲ھ ایک کامل بزرگ تھے، مولانا عبدالغنی کے مشہور تلامذہ میں تھے، خود مولانا عبدالغنی احمد آباد کے قابلِ احترام بزرگ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی کے شاگرد تھے، مولانا اسحاق نے سنہ ۱۲۰۰ھ میں شرب الدخان (تمباکو پینے کی حرمت میں) کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا آپ کے مدرسہ کی تباہی کے ساتھ آپ کا کتب خانہ بھی برباد ہوگیا، دست بردِ زمانہ سے کچھ کتابیں اب تک رہ گئی ہیں۔

بھولاناتھ کا کتب خانہ | بھولاناتھ کا خاندان کا اصل وطن وڈنگر ضلع مہسانہ (احمد آباد) ہے، وہاں سے منتقل ہو کر احمد آباد آ بسا، بھولاناتھ ایک وڈنگری ناگر برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کی ولادت سنہ ۱۸۲۲ء میں ہوئی، اچھی تعلیم پائی، ان کے استاد کا نام مولانا جلال الدین (احمد آبادی) ہے، اب تک مغلوں کا اثر باقی تھا، اس لئے فارسی پڑھنا ہنر میں داخل تھا، بھولاناتھ نے بھی فارسی تعلیم حاصل کی؛ وہ فارسی کے اچھے منشی، عربی دان اور انگریزی خواں تھے، سنسکرت سے واقف اور گجراتی زبان کے اچھے شاعر تھے، نظم کے علاوہ نثر میں بھی کئی ادبی کتابیں لکھیں، احمد آباد، بھروچ، امریٹھ، سورت، تھانہ میں منصف کے عہدہ پر سرفراز تھے، ان کے متعدد لڑکے تھے، ان سب کو اچھی تعلیم دلائی، اپنی قوم کی تعلیمی ترقی میں بڑی کوشش کی، اُن کے جوان لڑکے اپاجام کا انتقال ہوا تو اس کی یادگار میں

قوم کی علمی ترقی کے پیشِ نظر اسی کے نام پر آپا رام لائبریری قائم کی، جو آج تک موجود ہے، آپا رام کو تو کوئی نہیں جانتا، لیکن بھولا ناتھ کی لائبریری سے سارا زمانہ واقف ہے، ۱۸۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا، کتب خانہ نسلاً بعد نسلٍ اُن کی اولاد کے اہتمام ہی میں قائم چلا آرہا تھا، اب ایک کمیٹی کے ماتحت ہے، احمد آباد کے محلہ رائے پور میں اس کی نئی عمارت بن گئی ہے، اس میں گجراتی، انگریزی، سنسکرت، ہندی، اردو، اور فارسی تمام زبانوں اور فنون کی کتابیں موجود ہیں، ایک لائبریرین بھی ہے، ہر زبان کی کتابیں الگ الگ الماریوں میں تقسیم ہیں، راقم الحروف نے ۱۹۲۱ء میں اس کتاب خانہ کو دیکھا تھا، اردو فارسی کی کتابیں، ہال کے ایک کونہ میں زمین پر پڑی تھیں، گھنٹوں ان کتابوں کو دیکھتا رہا، اس وقت تک یہ تمام کتابیں صحیح و سالم تھیں، اکثر کی جلدیں بھی تھیں، پھر اسکے بعد ۱۹۳۱ء میں وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ یہ تمام کتابیں ایک چھوٹے سے کمرے میں چند الماریوں میں بند ہیں، معلوم ہوتا تھا کہ عرصہ سے کمرہ کھولا نہیں گیا تھا، نہ الماریوں کے کھلنے اور کتابوں کو ہوا لگنے کی کبھی نوبت آئی، کتابیں اکثر کرم خوردہ ہوگئی تھیں، وجہ یہ ہے کہ ناظم کتب خانہ فارسی اردو سے ناواقف تھا، اس لئے اُس نے اُن کی طرف توجہ ہی نہیں کی، اور اس طرح ایک شاندار کتب خانہ تباہی کے نذر ہوگیا، ۱۹۳۹ء سے قبل ایک مرتبہ تحریک کی گئی کہ بجنسہا بغرض حفاظت فارسی اردو کی کتابیں گجرات ورناکیولر سوسائٹی احمد آباد کو

سپرد کر دی جائیں لیکن نہ ایسا ہوا، نہ کتابوں کی حفاظت کا کوئی اور معقول نظام ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابیں کیڑوں کی نظر ہوتی چلی گئیں۔ ۱۹۲۲ء میں پھر اس کی تحریک ہوئی، کہ بطور امانت کتابیں سوسائٹی کے حوالہ کر دی جائیں، چنانچہ راقم اور جناب کیشو رام کاشی رام شاستری کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء کے مقابلہ میں صرف ½ کتابیں اچھی حالت میں ہیں، اسی ما بقی ذخیرہ کتب میں سے چند قابلِ ذکر کتابوں کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ دیوان برہمن : داراشکوہ بن شاہجہاں کا مشہور میر منشی چندر بھان برہمن کا یہ دیوان ہے، جو آخر سے ناکمل ہے، ردیف لا کے کل چار شعر ہیں، بہت چھوٹی جیبی تقطیع ہے، حروف باریک مگر واضح ہیں، اس کے نسخے دوسرے کتب خانوں میں بھی ہیں، اسی کے ساتھ فیضی کی مشہور مثنوی "نل دمن" بھی ہے، جس کے ابتدائی اوراق نہیں ہیں، ۱۰۹۶ء کی لکھی ہوئی ہے،

۲۔ معنی صد النکار، فنِ معانی اور بلاغت میں ہے یعنی زبان میں کن کن باتوں سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے، ابتدائی صفحات ناقص، اور آخر سے کامل ہے، اس کا ایک نسخہ گجرات ورناکیولر سوسائٹی کے کتب خانہ میں بھی ہے لیکن یہ بھی ناقص ہے،

۳۔ الف، ابواب معرفت مصنفہ چھتر لی، فنِ تصوف میں فارسی میں ہے صفحات ۱۲۲ ہیں۔ کاتب کا نام رام سرن ہے، اس کتاب کا دوسرا نام ابواب اسرار بھی اس کے آخر میں لکھا ہے،

ب : اسی کے ساتھ ایک دوسری کتاب "گیان مالا" ہے، یہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے، اس میں کرم پھل اور تناسخ کا بیان ہے، مصنف یا کاتب کا نام نہیں لکھا ہے، مگر دونوں کتابوں کا خط یکساں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ اس کا کاتب بھی رام سرن ہی ہے، میرا خیال ہے کہ یہ بھی چھتر مل ہی کی تصنیف ہے،

۴۔ عملِ صالح : یہ مخطوطہ بڑی تقطیع پر ہے، خوشخط اور جدول رنگین، شاہجہاں بن جہانگیر کی سوانح عمری ہے، ابتدائی ۱۰ ورق ظہیر الدین بابر کے حالات تک اور پھر ص ۲۴ سے ص ۳۴ تک مفقود ہیں، آخر سے مکمل ہے، مصنف محمد صالح کنبوہ ہے، اس کتاب کو اگرچہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے طبع کرا دیا ہے، پھر بھی کمیاب ہے،

۵۔ اکبر نامہ ہر دو جلد کامل، جدول رنگین، پہلا صفحہ منقش، مطلا بخط نستعلیق اور خوشخط، ششم یعنی فتحِ گجرات تک کے حالات ہیں، اس میں شاہزادہ مراد کا زائچہ ولادت بھی تحریر ہے، مصنف علامہ شیخ ابوالفضل ناگوری، منقولہ ۱۱۸۳ھ، جلوس ۱۰ شاہ عالم بادشاہ

۶۔ تاریخ فرشتہ : ہر دو جلد کامل، مطبوعہ بمبئی، تقطیع بڑی، زبان فارسی خط نستعلیق، یہ بڑی تقطیع پر ہندوستان میں پہلی بار طبع ہوئی ہے، کتابت کی کی غلطیاں بجدرہ گئی ہیں،

۷۔ عہدنامۂ عتیق : کلن قسیس نے اصل عبرانی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے، اور ۱۲۶۲ھ میں عربی ٹائپ میں لندن سے شائع ہوا ہے،

۸۔ رقعاتِ برہمن : اور ہفت گلشن قلمی مؤلفہ چندر بھان برہمن، خطِ نستعلیق، آخر سے ناقص بعض امراء کے نام خطوط ہیں،

۹۔ ہندوستانی زبان۔ اردو اور ہندی کی تعلیم، انگریزی زبان کے ذریعہ دی گئی ہے، مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن،

۱۰۔ خلاصہ شاہنامۂ فردوسی۔ توکل بن تولک بیگ حسینی نے شاہجہاں کے عہد ۱۰۶۳ھ میں شمشیر خاں والی غزنہ کے حکم سے فارسی میں شاہنامۂ فردوسی کا خلاصہ تحریر کیا ہے، آخر سے کرم خوردہ ہے۔

۱۱۔ شرح ظہوری قلمی : مصنفہ محمد سیف اللہ احمد آبادی، خوشخط خطِ نستعلیق، تقطیع متوسط، کرم خوردہ ۱۱۵۳ھ،

۱۲۔ مجموعۂ اشعار فارسی، خطِ نستعلیق، خوشخط، جدول نقرئی، تقطیع کلاں ناقص الاول، صفحتین کا ٹی، اس میں جامع نے الگ الگ عنوان مقرر کر کے اپنے مذاق کے مطابق متقدمین و متاخرین شعراء کے اشعار یکجا کر دیئے ہیں، مثلاً کاکل، ابرو، چشم، قد، طفلی، جوانی، عشق وغیرہ قسم کے ۹۳ عنوان، اور اس کے تحت اس سے متعلق اشعار ہیں، ہر عنوان کا پہلا صفحہ مطلا شنگرفی، اور منقش ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طلا تیزابی تھا، اس لئے ورق گل گل گیا ہے،

۱۳۔ بہادر خانی، تقطیع کلاں، زبان فارسی، مطبوعہ ۱۲۵۰ھ، فلکیات اور نجوم کی مشہور کتاب ہے، مبارز الملک خاں بہادر نصرت جنگ کے حکم سے طبع ہوئی ہے،

۱۴۔ خرد افروز، ترجمہ عیار دانش، مترجمہ حفیظ الدین احمد صاحب مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۵ء جلد اول ودوم کامل، (بعض مقامات کرم خوردہ) خط ٹائپ سرخی، کلیلہ ودمنہ کا مشہور فارسی ترجمہ انوار سہیلی ہے، اسی کو سامنے رکھ کر، ابو الفضل نے عیار دانش کے نام سے فارسی زبان میں دوسرا ترجمہ کیا ہے. لیکن اس کی زبان بھی بیحد مشکل ہے، اس لئے خرد افروز کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے،

۱۵۔ رسالہ صاحبیہ مصنفہ جہاں آرا، بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ دہلی ۱۰۵۱ھ بیگم موصوفہ نے اپنے مرشد کے حالات میں یہ رسالہ لکھا ہے، اسی کے ساتھ اور متعدد رسالے ہیں، جو سب ناقص الطرفین ہیں، مجلد ہے،

۱۶۔ دول رانی خضر خاں. تقطیع متوسط، خوشخط نستعلیق، صفحۂ اول منقش، و مطلا، از اول تا آخر، جدول مطلا، مصنفہ حضرت امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ، مشہور مثنوی ہے، اور علی گڑھ میں نہایت اہتمام سے چھپ گئی ہے،

۱۷۔ دستور العمل (رقعات عالمگیری) کاتب سید نور الدین ۱۱۹۲ھ،

۱۸۔ تحفۃ الکرام، ناقص الآخر، ورق تقریبًا ۲۱۔ خط نستعلیق معمولی، تقطیع کلاں، یہ کتاب بمبئی میں طبع ہو گئی ہے. جس کے ساتھ مراۃ احمدی جلد اول کا خاتمہ بھی لگا دیا گیا ہے: لیکن یہ مخطوطہ ناقص ہے،

۱۹۔ مرآۃ سکندری، تقطیع متوسط، طبع اول ۱۳۰۸ھ، یہ نسخہ بہت کمیاب ہے،

۲۰۔ جارج نامہ منظوم، زبان فارسی، تاریخ ہند از ملا فیروز بن ملا کاؤس فارسی، مطبوعہ مطبع زبدۃ الاکابر بمبئی، انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کی ابتدار سے ان کے قبضۂ ہندوستان تک کے حالات ہیں، جلد اول ناصر جنگ نظام کے ارکاٹ جانے کے واقعہ پر ختم ہوتی ہے، دوسری جلد کی ابتدار ناظم بنگالہ مہابت جنگ کی وفات سے، اور خاتمہ راجہ بھرت پور کی صلح پر ہے، تیسری جلد کا آغاز چندا صاحب کی جنگ سے ہوتا ہے، اور خاتمہ ۱۸۳۰ھ میں ترک راؤ مرہٹہ کی گرفتاری پر ہوتا ہے، سرجان مالکم گورنر بمبئی کے عہد میں تحریر کی گئی، مگر مقبول نہیں ہوئی،

۲۱۔ تاریخ عالم بادشاہ دہ سالہ، مصنفہ محمد کاظم بن محمد امین ناقص الطرفین،

۲۲۔ قصۂ راجہ کنول پال، یہ شیخ دین نے بمقام پٹن ۱۲۱۶ھ میں گوجری اردو میں تالیف کیا، اور دادا بھائی نے نقل کیا،

۲۳۔ تزک تیموری مع ترجمۂ انگلش، اصل فارسی خط، سرمہ ٹائپ،

۲۴۔ مثنوی مولانائے روم، چھ دفتر، ابتدار کا ایک ورق مفقود، دوسرا صفحہ مطلا، تقطیع متوسط، خط نستعلیق معمولی، اور ہر دفتر کے اول ۲ صفحے مطلا و منقش ہیں،

۲۵- مظفر شاہی مصنفہ ملا قانعی، تقطیع متوسط، خط نستعلیق، معمولی، کرم خوردہ، اسی سے نقل کرکے گجرات ودیا سبھا احمد آباد نے طبع کرایا ہے، دوسرا اڈیشن لاہور سے جناب چغتائی صاحب نے شائع کیا ہے،

۲۶- خلاصتہ التواریخ مصنفہ سجان رائے بٹالوی کامل، خط نستعلیق فارسی، تاریخ ہند از ابتدا تا عالمگیر ۱۱۰۷ھ کاتب سمبھو سم جولال ناگر بنارسی نے سیٹھ چونی لال کے لیے ۱۲۴۳ھ ۱۲۵۱ھ میں نقل کیا،

۲۷- مسیر طالبی، یہ سفرنامہ مرزا ابوطالب خاں بن محمد اصفہانی کے سفر یورپ کے حالات پر مشتمل ہے، جو لارڈ منٹو کے عہد میں یورپ گئے تھے، اصل کتاب ۱۸۱۲ء میں بمقام بمبئی طبع ہوئی تھی، یہ اوسی کی نقل ہے، جو ۱۸۳۰ء میں ہوئی تھی، کاتب محمد کاظم بن محمد فجوی؛

۲۸- دیوان ولی، مصنفہ شاہ ولی اللہ احمد آبادی، تقطیع خرد، خط نستعلیق، معمولی، اردو، کرم خوردہ، حاشیہ پر اشرف و شرف شاگردان ولی کے اشعار ہیں،

۲۹- مرأۃ سکندری، تقطیع متوسط، خط صاف نستعلیق۔ سلاطین گجرات کی تاریخ ہے، اوّل کا ایک ورق غائب ہے، منقولہ ۱۰۹۲ھ۔

۳۰- خمسہ نظامی گنجوی، تقطیع متوسط، خط نستعلیق، صاف، باریک، جس میں حسب ذیل مثنویاں ہیں، (۱) مخزن الاسرار ۱۰۳۰ھ، (۲) لیلیٰ مجنوں ۱۰۳۲ھ، (۳) خسرو شیریں ۱۰۳۲ھ (۴) ہفت پیکر (۵) سکندرنامہ

ہجری ۱۰۳۲ھ کاتب عبدالقادر بن عبدالحلیم قادری. ان میں سے ہر ایک کا صفحۂ اول مطلا اور شنگرفی ہے،

(۳۱) محکمۂ دیوانی کی کتاب۔ اس میں سلاطینِ گجرات سے لے کر مغلیہ سلطنت کے آخر عہد تک کا حال مختصر طور سے لکھا ہے، اس کے بعد محکمۂ دیوانی کے ایک ایک شعبہ کا حال، آمدنی، خرچ، اسامی، اراضی، وغیرہ کا حال درج ہے، تقطیع کلاں، ضخیم، ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء کا لکھا ہوا ہے،

شیخ مہائمی کا کتب خانہ

شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی بمبئی، جزیرۂ مہائم کے باشندے تھے، ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء میں وفات ہوئی[1]، اور وہیں مدفون ہوئے، ان کا مقبرہ زیارت گاہ عام ہے، اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے، اور بہت سی مفید کتابوں کے مصنف، ایک بڑا کتب خانہ بھی رکھتے تھے، جو عرصہ تک قائم رہا، لیکن متولیوں کی بے توجہی سے ضائع ہو گیا، ۱۹۳۲ء میں جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ اس کی جگہ درگاہ شریف میں ایک نیا کتب خانہ قائم ہے، جس میں عربی فارسی اور اردو کی کتابیں تھیں، ناظم کتب خانہ سے معلوم ہوا کہ قدیم کتب خانہ کی بقیہ کتابیں بھی اس میں شامل کر دی گئی ہیں، یاد آتا ہے کہ انھوں نے شیخ مہائمی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب مجھے دکھائی تھی، لیکن شاید عجلت کی وجہ سے اسے نوٹ نہ کر سکا،

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۰، آگرہ،

سورت کے نواب صاحب کا کتب خانہ

سورت کے نواب صاحب کے پاس بھی ایک کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ وہاں کا سرکاری کتب خانہ تھا، جو نواب صاحب کو وراثت میں ملا ہے، راقم الحروف کئی بار اس کو دیکھنے کے لئے سورت گیا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی،

خاندان عیدروس کا کتب خانہ

سورت کے شرفاء میں ایک مشہور خاندان عیدروس صاحب کا ہے، سلطان محمود اعظم کے عہد میں یہ خاندان احمد آباد میں آیا، سب سے پہلے شیخ عیدروس آئے، اس کے بعد اُن کا خاندان آیا، اور اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، اُن کے پوتے ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں سورت آئے، جو غالباً بڑے فیاض اور دریا دل تھے، "جاء الجواد الفیاض" اُن کی آمد کی تاریخ ہے[1]، یہ خاندان ہمیشہ سے اہل علم رہا۔ اور تصنیف و تالیف کرنا اُس کا مستقل پیشہ تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جو ارثاً بعد ارثٍ اس خاندان میں چلا آرہا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، اس وقت بھی حدیث، تصوف ادب اور تاریخ کی کتابوں کا بہت

---

[1] کتاب مزارات سورت و بھروچ قلمی، کتب خانہ عیدروس سورت لیکن اس کتاب میں ہے کہ محمود بن لطیف کے عہد ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں عیدروس کا خاندان حضر موت سے احمد آباد آیا، یہ صحیح نہیں ہے، صحیح وہی ہے جو متن میں میں نے تحریر کیا ہے،

بڑا ذخیرہ تھا، جن میں سے بعض یہ ہیں :-

۱- تذکرۃ الشیخین، قلمی، عبداللہ عیدروس و محمد عیدروس ۱۰۶۶ھ کے حالات میں ہے، (۲) کتاب مشارق الانوار القدسیہ فی مناقب السادات العیدروسیہ، شیخ عیدروس کے خاندانی حالات میں ہے مصنفہ شیخ محمد صالح ۱۱۲۰ھ (۳) محمد عبدالحکیم بن شیخ عبدالوہاب ابن شیخ عبدالرزاق عباسی کی لکھی ہوئی تاریخ سورت بھی ہے، ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء انہی نے مراۃ احمدی کا خلاصہ بھی اردو میں کیا ہے،

اس کتب خانہ میں ایک کتاب علم اصطرلاب پر تھی، جو فتح گجرات کے عہد مغلوں کے ہاتھ لگی، اس پر گجرات کے شاہی کتب خانوں کی مہر موجود ہے، جب یہ جہانگیر کے قبضہ میں آئی تو اس کی مہر لگائی گئی، پھر خانخاناں عبدالرحیم کے کتب خانہ کی مہر ثبت ہوئی، اکبر کے ناظم کتب خانہ علی مراد کے ہاتھ سے لکھا ہوا یہ فقرہ اس میں موجود ہے "داخل کتاب خانہ شد" اس میں نقوش اور چارٹ مکمل بنے ہوئے ہیں، جس سے زائچ وغیرہ بنانے میں امداد ملتی ہے، اور ستاروں کی پیمائش کی جاتی ہے، اس وقت یہ کتاب اسٹیٹ جاؤ کے کتب خانہ حیدرآباد میں موجود ہے، اس خاندان کے چشم و چراغ آغا حسین پاکستان میں موجود ہیں،

(ہمایوں ۱۹۴۵ء لاہور)

سید قمرالدین کا کتب خانہ

سورت ہی میں ایک اور کتب خانہ سید قمرالدین مرحوم کا، جو ضائع ہوتے ہوتے اب کتابوں کی تین الماریاں

رہ گئی ہیں، راقم الحروف ۱۹۳۲ء میں جب اس کو دیکھنے گیا تو اتفاق سے گھر میں کوئی مرد نہ تھا، اس لئے پردہ کرا کے میں نے کتب خانہ کی سیر کی، اس میں مجھے کوئی نایاب کتاب نہیں ملی، البتہ ایک کتاب قابلِ ذکر خالقِ باری کے طرز میں اللہ خدائی ہے، جس کے دو ابتدائی شعر یہ ہیں:-

ہے حمد پاک اور احدے یکہ جان ام القری کو تو مکہ
اے پدر باپ والدہ مائی ہست اخوی برادر بھائی

یہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ میں بمقام بمبئی اسماعیل شیرازی کے اہتمام میں طبع ہوئی۔ دوسری کتاب کلام اقدس ہے، اس کے مصنف حضرت پیر محمد شاہ بیجاپوری ہیں، یہ شاعر بھی تھے، تخلص اقدس ہے، اردو کے مشہور شاعر ولی گجراتی کے ہم عصر تھے، ان کا دیوان نایاب ہے، راقم الحروف نے اس کا ایک مکمل نسخہ احمد آباد میں دیکھا تھا، یہ دوسرا نسخہ ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔[۱]

بخشو میاں کا کتب خانہ سورت میں بخشو میاں کا ایک لاجواب کتب خانہ تھا، جو بزرگوں کے زمانہ سے چلا آرہا تھا، اُن کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیخ خواجہ عبد اللطیف بڑے پایہ کے عالم تھے، ۷۳۶ھ / ۱۳۳۵ میں بمقام بغداد

---

[۱] راقم الحروف نے "تذکرۂ اقدس" کے نام سے آپ کی سوانح عمری لکھی ہے، اسی میں اُن کے کچھ اشعار فارسی کے اور کچھ اردو کے بطور نمونہ نقل کئے ہیں،

صدارت کے عہدہ پر ممتاز تھے، بنی عبید کے قبیلہ سے تھے، جو مدینہ کے پاس آباد تھا، یہ بغداد سے گجرات آکر پہلے سرکھیج میں مقیم ہوئے، پھر پٹن نہروالہ چلے گئے، جب احمد آباد بسایا گیا، تو شیخ کی وفات کے بعد خواجہ حسن محمد احمد آباد آئے، اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا، اُن کی اولاد میں سے شیخ احمد اور شیخ عثمان سلطان احمد شاہ ثالث کے عہد میں دیوان ہوئے، پھر اُن کی اولاد میں سے صفی الدین سیف خاں بعہد جہانگیر احمد آباد میں صوبہ دار مقرر ہوئے، پھر شاہجہاں کے عہد میں اُن کے لڑکے محمد امین سورت بندر کے متصدی ہوئے، اور اُن کے پوتے شیخ حامد سورت آکر مقیم ہوگئے، ۱۰۵۳ھ؁ (۱۶۴۳ء) میں اُن کو عمدۃ التجار کا خطاب ملا، چونکہ یہ بہت بڑے عالم تھے، اور دولت کے ساتھ علم کا بھی ذوق تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی اُن کے پاس تھا جس میں بیس ہزار کتابیں تھیں، ایک سو سات برس کی عمر پاکر ۱۱۱۳ھ؁ (۱۷۰۲ء) میں انتقال کر گئے، ان کا لڑکا محمد فاضل اسم بامسمیٰ نکلا، دولت اور علم دونوں میں اپنے باپ کا وارث تھا، عمدۃ التجار کے خطاب کے ساتھ اور بہت سے شاہی عنایات سے مستفیض ہوا، اس کی مالداری کا یہ حال تھا، کہ ساٹھ ہزار فقط زکوٰۃ ادا کرتا تھا، علمی ذوق اس قدر تھا کہ تیس لاکھ روپیہ خرچ کرکے چالیس ہزار کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کیں، کتابوں کی خرید اور اُن کی نقل کے لئے ہر بڑے شہر میں اس کے کارندے مقرر تھے، ۱۱۲۹ھ؁ (۱۷۱۶ء) میں حیدر قلی خاں متصدی بندر سورت نے عداوت

سے بردودہ کے پاس گویوں کے ذریعہ اُس کو قتل کرا دیا، اس کے لڑکے شیخ محمود کا جو صاحبِ دولت تھے ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰) میں بمقام سورت انتقال ہوا، اُن کے صاحبزادے شیخ بہادر علوم و فنون میں بڑے ماہر تھے، ۲۰ سال کی عمر پاکر ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰) میں رحلت کر گئے، اُن کے لڑکے شیخ حامد بھی صاحبِ علم تھے، انھوں نے ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹) میں پائی، انہی کے صاحبزادے رضی الدین احمد عرف بخشو میاں ہیں، انھوں نے اپنے آبائی کتب خانہ سے بڑا فائدہ اٹھایا، ۴۴۴ منتخب کتابوں سے ایک کتاب "حدیقۂ احمدی" تاریخ میں تالیف کی، اس کی تیسری جلد کا نام حدیقۃ الہند ہے، راقم الحروف کی نظر سے یہ تینوں جلدیں گذری ہیں، اور ابتک غیر مطبوعہ ہیں، ۱۲۶۵ھ میں بخشو میاں رحلت کر گئے، اُن کے خلف الرشید شیخ بہادر عرف شیخ میاں اپنے باپ کے خلف الصدق ثابت ہوئے، حقیقۃ السورت انہی کی تالیف ہے، ساٹھ سال کی عمر پاکر وفات پائی، اُن کے تختِ جگر شیخ محمد امین صاحب ہیں جو آج کل احمد آباد کے محکمۂ منشیات کے افسر ہیں، فرماتے تھے کہ میری کم عمری کے باعث کتب خانہ برباد ہو گیا، چند سو کتابیں اب بھی موجود ہیں، راقم الحروف کی نظر سے گذری ہیں، اُن میں کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں ہے،

خانقاہ شاہ عبدالعلیم کا کتب خانہ

بھروچ سے متصل ایک قصبہ انکلیشور ہے، یہاں شاہ عبدالعلیم صاحب کی خانقاہ اور درگاہ ہے جس کے ساتھ مسجد بھی ہے، یہاں قدیم زمانہ میں ایک بڑا کتب خانہ تھا، چونکہ

یا سورت کے راستہ میں پڑتا تھا، اس لئے کارواں کا ایک پڑاؤ یہاں بھی ہوتا تھا، اس طرح رفتہ رفتہ یہ بڑا آباد، وسیع اور پُر رونق ہو گیا تھا، یہاں کے اہلِ علم اس کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، سنا ہو کہ تھوڑی سی کتابیں بطور یادگار رہ گئی ہیں،

کتبخانہ خانخاناں | عبدالرحیم خانخاناں (سپہ سالار اکبرِ اعظم) نے احمد آباد میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا، جس میں ہر فن کی نادر کتابیں جمع تھیں، اس کتب خانہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دربارِ اکبری کے جتنے مشہور شعراء تھے، ان سب کے دواوین، خود اُن کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اس میں موجود تھے، اکثر شعراء اس کتب خانہ کی خدمت پر مامور تھے، اسی جگہ طرحیں دیجاتیں، مشاعرے ہوتے، جن میں خود خانخاناں بھی بنفسِ نفیس شریک ہوتا، اور قدردانی سے شعراء کا دل بڑھاتا،[1] بعد میں غالباً خانخاناں اس کتب خانہ کو اپنے ساتھ آگرہ لے گیا،

غوثیہ کتب خانہ | حضرت غوث محمد گوالیاری کی اولاد احمد آباد میں آکر آباد ہوئی، تو اپنے ساتھ بزرگوں کے بہت سے تبرکات بھی لائی، جن میں کتابیں بھی تھیں، اُن میں ایک بزرگ فضل علی عرف بارک اللہ بڑے صاحبِ ذوق تھے، اُن کے پاس ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا، جب تک اس خاندان میں علمی ذوق رہا، کتب خانہ بھی تھا، اس کے بعد برباد ہو گیا، اب بھی کچھ کتابیں موجود ہیں،

---

[1] شعرالعجم حصہ سوم ص ۱۲۔

شیدی سعید کا کتب خانہ | شیدی سعید پہلے ترکی فوج کے ساتھ گجرات آیا؛
اس کی ولادت حبشہ میں ہوئی تھی۔ سن شعور کو پہونچا، اور کام کرنے
کے لائق ہوا تو سلطان کی ذاتی فوج میں شامل ہو گیا۔ سلطان شہید
ہوگیا تو اُس نے جھوجھار خاں ایک سربرآوردہ امیر کی رفاقت اختیار کرلی'
جھوجھار خاں نے اس کی سعادتمندی اور حسنِ خدمت ورفاقت کے پیشِ نظر
چند گانوں اس کو بخش دیئے، جن کی آمدنی سے اُس نے ایک مسجد بنوائی اور
ایک کتبخانہ قائم کیا،

پہلے شہر میں جس قدر کتابیں مل سکیں، اُس نے جمع کیں، پھر ایک جہاز
ٹھیک کیا، اور اسی کے ناخدا خواجہ سلامت اللہ شاطر مغربی کو کتابوں کی
خرید کی خدمت سپرد کر کے مصر روانہ کیا، کتابوں کی ایک فہرست بھی اُن کو
دیدی گئی کہ خاص طور سے اُن کو ضرور خریدیں، چنانچہ جب وہ جہاز کتابیں
لے کر گھوگہ (کاٹھیاواڑ) پہنچا، تو طوفان آگیا، اور جہاز کے کروٹ
لینے سے کچھ کتابیں ضائع ہوگئیں، اور جو بچ گئیں وہ کتب خانہ کی زینت
بنیں، اکبر کی فتح کے بعد سے پھر اس کتب خانہ کا ذکر کتابوں میں نہیں آتا[۱]،

---

[۱] ظفر الوالہ جلد ثانی لندن،

سلاطینِ گجرات کا توپ خانہ

اقوامِ عالم کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو کسی قوم کی برتری کے جہاں بہت سے اسباب آپ کو معلوم ہوں گے، ایک بڑا سبب اس کی زبردست فوجی قوت بھی ہوگی۔ جس قوم کے پاس اس عہد کے لحاظ سے جتنے اچھے اور عمدہ آلاتِ حرب ہوں گے اتنی ہی وہ کامیاب اور اس کی فوجی قوت کی دھاک تمام عالم پر بیٹھی ہوگی، ایک زمانہ میں سلاطینِ گجرات کی فوجی قوت بھی بڑی زبردست تھی، اور اُن کی فوجوں کی دھاک تمام ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی، خصوصاً دکھن کی سلطنتیں ان سے بہت مرعوب رہتی تھیں، اُن کے پاس بہترین آلاتِ جنگ تھے، دوسرے ان کا فوجی نظام بہت اچھا تھا، قطب الدین ثانی نے ۸۶۲ھ میں محض تھوڑی سی فوج سے محمود خلجی سلطان مالوہ کی تجربہ کار، نبرد آزما اور کار آزمودہ عظیم الشان فوج کو ۸۵۶ھ (۱۴۵۲) میں شکست دے دی تھی۔[1] گجراتیوں کے آلاتِ جنگ میں ایک عیب اور

---

[1] مرآۃ سکندری بمبئی بیان قطب الدین سلطان گجرات،

ہلاکت انگیز چیز توپ بھی تھی،

توپ کی ایجاد کا فخر اسپین کے عربوں کو حاصل ہے، انہی نے سب سے پہلے پانچویں صدی ہجری میں دنیا کے سامنے اپنی اس ایجاد کو پیش کیا، اور انہی کے ذریعہ یورپ اور ایشیا میں اس کا رواج ہوا[1]

ہندوستان میں سب سے پہلے شاہزادہ سیف الدولہ بن محمود ابراہیم غزنوی متوفی ۴۹۲ھ ۱۰۹۹ء نے آگرہ کی جنگ میں اس کو استعمال کیا، وہ اس وقت ہندوستان کا افسر اعلیٰ[2] تھا، پھر ہندوستانی بادشاہوں میں علاؤالدین خلجی پہلا شخص ہے جس نے قلعہ کے محاصرہ میں اس سے کام لیا،

۷۷۱ھ ۱۳۶۹ء میں وجیانگر کے راجہ نے محمد شاہ بہمنی کے مقابلہ میں پہلی دفعہ توپ استعمال کی، اس کو اس نے ان ترکوں سے حاصل کیا تھا جو سمندری راستہ سے اس کے پاس آمدورفت رکھتے تھے، اس کو دیکھکر بہمنیوں کو بھی اس کا شوق پیدا ہوا، اور اپنے یہاں کے آلات جنگ میں اس کا اضافہ کیا، پھر ایک سیستانی ترک کے ذریعہ ہندوستان میں اس کا پہلا کارخانہ قائم ہوا، جہاں اچھی اچھی توپیں ڈھلنے لگیں[3]

جہاں تک اس خاکسار نے گجرات کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں توپ سب سے پہلے سلطان احمد شاہ

---

[1] مضمون توپ اسلامک کلچر حیدرآباد اپریل و جون ۱۹۳۹ء [2] ظفر الوالہ جلد ۲ بیان علاء الدین خلجی الغ خان [3] تاریخ فرشتہ جلد دوم نولکشور حالات محمد شاہ بہمنی،

اوّلین بانی احمدآباد کے زمانہ میں آئی ہے، اس نے باقاعدہ طور پر اس کو استعمال کیا۔ اس کے لئے فوج میں خاص ایک محکمہ قائم کیا، جس کا نام "محکمۂ توپخانۂ فیل" تھا، اس کی توپیں اس قدر وزنی اور بھاری بھرکم ہوتی تھیں کہ ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا کوئی آسان کام نہ تھا، اس لئے زیادہ تر ہاتھی استعمال میں لائے جاتے، اور کبھی کبھی بیل اور گھوڑے بھی استعمال کئے جاتے، مگر ان کی تعداد کافی رکھنی پڑتی، بلکہ سیکڑوں سے بھی متجاوز ہو جاتی، اس لئے بیلوں اور گھوڑوں کے بجائے ہاتھی ہی رکھے جاتے۔

اس محکمہ کا افسر ہر چیز کا انتظام کرتا تھا، مثلاً سدھائے ہوئے ہاتھیوں کا جو بارکشی کے وقت توپوں کی گرج سے خوف زدہ نہ ہوں، پانی، گولہ اور بارود کی تھیلیوں کا، قلیوں کا، جن کی بڑی تعداد ساتھ ہوتی، اور وہ مختلف کام انجام دیتی۔

اس محکمہ میں کتنے ملازم ہوتے تھے، ان کی کوئی فہرست تاریخوں میں نہیں ملی، لیکن کتابوں کی ورق گردانی سے اتنا پتہ چلا کہ قلیوں کے علاوہ ایک گولہ انداز بھی ہوتا تھا، جو توپوں میں گولے بھرتا، یہ گولے پتھر کے ہوتے، اور وزن میں کئی کئی من کے ہوتے، ایک شخص توپ کی نالی میں بارود بھرتا، جو اس کا بڑا ماہر ہوتا، کہ توپ کی نالی اس قدر لمبی ہوگی تو اتنے وزن کا گولہ اس میں ڈالا جائے گا، اور گولے کو دشمن تک پہنچانے کے لئے اتنے بارود کی ضرورت ہوگی، ایک شخص کے متعلق

پانی کا انتظام ہوتا، توپ جب داغی جاتی تھی تو گولہ نکل جانے کے بعد نالی اس قدر گرم ہو جاتی تھی کہ اس کے پھٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا تھا، یہ شخص ایک ڈنڈے کے سرے پر کپڑا باندھ کر پانی میں خوب تر کرتا، جب توپ کی نالی سے گولہ نکل جاتا تو فوراً وہ تر کپڑا ڈال کر نالی سرد کر دیتا، گولہ بارود ڈال کر بتی میں آگ لگانے کے لئے کوئی مخصوص شخص ہوتا تھا، یا نہیں، اس کا مجھے پتہ نہیں چلا، غالباً یہ کام گولہ انداز کے متعلق ہوتا تھا، جس کا دوسرا نام توپچی ہو سکتا ہے۔ اتنے آدمیوں کا عملہ صرف ایک توپ کے لئے ہوتا، مع عملہ کے متعدد توپوں کے مجموعہ کا نام توپ خانہ تھا، اس پر ایک شخص مقرر ہوتا جس کو افسر توپخانہ کہتے تھے، مغلیہ عہد میں اسی کا نام "میرآتش" تھا

ان عہدہ داروں کی تنخواہیں کیا تھیں، اس کی پوری تفصیل تو نہیں مل سکی لیکن سلطان احمد شاہ اوّل کے زمانہ کے توپ خانہ کے افسروں کی ایک فہرست نظر سے گذری ہے۔ اس میں داروغۂ توپ خانۂ فیل کی تنخواہ دو ہزار ماہوار ٹنکہ تھی[1] اسی حساب سے اس کے ماتحت عہدہ داروں کی تنخواہیں رہی ہوں گی، توپیں کہاں ڈھالی جاتی تھیں اسی کی ابھی تحقیق نہیں ہوسکی ہے، احمدآباد کی فضا تو قطعاً اس کے لئے ناموزوں تھی، اس لئے قیاس یہ ہے کہ اس کے کارخانے ممنہ کے کنارے کھنبایت، دیو، نواگر اور سورت میں ہوں گے، توپیں

---

[1] ٹنکہ (سفید) چاندی کا ایک سکہ ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہے، راقم نے دیکھا ہے موجودہ روپیہ کے برابر ہے

زیادہ تر قلعوں کے فتح کرنے میں کام آتیں، احمد شاہ نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۱) کی جنگ مالوہ میں پہلی دفعہ اس کو استعمال کیا، فرشتہ میں ہے کہ اُس نے قلعہ فتح کرنے کا سامان مثلاً منجنیق ارابہ (توپ) وغیرہ گجرات سے منگوایا تھا[1]، سلطان محمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ (۱۴۵۱) اور قطب الدین متوفی ۸۶۳ھ (۱۴۵۸) کو کسی قلعہ کے فتح کرنے کا موقع نہیں ملا، ان دونوں کی ساری عمر بیرونی حملوں کی مدافعت ہی میں ختم ہوگئی۔

ان دونوں کے برخلاف سلطان محمود اعظم بیگڑہ متوفی ۹۱۶ھ (۱۵۱۰) کو جس نے پچاس برس حکومت کی، توپ کے استعمال کا خوب موقع ملا، اُس نے ۸۷۷ھ (۱۴۷۲) میں دوارکا اسی کے ذریعہ فتح کیا تھا[2]۔ اُس نے اپنے عہد میں توپخانہ کو بڑی ترقی دی، اپنی فوجوں کو قلعہ شکن توپوں کے علاوہ میدانی توپوں کے استعمال کا ہنر بھی سکھایا، اور متعدد لڑائیوں میں اس کا تجربہ بھی کیا۔ ہندوستان میں اس وقت تک توپوں کا استعمال قلعوں اور میدانوں میں ہوتا تھا۔ یہ فخر صرف گجرات کو حاصل ہے کہ اُس کے بادشاہ نے خشکی سے آگے بڑھ کر، سمندروں میں بھی اُن کو استعمال کیا، اُس نے خاص طور سے ایسے جہاز تیار کرائے، جو توپوں کی دھمک کو برداشت کرسکیں، اس میں اس کو کامیابی ہوگئی، تو اس نے مستقلاً سمندری بیڑا بنوایا، جس کی وجہ سے ساحلی مقامات کے تمام قلعے محفوظ ہوگئے، اسی کے ذریعہ اُس نے ۸۹۷ھ (۱۴۹۲) میں مالابار کی بحری

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) ہاتھ میں چھوٹا ماڈرن میں ایک تولہ لیکن خالص چاندی کے برائے نام ملاوٹ ہے [1] فرشتہ جلد اول بیان احمد شاہ [2] ایضاً بیان محمود اعظم

جنگ میں نمایاں فتح حاصل کی[۵۱]

گجرات کا مشہور ترین قلعہ چانپانیر جس کو محمود اعظم نے فتح کیا تھا اس میں بڑا دخل توپ خانہ ہی کا تھا، جس نے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور راجہ اس کا کوئی تدارک نہ کر سکا، کیونکہ اس کے پاس توپخانہ نہ تھا[۵۲] ۹۱۳ھ ۱۵۰۷ء میں سلطان کا بیڑا بہت زبردست ہوگیا تھا، کاٹھیاواڑ سے لے کر مالابار کی سرحد تک اس کے ذریعہ حفاظت ہوتی تھی، جب پرتگیزوں نے ساحلی مقام پر قلعہ تعمیر کیا، اور ان کی لوٹ مار سے اسلامی ممالک کے جہازوں کی آمد و رفت خطرہ میں آگئی، تو سلطان محمود نے اپنے امیرالبحر ملک ایاز کو حکم دیا کہ دیو، دمن اور تھانہ سے جہازوں کا بیڑہ لے کر ان سے جنگ کرے، چنانچہ اس جنگ میں گجراتی توپ خانہ نے اپنی آتش باری سے غنیم کے متعدد جہاز غرق کر دیئے، اور فتح حاصل ہوگئی[۵۳]

سلطان مظفر حلیم متوفی ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء کے عہد میں توپخانہ نے کوئی خاص ترقی نہیں کی، سلطان محمود کے زمانہ میں یہ جس حد تک تھا، اسی سے کام لیتا رہا۔ ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں مالوہ کے سلطان محمود خلجی متوفی ۹۳۷ھ نے جب مدد کی درخواست کی تو مظفر شاہ ایک زبردست لشکر کے ساتھ مالوہ پہنچ گیا، اور مانڈو کا محاصرہ کرلیا، مانڈو کا قلعہ بہت مضبوط تھا جس کا

---

۵۱ ظفر الوالہ جلد اوّل لندن ۵۲ ایضاً ۵۳ ایضاً جلد اوّل بیان محمود اعظم،

فتح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، پھر راجہ میدانی رائے نے اس کی حفاظت کے لئے مزید اہتمام بھی کیا تھا، آخر بڑی جد و جہد کے بعد وہ فتح ہوا، جس کا سہرا اس توپ خانہ کے سر ہے، جو اس جنگ میں استعمال کیا گیا۔ ملا قانعی نے تاریخ مظفر شاہی میں لکھا ہے:

"گولہ اندازوں نے توپوں سے پہاڑ کو بہادرانِ جنگ کی آنکھوں کا سرمہ بنا دیا، اور ان آتش گروں کا رعب پہاڑ کے دل پر بیٹھ گیا"[۱۵]

سلاطینِ گجرات میں سلطان بہادر شاہ ایک ایسا شخص گذرا ہے جس کو توپوں سے عشق تھا، اس نے توپ کے کارخانہ کو بڑی وسعت دی، اور ایسی ایسی توپیں بنوائیں کہ اس وقت تک ویسی توپیں ہندوستان میں نہیں بنی تھیں، اتفاق سے اس کو دو ایسے ماہرفن بھی مل گئے تھے، جو اس زمانہ میں ہندوستان کے کسی دوسرے بادشاہ کو نصیب نہ تھے، ان میں سے ایک پرتگیزی سکنہ نام کا تھا، جس کو اسلام لانے کے بعد "فرنگی خاں" کا خطاب ملا تھا، دوسرا ترکی تھا، جس کا نام مصطفیٰ بہرام تھا، مصطفیٰ امیر سلمان کا بھانجا تھا، جو سلطان سلیمان خاں (قسطنطنیہ) کے عہد میں مصر کے چرکسی بادشاہ کے دربار کا امیر تھا، پرتگیزوں نے جب اپنے بحری بیڑے کے ذریعہ ہندوستانی سمندر میں اسلامی جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی، تو اس کی روک تھام کے لئے ایک بحری بیڑہ اسی امیر کے ماتحت چرکسی بادشاہ نے بھیجا تھا، اس نے قاہرہ (مصر)

---

[۱۵] مظفر شاہی قلمی ص ۲۰۔

آکر دو بڑی توپیں ڈھالیں، اور ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں اُن کو لے کر عدن آیا، لیکن
کسی سبب سے اُس کے بھانجے خیرالدین نے اس کو قتل کر دیا، پھر مصطفیٰ
مذکور نے خیرالدین کو مار ڈالا، اور تمام بیڑے کو لے کر ہندوستان چلا آیا،

۹۳۸ھ/۱۵۳۱ء میں مصطفیٰ دیو بندر پہنچا، اس کے ساتھ امیر سلمان کا غلام خواجہ
صفر بھی تھا، جس کو اُس کے آقا کی نسبت سے خواجہ صفر سلمانی کہتے تھے،
بہادر شاہ نے اس کو "خداوند خان" کا خطاب دیا تھا، مصطفیٰ کے بیڑے
میں وہ توپیں بھی تھیں، جن میں سے ایک کا نام لیلیٰ تھا، اور دوسری کا
مجنوں[1]، مصطفیٰ رومی نے اپنے بیڑے کی تمام توپیں بہادر شاہ کے نذر
کر دیں، سلطان نے بھی ازراہِ قدر دانی اس کو رومی خان کا خطاب عنایت
فرمایا، اور اپنے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ ...... مقرر کر دیا، اس نے
توپخانہ کو بڑی ترقی دی، سلطان بہادر نے دوسری ایک سو توپوں
کے ساتھ ان توپوں کو چانپانیر بھجوا دیا، ہمایوں کی جنگ میں لیلی اور
مجنوں توپوں کو بہادر شاہ خود تباہ کرکے منڈو چلا گیا، باقی مصری توپیں
اکبر بادشاہ کے عہد تک چانپانیر میں پڑی رہیں، جہاں سے وہ سورت
پہنچیں، اور پھر وہاں سے (غالباً کھنبایت کے راستے) جوناگڑھ لائی گئیں،
یہ مصری توپیں جن کو کتابوں میں سلیمانی توپ لکھتے ہیں، اُن میں سے ایک
آج تک جوناگڑھ کے قلعہ میں مسجد کی پشت پر رکھی ہے، عوام نے اس
کا نام "کڑا نال" رکھا ہے، یہ ۱۳ فٹ سات انگشت لمبی اور دہانہ تقریباً دو فٹ کا

---

[1] النور السافر ص ۲۰۳، بغداد،

اس کا گولہ پتھر کا کئی من وزن کا ہوتا تھا، اس کے بنانے والے کا نام محمد ابن حمزہ ہے، دوسری اس سے چھوٹی ہے۔ اور قلعہ کی فصیل پر وہاں رکھی ہے جہاں آج کل واٹر ورکس کے حوض تیار کئے گئے ہیں، اس کا بھی بنانے والا وہی محمد بن حمزہ ہے، اس کا گولہ ایک من کا پتھر کا تھا، پتھر کا ایک گولہ جوناگڑھ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ میں ۱۹۲۶ء میں تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں کاٹھیاوار کا دورہ کر رہا تھا، تو جوناگڑھ بھی گیا، اور وہاں کے عجائب خانہ میں اس کو دیکھا،

ان دونوں توپوں پر جو کتبات کندہ تھے، ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

"یہ توپیں خدا کی راہ میں (کام کرنے کے لئے) عرب وعجم کے بادشاہ سلطان سلیمان خاں بن محمد سلیم خاں کے حکم سے (خدا اس کی مدد کرے) اللہ اور دین کے دشمن، ہندوستان میں داخل ہونے والے ملعون پرتگالیوں کو شکست دینے کے لئے مصر میں ڈھالی گئیں، اور ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں محمد بن حمزہ نے تیار کیں"،

بہادر شاہ کو سلیمانی توپ بہت پسند تھی، اس نے رومی خاں سے فرمائش کر کے اسی سائز کی دوسری توپ بنوائی، جس کا نام اس نے "بہادر شاہی" رکھا، اس وقت بہادر شاہ کے پاس اس قدر اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسرے بادشاہ کے پاس نہ تھا،

مغلوں کے سردار بابر بادشاہ کے پاس جو چند توپیں قلی خاں کے اہتمام میں تھیں، اور جو پانی پت کے میدان میں استعمال کی گئیں، وہ

اس قدر حقیر تھیں کہ ان کا ذکر بھی ننگ معلوم ہوتا ہے، اس سے کہیں بہتر توپخانے تو دکن کی ریاستوں (قطب شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی) کے پاس تھے۔

۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ نے ہمایوں سے شکست کھائی، اور چانپانیر چھوڑ کر دیو چلا گیا، ہمایوں بہادر شاہ کے تعاقب میں جب چانپانیر پہنچا، تو قلعہ کی فوج نے تمام توپیں اندر کر لیں لیکن بہادر شاہی توپ کو وسط کوہ تک لائے، اسی اثنا میں ہمایوں اپنا لشکر لئے ہوئے آ گیا، اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا، مگر انہوں نے از خود کیل مار کر توپ کو بیکار کر دیا، ہمایوں یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا، لیکن غدار رومی خاں (جو اب ہمایوں کے پاس آ گیا تھا) نے اس کو کانٹ چھانٹ کر درست کر لیا، مگر قد میں چھوٹی ہو گئی اور بارود بھی کم لینے لگی، لیکن اس کے باوجود اس کے پہلے ہی گولہ میں قلعہ کا دروازہ گر گیا، اور دوسرے گولہ میں اس کے پاس کا عظیم الشان درخت جڑ سے اکھڑ گیا، یہ دیکھ کر قلعہ والے گھبرا گئے، مگر فرنگی خاں نے جو رومی خاں کا حریف تھا، تاک کر ایسا گولہ مارا کہ بہادر شاہی توپ کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے۔[۱]

بہادر شاہ نے اپنے اس توپخانہ سے بڑا فائدہ اٹھایا، خصوصاً ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء میں چتوڑ کے مضبوط قلعہ کے فتح کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی، رومی خاں کی دانشمندی اور کارروائی سے توپیں اس طرح استعمال کی گئیں کہ

---

[۱] مرآۃ سکندری بیان بہادر شاہ

ہندوستان کے لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے[1]۔ اس توپخانہ کی مدد سے سلطان بہادر شاہ نے برار، دولت آباد، احمد نگر (نظام شاہی) اور مالوہ فتح کر کے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا، جن کا خراج مظفر شاہ آخری سلطان گجرات کے ابتدائی زمانہ تک گجرات کے خزانہ میں آتا رہا[2]۔

اس وقت سلطان بہادر شاہ کے برابر تمام ہندوستان میں نہ کسی کے پاس اس قدر فوج تھی، اور نہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ، یہی وجہ تھی کہ جب ہمایوں نے گجرات پر حملہ کرنا چاہا تو گوالیار تک آکر رک گیا، کیونکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بہادر شاہی توپ خانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس نے رومی خاں سے خفیہ سازش شروع کر دی جس میں وہ کامیاب ہو گیا، اس کے بعد وہ آگے بڑھا، رومی خاں کی غداری کا سبب یہ تھا کہ سلطان بہادر نے اس سے قلعہ فتح ہو جانے کے بعد وہاں کا حاکم بنا دینے کا وعدہ کیا تھا، جس کا ایفا اس نے نہیں کیا، اس سے وہ غداری پر آمادہ ہو گیا، اور ہمایوں سے جا کر مل گیا۔ گجراتی توپخانہ اتنا بڑا تھا کہ جب عثمانیوں نے حملہ کیا، تو غدار رومی خان کے مشورہ سے پوری فوج کو ترکی طریقۂ جنگ کے مطابق توپ خانہ کے حصار میں لے لیا۔ یعنی فوج کے چاروں طرف توپیں اس طرح لگا دیں، کہ جس طرف سے بھی دشمن آئے، توپوں سے اس کو بھون ڈالا جائے، اس طرح سے لشکر میں قحط پڑ گیا، اور توپوں کے حصار کی وجہ سے .... ایک دانہ بھی لشکر تک پہنچنے نہیں پایا،

---

[1] مراۃ سکندری بیان فتح چتوڑ [2] ایضاً۔

تاریخوں میں اسی رومی خاں کے متعلق ایک لطیفہ درج ہے، فتح کے بعد جب رومی خاں دربارِ ہمایوں میں آیا ہے، تو اس وقت ہمایوں کے پاس بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی قفس میں تھا، ہمایوں نے رومی خاں کا نام لیا تو طوطے نے سُن کر تقریباً دس مرتبہ کہا کہ "پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام" رومی خاں یہ صورتِ حال دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہوگیا، ہمایوں نے کہا رومی خاں کیا کروں یہ جانور ہے، ورنہ اس کی زبان کاٹ ڈالتا، رومی خاں اس کے بعد ہمایوں کے ساتھ بنگالہ گیا، اور وہاں جاکر اُس نے رہتاس (بہار) کا قلعہ فتح کیا ہمایوں نے اس کے صلہ میں اسے قلعہ کا حاکم تو ضرور بنا دیا، لیکن آخر میں اُسے زہر دے کر مار ڈالا،

۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ء میں جب سلطان محمود ثالث تخت نشین ہوا، تو مبارک شاہ حاکمِ خاندیس نے سلطان کو نوعمر لڑکا سمجھ کر عماد الملک باغی کی تحریک سے گجرات پر قبضہ کرلینا چاہا لیکن میدان میں جب دونوں فوجیں جمع ہوئیں، تو مبارک شاہ کو گجراتی فوج اور اُس کے توپخانہ کا حال معلوم ہوا۔ اگرچہ صلح کی تحریک گجراتیوں کی طرف سے ہوئی لیکن مصلحت سمجھ کر، اس نے صلح کرلی، وہ جانتا تھا کہ گجراتی توپخانہ کے سامنے اس کا توپخانہ گویا ہاتھی کے مقابل ایک چیونٹی کے برابر تھا، کچھ عرصہ کے بعد جب گجراتی امراء آپس میں لڑنے لگے تو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے کیلئے مبارک شاہ پھر فوج لے کر، گجرات کی سرحد پر آگیا، لیکن اب بھی اس کو

کامیابی نہیں ہوئی،

سلطان محمود ثالث کے زمانہ میں گجراتی توپ خانہ کو ترقی کرنے کا ایک مغتنم موقع مل گیا، ترکی سلطان ترکی نے ۹۶۲ھ ۱۵۵۵ء میں ایک بیڑا پرتگیزوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکال دینے کے لئے بھیجا، اس کا افسر امیرالبحر سید علی ترکی تھا، سوء اتفاق سے یہ بیڑا گجراتی ساحل پر آکر طوفان میں پھنس گیا، اور پھر اُس نے بڑی مشکلوں سے نجات پائی، سید علی جب احمد آباد آیا، تو سلطان کے وزراء نے بڑی کوشش کی کہ وہ یہیں رہ جائے، اور حکومت گجرات سے منسلک ہو جائے، مگر اس نے اس کو منظور نہیں کیا، اور ہندوستان ہو کر ترکی چلا گیا، مگر جہازی توپ خانہ مع اُس کے سارے سامان اور لوازم کے بادشاہ کے سپرد کر گیا، جس سے گجراتی توپ خانہ جدید قسم کی ترکی توپوں کے اضافہ سے اور مضبوط اور مستحکم ہو گیا[۱]

بہادر شاہ کے غرق ہو جانے کے بعد پرتگیزوں نے موقع پا کر دیو پر قبضہ کر لیا تھا، سلطان محمود کو ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں اس کے واپس لینے کا خیال پیدا ہوا، اور جہانگیر خاں کو افسر توپخانہ بنا کر، توپیں ڈھالنے کا حکم دیا، اُس نے ایک سال کے اندر ایک سو توپیں ڈھالیں، جن پر "محمود شاہ جہانگیر" کندہ تھا[۲]

اس کے بعد گجرات کے امیروں میں اس قدر نااتفاقی ہو گئی کہ وہ ذاتی اقتدار کے لئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، اُن کو اس کی

---

[۱] سفرنامہ سید علی ترکی مطبوعہ وطن پریس لاہور [۲] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۸۳ لندن

فرصت کہاں تھی کہ توپخانہ کی طرف توجہ کرتے، ہر امیر کے پاس جس قدر فوجی سامان تھا، اُسی پر اُس نے قناعت کر لی، بلکہ آخر عہد میں جو سلطان مظفر چہارم کا زمانہ ہے، یمن کے افغانوں نے توپ خانہ کے بجائے جنگی ہاتھیوں کا استعمال شروع کر دیا تھا،

گجرات کی تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر گجرات کے امرائے سلطنت باہم متفق ہوتے، اور توپ خانہ کی طرف کامل توجہ رکھتے تو اکبر کا گجرات پر قبضہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کو گجرات فتح کرنے میں ایسی مشکلات پیش آتیں کہ ان پر وہ کسی طرح قابو نہیں پا سکتا تھا، اور گجراتی بہادروں اور دلیروں کے مقابلہ کرنے میں ایک عرصۂ دراز لگ جاتا، یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اعتماد خاں وزیر مطلق غدار ہوگیا، اور اُس نے احمد آباد اور سلطان مظفر دونوں کو اکبر کے حوالہ کر دیا، وہ اپنے ساتھ گجراتی توپخانہ کا بڑا حصّہ ہندوستان لے گیا، اس سے پہلے ہمایوں بھی بہت کچھ لے جا چکا تھا، اکبر کو فتوحات میں اس توپخانہ سے بڑی مدد ملی، اس نے خود بھی ایسی ایسی توپیں ڈھلوائیں کہ اس زمانہ میں یورپ میں بھی نہ تھیں، مشین گن کی ایجاد اور اس کے استعمال کی ابتدا، اگرچہ نظام شاہی عہد میں ہوئی، لیکن بعد میں اکبر نے اس کو بڑی ترقی دی، اس نے ایک ایسی مشین گن ایجاد کی جس سے بیک وقت ۲۲ فیر ہوتے تھے،[1]

---

[1] آئین اکبری جلد اول بیان توپخانہ وبندوق سازی، نولکشور،

گجرات کا بحری بیڑہ

گجرات کی جغرافی حیثیت | ہندوستان کے جنوب مغرب کا حصّہ ملک قدرتی طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ اس کو بحیرۂ عرب گھیرے ہوئے ہے، اس کے سامنے عمان ہے، اس کے داہنی خلیج فارس اور اس کے بائیں خلیجِ عدن ہے، عدن یمن کی پرانی بندرگاہ ہے۔ حضرموت گجرات کے سامنے واقع ہے، اور بحرین خلیج فارس کا بحری مرکز ہے، ان طبعی حالات کے سبب سے گجرات کا عرب کے ساتھ میل جول ایک قدرتی بات ہے، گجرات سے سندھ کا راستہ بھی کھلا تھا۔ اور جہاز یہاں سے سندھ کی پرانی بندرگاہ دیول جاتے تھے، اسی طرح بری اور بحری دونوں سے دکھن کا راستہ بھی کھلا تھا، مشرق میں مارواڑ، مالوہ، خاندیس وغیرہ کا راستہ خشکی کا تھا، اور اس پر کاروان تجارت برابر آتے جاتے تھے، الغرض گجرات کے ایک طرف سمندر اور دوسری طرف خشکی ہونے کے باعث اس کی جغرافی حیثیت بہت اچھی تھی، یورپ، مصر، عرب، شام، عراق، وایران کے

جہازوں کی آمد و رفت کثرت سے تھی، لنکا، مدراس، بنگال، آسام، برما، اور چین جانے والے جہاز گجرات کے کسی نہ کسی بندرگاہ پر ضرور ٹھہرتے تھے۔ گجرات کی خوشحالی اور ثروت کا سبب درحقیقت شروع ہی سے یہی تھا۔

گجرات کی قدیم بندرگاہیں

گجرات کی قدیم بندرگاہیں، کون کون تھیں، ان کا صحیح صحیح حال معلوم کرنا مشکل ہے، ہندوستان کی قدیم تاریخ تاریکی میں ہے۔ اسلامی عہد میں جو بندرگاہیں جاری تھیں، ان کو درج کیا جاتا ہے، رومی اور یونانی تاریخوں سے جن بندرگاہوں کا پتہ چل سکا ہے، ان کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے، مثلاً دوارکا، سومناتھ، کچھ، کھنبایت، دبھوئی (گوگھہ) دھولیرا، دھندھوکا، بھروچ، رودرکھ، گندھار، چیمور، سوپارہ، تھانہ، بعض لوگوں نے اس میں مندرجۂ ذیل ناموں کا بھی اضافہ کیا ہے؛ نوساری، بلیمورا، کیم، پوربندر، مانگرول، تھپ، سورت پور، گنددیوی، گوپناتھ، مہوہ[1]،

اسلامی عہد کی بندرگاہیں

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ گجرات، ٹھیک عرب کے بالمقابل واقع ہے، چونکہ اس زمانہ میں عربوں کا عروج تھا، اسلئے ان کے جہاز چین تک تجارتی مال لے کر جاتے تھے، اور مختلف اغراض کی بنا پر ان کو گجراتی بندرگاہوں پر ٹھہرنا پڑتا تھا، ایک تو تجارتی مال کے خرید و فروخت کے لئے دوسرے سامانِ رسد اور میٹھے پانی کے لینے کے لئے،

---

[1] گجرات نو دیال ونو حصہ گجراتی،

جب گجرات میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی، اور وہاں کے خود مختار سلاطین نے گجرات کو ترقی دینے کی کوشش کی، تو گجرات اور کاٹھیاواڑ میں بہت سی بندرگاہیں کھل گئیں۔ چنانچہ مرآۃ سکندری، مرآۃ احمدی، اور ظفرالوالہ میں بہ تشریح لکھا ہے۔ کہ سلاطین گجرات کے عہد میں ۸۴ بندرگاہیں تھیں[۱] لیکن مجھے ان ۸۴ بندرگاہوں کے نام نہیں مل سکے۔ لیکن تلاش و تفحص سے میں جس قدر معلوم کر سکا، وہ درج ذیل ہیں،

گجرات تین حصوں میں منقسم ہے، خاص گجرات، کاٹھیاواڑ (سورٹھ) اور کچھ، چنانچہ کچھ کی بندرگاہیں یہ تھیں، کھآیت، مانڈوی، مدرا، جکھو، کنڈلا، توُنا، اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہیں مندرجہ ذیل ہیں[۲]:

نولکھی (سوربی) جوڈیا، بیڈی، (جام نگر) سلایا، آرکھا (دوارکا) پنڈ بندر، نوی بندر، مادھوپور، منگرول، جورواڑ، ویراول، سومناتھ، کوڑی نار دیو، جعفرآباد، مہوا، بھاؤنگر، دھولیرا، وبھی پور، گھوگھہ، نوانگر (متصل دیو) گانت متصل (ضدوکا) جھون جھون واڑا،

گجرات کے متعلق حسب ذیل بندرگاہیں تھیں[۳]: کھنبایت (پرم) بھروچ، بھاڑبھوت، گندھار، انکلیشور، ہانسوٹ، سورت، رانڈیر، ڈومس

---

[۱] ظفرالوالہ جلد اول ص ۲۳۲ [۲] گجرات نو ہال وڈو ص ۲ گجراتی

[۳] میرے رفیق کار ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک ایم اے جو میرے ساتھ ریسرچ جک کرتے ہیں۔ ان کا میں شکر گذار ہوں کہ ان میں سے بعض نام گجراتی جغرافیہ سے نکال کر مجھے بتائے،

نوساری، گندیوی، دنساڑ، دمن، ہنگاریہ، وسے، بچ، دیپی گاؤں، کاڈی سنجان، پلی مور (متصل گندیوی) چیور (متصل بمبئی) تماکم، تھانہ، ستوپارہ، بمبئی کلیان، دہانو،

یہ بندرگاہیں تین قسم کی تھیں، اوّل درجہ کی بندرگاہیں وہ تھیں جن میں بڑے بڑے اور بھاری بھاری جہاز آتے تھے، جیسے گھوگھہ، دیو، بھڑچ، ویراول یا ستومناتھ وغیرہ، دوسرے درجہ کی بندرگاہیں وہ تھیں، جن میں متوسط درجہ کے جہاز آجا سکتے تھے، تیسرے درجہ کی بندرگاہیں زیادہ تر کچی تھیں، جہاں چھوٹے چھوٹے جہاز، کشتیاں، ڈونگیاں، ہوڑیاں وغیرہ ٹھہرتی تھیں، اُن کو بنگال، بہار وغیرہ میں عموماً گھاٹ کہتے ہیں، ان کچی بندرگاہوں پر کبھی کبھی بڑے جہاز بھی سمندر میں مد کے وقت آکر ٹھہر جاتے، مال اُتارتے، پھر مال بھر کر مد کا انتظار کرتے، جزر کے وقت یہ جہاز جہاں ٹھہرے ہوتے، کچ ہو جاتے، اور اپنے وزن کے سبب زمین پر پہونچ جاتے،

موجودہ بندرگاہیں برٹش گورنمنٹ کا جب ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو گیا، تو اُس نے تمام بندرگاہیں بند کر دیں، اور پورے ہندوستان میں چار بندرگاہیں باقی رکھیں، کراچی (سندھ) بمبئی (گجرات) کلکتہ (بنگال) اور مدراس، لیکن اُن راجاؤں اور نوابوں کی ریاستوں میں جو ساحل سمندر پر واقع تھیں، مثلاً پوربندر، منگلور، کھنبایت، کچھ وغیرہ میں چند شرطوں کے ساتھ جہازوں کے آمدورفت کی اجازت دی لیکن

یہ شرطیں صرف انہی ریاستوں تک کے لئے محدود تھیں، تقریباً تیس چالیس برس ہوئے کہ انہی شرطوں کے ساتھ کاٹھیاواڑ اور گجرات میں متعدد بندرگاہیں کھل گئیں، اور ان پر کروڑوں روپیہ صرف کیا گیا، وہ یہ ہیں اوکھا منڈل (بڑودہ) پوربندر، مانگرول، ویراول، سومناتھ، کوڑی نار (بڑودہ) جعفرآباد، بھاؤنگر، نوانگر (جام نگر) مانڈوی، کچھ کھنبایت باقی بندرگاہیں جن پر آمد و رفت ہے، وہ زیادہ تر کچی ہیں، اور گورنمنٹ ان پر کڑی نگاہ رکھتی ہے، وہ بمبئی کے پورٹ کمشنر کے مقرر کردہ محصول کو ادا کئے بغیر مال نہیں اتار سکتیں،

بندرگاہوں کا نظام	گجراتی بندرگاہوں کا کیا نظام تھا، اس کا مفصل حال ملنا مشکل ہے، البتہ بعض جزئیات کا ذکر تاریخوں میں

ملتا ہے، راجاؤں کے عہد میں ایک محکمہ بحریہ بھی ہوتا تھا، جس کا مخصوص وزیر ہوتا، چنانچہ سدھراج (۱۱۴۳ھ) سولنکی عہد میں بھارل نامی ایک وزیر اسی عہدہ پر تھا، جو پٹن سے کھنبایت ہر مہینہ آتا تھا، بندرگاہوں پر ایک افسر بھی ہوتا، جس کی اجازت سے جہاز بندرگاہ پر لنگرانداز ہوتا، تجارتی جہازوں کے لئے اس افسر کی اجازت کافی ہوتی تھی، لیکن اگر مسافری جہاز ہوتا، اور اس میں ایسے مسافر ہوتے، جو اس ملک میں رہنے کا ارادہ رکھتے، تو اس کو راجہ سے اجازت لینی پڑتی، محصول لینے کا بھی ایک محکمہ تھا، جو تاجروں کے مال کی جانچ کر کے محصول وصول کرتا تھا، اس محکمہ کی درآمد برآمد دونوں پر نگرانی رہتی،

بڑے بندرگاہوں جیسے کھنبایت اور بھڑوچ سے بڑی آمدنی ہوتی
تھی، چنانچہ ہیونگ تسیانگ چینی سیاح نے لکھا ہے کہ بھڑوچ پر
اس کی دولت وثروت کی وجہ سے آس پاس کے راجاؤں کی
بڑی گہری نظر رہتی ہے،

اسلامی عہد کے محکمہ بحریہ کے متعلق معلومات مسافروں اور سیاحوں
کے بیانات سے حاصل ہوتے ہیں، خلجی اور تغلق کے عہد میں تو اس میں
کچھ زیادہ ترقی نظر نہیں آتی، لیکن سلاطین گجرات کے زمانہ میں اس
کو بیحد ترقی ہوئی، سمندروں کا انتظام جس کے متعلق ہوتا تھا، اس
کو امیر البحر کہتے تھے، اس کا درجہ وزیر بحر کے برابر تھا، اس کا تعلق
براہ راست بادشاہ سے ہوتا تھا، احمد شاہ اول کے عہد (۸۳۴ھ / ۱۴۳۰)
میں مخلص الملک امیر البحر تھا، ابتداء میں شاہ بندر اور امیر البحر دونوں
عہدے ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے، جو بندرگاہ کا بھی انتظام
کرتا تھا، اور جہازی بیڑے کا بھی، سلطان قطب الدین کے زمانہ ۸۶۱ھ / ۱۴۵۶
تک خواجہ علاء الدین شاہ بندر تھے، ۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ میں دیو کا شاہ بندر اسماعیل
نائتہ تھا، ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ میں یعنی سلطان محمود اعظم کے عہد میں فرحت الملک
امیر طوغان امیر البحر ہوا، سلطان مظفر کے زمانہ (۹۲۶ھ / ۱۵۱۹ — ۹۲۸ھ / ۱۵۲۱) تک
ملک ایاز امیر البحر رہا، پھر ۹۲۸ھ میں اس کا لڑکا ہوا، لیکن بہادر شاہ
کے ابتدائی عہد میں اس کو سورٹھ کا حاکم بنا دیا گیا، اور اس کی جگہ
محمود آقا کو امیر البحر مقرر کیا گیا، پھر قوام الملک کو شاہ بندر (حاکم دیو)

اور ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں ملک طوغان بن ایاز کو امیر البحر بنایا۔ اس کے بعد مصطفیٰ بہرام رومی خاں شاہ بندر اور امیر البحر ہوا، دیو، سورت، راندیر، تھانہ، دمن سب اس کے ماتحت تھے۔ اس کے بعد خداوند خاں صفر سلیمانی امیر البحر ہوا، اور اس کی شہادت کے بعد رجب خداوند خاں مقرر ہوا۔ ۹۴۰ھ میں امیر شیخ برہان الملک بنبانی امیر البحر تھے۔ ۹۵۵ھ میں ناصر حبش خاں دیو کا شاہ بندر تھا۔ اس کے بعد دیو دمن پر پرتگیزوں کا قبضہ ہو گیا، بھڑوچ سورت، کھنبایت چند بندرگاہیں رہ گئی تھیں، ان پر امراء قابض ہو گئے۔ مغلیہ عہد میں سمندروں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس لئے جہازی بیڑا بہت کمزور تھا، سفری اور تجارتی جہاز سرکاری کم اور شخصی زیادہ ہوتے۔ مسافر اور مال کا کرایہ مالک جہاز لیتا، لیکن درآمد کا محصول یا سپورٹ وغیرہ شاہ بندر کے متعلق ہوتے، دشمنوں کی مدافعت بھی شاہ بندر کے فرائض میں داخل تھی، چنانچہ پرتگیز جب بھڑوچ میں گھس آئے، اور علی خاں شاہ بندر کو اس کی خبر نہ ہوئی تو سلطان محمود نے اس کو معزول کر دیا۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد اور تیموریوں کے آخری وقت میں سورت اور بھڑوچ کے تین انتظامی حکام ہوتے تھے، شاہ بندر، قلعہ دار، حاکم شہر اور انہی تینوں کی آپس کی لڑائی سے اکثر بندروں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

سلطان محمود ثالث کے عہد میں مندرجہ ذیل بحری افسر تھے۔

۔ آقا فرخ شاہ، فتح خاں، قراحسین، جہانگیر خاں، مصطفیٰ قرمانی، عادل خان قرمانی، رجب خداوند خاں شاہ بندر، اور جہانگیر خاں افسر توپخانہ

اور مصطفیٰ قربانی گولہ انداز تھا، باقی کیا تھے، معلوم نہیں،

تجارتی جہاز جب آتے تو کپتان اس کے مال کی فہرست شاہ بندر کے پاس بھیجتا، اگر وہ مناسب سمجھتا تو سلطان کو بھی خبر کر دیتا، بادشاہ اپنی پسند کا مال خرید لیتا، باقی کیلئے اجازت دیتا کہ تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے، جب تک شاہ بندر جہاز کو ہر اعتبار سے مکمل نہ پاتا اُس کو نہ آنے کی اجازت دیتا نہ جانے کی، مسافروں کے لئے پروانۂ راہ داری ضروری تھا، شاہ بندر کی اجازت کے بغیر کوئی جہاز بندرگاہ سے نہ جا سکتا تھا، نہ کوئی آ سکتا تھا، تین قسم کے جہاز اس محکمہ سے متعلق ہوتے، ایک تجارتی، دوسرا مسافری، تیسرا جنگی، مسافری جہازوں میں ضروری سامان کے علاوہ اتنا ہی مال بار کیا جاتا تھا، جتنا سمندر میں ان کا وزن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا، جنگی جہاز تو دراصل امیرالبحر کے ماتحت ہوتے لیکن بندر پر اُن کے قیام، مرمت، صفائی، سامانِ رسد کی بہم رسانی وغیرہ کے لئے شاہ بندر (پورٹ کمشنر) کی اجازت ضروری ہوتی، مراۃ احمدی کے خاتمہ میں مختلف محکموں کی فہرست دی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ کے ملازمین کی کل تعداد ۲۰۰ تک ہوگی،

گجراتیوں کی جہازرانی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے ساحلی باشندے آج بھی دریاؤں اور سمندروں سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو سمندری تجارت اور جہازرانی سے خاص شغف تھا، سندھ سے کر لنکا تک اُن کے جہازوں کی آمد و رفت تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاوا اور سماٹرا تک جاتے تھے، پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی تک شرب خاندان کی حکومت خشکی

اور تری پر یکساں تھی، ان دونوں تجارت کو بڑا فروغ تھا، چھٹی صدی میں سیلون
اور سورٹھ میں تجارتی تعلقات بڑے وسیع تھے، اسی صدی میں لوگوں نے
مہراحمد جاٹ کو کچھ سے نکال دیا، وہ اور دوسرے لوگ بحرین میں جا کر
آباد ہوئے، ہیونگ تسانگ چینی سیاح نے لکھا ہے کہ ایران کے شہروں
میں ہندوؤں کو بھی آباد دیکھا ہے، یہ جاٹ ان جہازوں میں معلم کا کام
کرتے تھے، جو ایران اور گجرات کے درمیان آمد و رفت رکھتے تھے۔

نویں صدی میں گجراتی اس قدر طاقتور ہو گئے کہ جاوہ میں
برسراقتدار آ گئے، اسی لئے وہاں کا تمدن چینی ہمسایوں کے تمدن
کے مقابلہ میں ہندو تمدن اور کلچر سے زیادہ قریب تھا، چنانچہ وہاں
کے راجہ کو مہاراج کہتے تھے، عرب سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں ان
کا ذکر کیا ہے، اسی سبب سے جاوا کا سکہ گجرات میں بھی چلتا تھا، جس کو
طاطریہ کہتے تھے، اس کو بھی عرب سیاحوں نے لکھا ہے گپت کے سکے
بھی مدغاسکر (افریقہ) اور جاوہ میں چلتے تھے، اور جاوہ کی زبان مدغاسکر
کے تاجر سمجھتے تھے، عرب سیاحوں کا بیان ہے کہ بصرہ اور سیراف میں
ہندو آتے ہیں، مگر وہ خود بھی آپس میں ساتھ مل کر نہیں کھاتے، حالانکہ
اُن کی تعداد سو سے بھی زیادہ پہنچ جاتی ہے، بزرگ بن شہریار نے جو دسویں
صدی کا سیاح ہے اپنی کتاب میں ہندو بنیوں کا بار بار ذکر کیا ہے
یہ عمان بھی جاتے تھے، اور کافی تجارتی فائدہ اٹھاتے تھے، گجرات کا
ایک بنیا ودی نایک نامی یمن میں سلسلۂ تجارت رکھتا تھا، اور خود بھی

کبھی کبھی یہاں جاتا تھا، بھیم دیو دوم (۱۲۴۲ھ) کے پاس بحری بیڑہ تھا اور ارجن دیو (۱۲۷۵ھ) کا امیرالبحر ایک مسلمان تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس محکمہ کو بہت منظم اور باقاعدہ بنا دیا تھا،

بحری مرکز | اقبل تاریخ ہندوستان کی جہازرانی کی تاریخ تاریکی میں ہے تاہم جزئی واقعات سے پتہ چلتا ہے، کہ گجرات کے شمال میں ۲۰۰۰ھ قبل مسیح دوارکا بحری مرکز تھا، جنوب میں بھروچ اور ۹۵۰ ق م میں (دوارکا) بھروچ مرکز نظر آتا ہے، پہلی صدی عیسوی سے کھنبایت کی ترقی شروع ہوئی، گو دلبھی راج یعنی چھٹی صدی میں گھوگھ کو مرکزیت حاصل تھی لیکن تجارت کی منڈی کھنبایت ہی تھا، جنوب میں بھروچ اپنی جگہ پر رہا۔ ساتویں صدی میں بھی بھروچ اور کھنبایت بحری مرکز رہے، جیسا کہ ہونگ شیانگ چینی سیاح کے بیان سے پتہ چلتا ہے، آٹھویں صدی میں بھی گو بھروچ اور کھنبایت کی مرکزیت باقی رہی، مگر چیمور (متصل مبئی) اور سوپارہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی، کیونکہ وہ راشٹرکٹ راجاؤں کی راجدھانی "مان کھیڑ" سے قریب تر تھے، عرب سیاحوں نے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ بڑی تفصیل سے کیا ہے، اسی طرح چوڑا خاندان کے پایہ تخت پٹن سے بھی کھنبایت نزدیک تھا، آٹھویں صدی میں بھروچ کی حیثیت گر گئی، اور کھنبایت بحری مرکز بن گیا، سولنکی راجاؤں اور باگھیلا خاندان کے عہد (۱۳۰۴ھ) تک کھنبایت کی مرکزیت قائم رہی، خلجی اور تغلق کے زمانہ میں بھی

یہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ سلاطینِ گجرات میں سے محمود شاہ اول تک کھنبایت اگرچہ بحری مرکز ضرور تھا، لیکن دیو ترقی کرنے لگا۔ سلطان مظفر دوم اور سلطان بہادر شاہ کے عہد تک دیو بحری مرکز رہا۔ اور اس کی تجارتی حیثیت بھی بہت بڑھ گئی، لیکن محمود بن لطیف خان کے زمانہ میں جب دیو پر پرتگیزوں کا قبضہ ہوگیا، تو کھنبایت پھر بحری مرکز بن گیا، بڑے بڑے جہاز گھوگھہ میں ٹھہرتے، اور وہاں سے کشتیوں میں مال لادکر کھنبایت میں اُتارتے، مظفر شاہ آخری سلطان کے عہد میں امیروں کی خانہ جنگی سے مرکزی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، بھروچ، سورت اور کھنبایت میں الگ الگ حکومتیں قائم ہوگئیں، مغل دور میں کھنبایت اور سورت کی مرکزی حیثیت تو قائم رہی، لیکن بھروچ گرگیا۔ عالمگیر کے زمانہ میں (سنہ ۱۰۶۸ھ) سورت کو بڑی ترقی ہوئی، اور کھنبایت پر زوال آگیا، شاہ عالم کے عہد میں مومن خاں ثانی کھنبایت کا شاہ بندر (پورٹ کمشنر) مقرر ہوا، تو گھوگھہ اور بھروچ اس کے ماتحت ہوگئے (سنہ ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۳ء) اس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار سے ملک میں سخت بدنظمی پیدا ہوگئی، کھنبایت، بھروچ، سورت وغیرہ بندروں پر جو لوگ نائب تھے وہ اُن کے مالک بن بیٹھے، انگریزوں کے قبضۂ گجرات تک یہی عالم رہا۔ اس درمیان میں انگریزوں نے بمبئی کو ترقی دے کر بحری مرکز بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ بھروچ اور سورت دونوں پر قابض ہوگئے، اور کھنبایت کے نواب انگریزوں کے مطیع ہوگئے، غرض وہ جب تمام

گجرات اور کاٹھیاواڑ پر قابض و حکمراں ہو گئے، تو انھوں نے ان بندرگاہوں پر ایسی ایسی شرطیں عائد کیں کہ وہ بند ہو گئیں، اور بمبئی پورے ہندوستان کا بحری مرکز بن گیا، جو آج تک قائم ہے،

بحری مرکز کے معنی یہ ہیں کہ جو مقام بحری مرکز ہوتا، بحری امور کا سب سے بڑا افسر شاہ بندر یا امیر البحر اور بحری امور کے تمام دفاتر وہیں ہوتے. باقی بندرگاہیں اس کے ماتحت ہوتیں، اس افسر کا تقرر تو براہ راست بادشاہ کی طرف سے ہوتا، یہ اپنی طرف سے اپنی ماتحت بندرگاہوں پر اپنا نائب یا حاکم مقرر کرتا، جو اس کے احکام کی بجا آوری اپنا فرض سمجھتے،

اسلامی عہد میں گجراتی بیڑے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے جو جہاز تیار ہوا، وہ بحر عرب کے مقام بحرین میں ہوا، بحرین سمندر میں ہونے کے سبب سے جہاز سازی اور جہاز رانی دونوں کے لئے بہت موزوں جگہ ہے، عربوں کا سب سے پہلا جہاز بحر عرب میں ۱۵ھ ۶۳۶ء میں بحرین سے روانہ ہو کر تھانہ پہنچا، دوسرا بھروچ[1] تیسرا دیول، اس کے بعد تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاز رانی بھی بڑھتی گئی، اور پہلی صدی کے اختتام تک عربوں کے جہاز لنکا، جاوا[2] اور چین تک جانے لگے، چنانچہ انہی عربوں کے وہ جہاز تھے، جن کو دیول کے پاس قزاقوں نے لوٹ لیا تھا، اور لوٹ کا مال اور عورتوں کی واپسی کے انکار پر محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا، دوسری صدی

ہجری کے آخر میں عربوں کی تجارت بحرِ عرب میں بہت ترقی کرگئی، اور تمام بڑے بڑے گجراتی بندر عرب جہازوں سے بھر گئے،

یوگ راج چاوڑہ کے عہد ۱۹۱ میں شیم راج نے سومناتھ کے بندرگاہ پر عربوں کے جن جہازوں کو لوٹا تھا، ان میں دس ہزار گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ لاکھوں روپیوں کا مال تھا، اس سے اس وقت کی تجارتی ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

ساتویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے عربوں کی بحری تجارت اس قدر بڑھ گئی، اور اس کو اتنا فروغ ہوا کہ گجرات کا کوئی بندر ان کے مالِ تجارت سے محروم نہیں رہا، اس سے خود ملک کا راجہ اور اہلِ ملک بھی فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سلسلہ میں خود گجراتی بیڑوں کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، شاید عربوں کی جہازرانی، اور عربی جہازوں کی کثرت نے اس کو بیکار کر دیا ہو،

سلیمان بصری، ابوالحسن زید سیرانی اور مسعودی کے سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے راجے عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتے تھے، ان کے مالِ تجارت کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا، اس سے ان راجاؤں کو بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی، ساتویں صدی کے آخر میں سولنکی اور

---

۱ حلقہ وتن مالا، بیان خاندان چاوڑہ، ان گھوڑوں کی قیمت ستر لاکھ ۶۰ ہزار تھی، اس سے ہاتھی اور دوسرے مال کی قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

باگھیلا خاندان نے جہازوں کی جانب توجہ کی، اور انھوں نے عربوں کی مدد سے ایک بیڑا تیار کر لیا، چنانچہ ارجن باگھیلا کے بیڑے کا امیرالبحر ایک عرب تھا، خلجی اور تغلق خاندانوں کے عہد میں ان تجارتی جہازوں کی آمد و رفت اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی، کہ مسلمان عرب اور ایرانی بڑی تعداد میں راشٹ کٹ کے عہد سے تمام گجراتی بندرگاہوں میں آباد ہو گئے تھے،

مسعودی نے لکھا ہے کہ چیمور میں عربوں اور ایرانیوں کے دس ہزار گھر ہیں، جو تقریباً سب کے سب تاجر ہیں، یا تجارت سے وابستہ ہیں یہی حال دوسرے بندرگاہوں کھنبایت، بھڑوچ، سومناتھ، جوناگڑھ وغیرہ کا تھا، سدھ راج کے زمانہ میں پارسیوں کے بھڑکانے سے ہندوؤں نے جو بلوہ کیا تھا، جس میں انھوں نے بہت سے عربوں کو قتل کیا تھا، اور اُن کی جامع مسجد گرادی تھی،، اس سے عربوں کی وسیع آبادی کا پتہ چلتا ہے،

خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں یہی عرب اور ایرانی نوآبادکار تاجر تھے، جن کے جہاز انفرادی یا مشترکہ طور پر چلتے تھے، ممکن ہے دو چار سرکاری جہاز بھی رہے ہوں، لیکن اب تک حکومت کے کسی تجارتی یا مسافروں کے جہاز یا جنگی بیڑے کا پتہ کتابوں سے نہیں چلا، ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ تمام جہاز ان ہی نوآبادکار غیر ملکی تاجروں کے تھے، بعض مقامی زمینداروں کے بھی اپنے جہاز تھے

لنکا اور مدراس کے سمندر میں اور مالابار کے ساحل پر چینی جہازوں کی آمد کا بھی ذکر ملتا ہے، بحری تجارت سے زیادہ تر بنیے فائدہ اٹھاتے تھے، اور لاکھوں کماتے تھے، مگر ان میں سے کسی کے پاس جہاز نہیں تھا، البتہ گجرات وہاں ڈو میں ایک بنیے کے پاس متعدد جہازوں کے ہونے کا ذکر ہے،

گجراتی سلاطین میں سلطان احمد اول پہلا شخص ہے، جس نے سرکاری طور پر جہازوں کا بندوبست کیا، ۸۳۲ھ میں سلطان بہمنی کے سپہ سالار ملک التجار حسن بصری نے ماہائم کا علاقہ فتح کر لیا، جو گجرات کے ماتحت تھا، سلطان نے اس کے مقابلہ میں مخلص الملک حاکم دیو کو بحری بیڑا روانہ کرنے کا حکم بھیجا، چنانچہ مخلص الملک سومناتھ، گھوگھہ اور کھنبایت سے سترہ جہازوں کا بیڑہ لیکر ماہائم روانہ ہو گیا، اور وہاں سے وہ کامیاب واپس آیا[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا تین بندرگاہوں میں جہاز ہر وقت تیار کھڑے رہتے تھے، یہ گجرات کا گویا اسلامی بیڑا تھا، جس نے سمندر میں حرکت کی،

سلطان محمد اول اور سلطان قطب الدین کو بری مہمات سے فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ بحری مہمات کی طرف توجہ کرتے، لیکن سلطان محمود اول بیگڑہ کو اس سے خاص دلچسپی تھی، اور بعض ترکی امیر البحروں کی آمد نے اس کی دلچسپی میں اور اضافہ کر دیا، اور ان کی وجہ سے گجراتی بیڑا بہت مضبوط ہو گیا، جو سندھ کے ساحل سے لے کر ڈابھول بندر تک ملک کی سرحدوں

---

[1] فرشتہ بیان احمد شاہ اول گجراتی،

کی حفاظت کرتا تھا، محمود نے ترکی طریقہ کے مطابق جہازوں پر توپیں چڑھوائیں اور ان کو اس طرح مسلح کیا۔

سنہ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں سلطان محمد بہمنی نے اپنے وزیر خواجہ محمود کو قتل کر ڈالا، اور چند دنوں کے بعد وہ خود بھی وفات پاگیا، مرکزی سلطنت کی اس کمزوری .... سے فائدہ اٹھا کر بہادر گیلانی نے ساحلی مقامات پر قبضہ کر لیا، اور جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر کے بحری لوٹ مار پر آمادہ ہوگیا، اور دکن سے لے کر گجرات کے بندرگاہوں تک اس نے ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے، بیس گجراتی تجارتی جہاز لوٹ لئے[1] اور اس طرح قریب قریب تمام گجراتی بندرگاہوں پر آمد و رفت بند ہو گئی، اور جو چیزیں باہر سے آتی تھیں، اُن کی درآمد بند ہو جانے سے پورے ملک میں پریشانی پھیل گئی، لوگوں نے ڈلی کی جگہ دھنیا استعمال کرنا شروع کر دیا، سلطان محمود کو اس کا علم ہوا تو تین سو جنگی جہاز توپوں سے مسلح کر کے ڈابھول کے بندرگاہ پر حملہ کرنے، اور بہادر گیلانی کو گرفتار کرنے کے لئے بھیج دیئے،

اس سے سلطان محمود کی بحری قوت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے عہد میں ملک طوغان اور ملک ایاز امیر البحر تھے، اور یہ دونوں بہترین قابلیت کے امیر تھے، ان کو سمندروں کا خاص تجربہ اور جہازوں کے متعلق بڑی واقفیت تھی، سلطان محمود کی انتظامی قابلیت بھی بڑی اعلیٰ درجہ کی تھی،

سنہ ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں اس کو معلوم ہوا کہ پرتگیزی بڑی تعداد میں آ گئے ہیں،

---

[1] برہان مآثر ص ۱۴۰ و ہلی [2] مرآۃ سکندری ص ۱۱۵ بمبئی طبع دوم،

باور ملک کے کسی ساحلی مقام پر قبضہ کرکے قلعہ بنانا چاہتے ہیں، اس نے فوراً امیرِ بحر ایاز کو اُن سے جنگ کرنے کا حکم دیا، اور وہ دیو، دمن، اور جام کے جنگی جہاز کو لے کر ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گیا، اسی اثنا میں ملک اشرف قانصو غوری حاکم مصر نے بھی خاص ہدایات کے ساتھ امیر البحر امیر حسین کو ایک بیڑا دے کر پرتگیزوں کے استیصال کے لئے ہندوستان بھیجا، دونوں مل کر جیون بندر پر جہاں پرتگیز جمع ہو گئے تھے، پہونچ گئے، اور دونوں نے مل کر ایک ساتھ پرتگیزی جہازوں پر گولہ باری شروع کر دی، اور ایک بہت بڑے تجارتی جہاز کو تاک کر ایسا گولہ پھینکا کہ وہ دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا، اس میں ایک کروڑ روپیہ کا مال تھا، اس کے علاوہ اُن کے اور متعدد قسم کے جہاز غرق ہو گئے، اور اُن کو بڑی فاش شکست ہو گئی، اُن کے دس ہزار آدمی قتل اور سات ہزار سے زیادہ گرفتار ہوئے، اور ادھر چھ سو گجراتی اور چار سو ترکی شہید ہوئے[1]، پرتگیزوں کے جیسے عظیم الشان بیڑے کو شکست دینے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجراتی بیڑا کس قدر بڑا، مضبوط اور طاقتور رہا ہوگا۔

اس جنگ کے سلسلہ میں گجراتی جہازوں کی تعداد کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن جب بہادر گیلانی کے استیصال کے لئے جو محض ایک بحری قزاق تھا، ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء میں تین سو جنگی جہاز بھیجے گئے تھے، تو پرتگیزوں کے مقابلہ کے لئے جن کی بحری قوت بہت مضبوط تھی، کتنے جہاز بھیجے گئے ہوں گے، ظاہر ہے کہ پانچ سو سے کم تو نہ رہے ہوں گے،

---

[1] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۸

اسی بحری قوت ہی کا فیض تھا کہ سلطان محمود اوّل کے عہد میں تمام بحرِ عرب میں امن رہا، اور تجارت کو بے حد ترقی ہوئی[۱]۔ اس کے جہازوں میں دس ترکی جہاز بھی تھے، جن میں سے دو برشت اور تین غراب قسم کے اور باقی پانچ ہلکے قسم کے تھے،

امن و امان کے لحاظ سے سلطان مظفر حلیم کا عہد بہت ممتاز ہے، اس کے دور میں کوئی بحری جنگ نہیں ہوئی، پھر بھی پرتگیزوں سے ہر وقت چوکنا اور ان کے مقابلہ و مدافعت کیلئے تیار رہتا تھا، اس کے عہد میں بڑے بڑے جہاز تیار ہوئے، ان میں دہ دو جہاز بھی شامل تھے، جن میں ایرانی سفیر کو واپس کیا گیا تھا، اور خراسان خاں گجراتی سفیر سوار تھا[۲]۔ امیر البحر ملک ایاز تھا، صرف بندرگاہ دیو سے ایک ہزار مسافر اور ایک سو سے زیادہ تجارتی جہازوں کی سالانہ آمدورفت ہوتی تھی، اور دو سو جنگی جہاز ہر وقت تیار رہتے تھے[۳]۔ ان میں سے غالبًا ایک سو کھنبایت کی خلیج میں اور باقی دوسرے بندرگاہوں میں رہتے تھے، اس وقت گجرات کی ساحلی حد سندھ کی سرحد سے لے کر کوکن کی سرحد جیول بندر تک تھی،

سلطان بہادر شاہ کو توپوں اور جہازوں سے عشق تھا، وہ اپنے پایۂ تخت چاپانیر سے بار بار دیو جایا کرتا تھا، اگرچہ محمود اول کے وقت ہی سے گجراتی بیڑے کی دھاک سمندر میں بیٹھی ہوئی تھی، اور پرتگیزوں کی

---

[۱] ظفر الوالہ ص ۳۷، لندن و مرأۃ سکندری ص ۱۱۷، [۲] ایضًا ص ۱۱۶ لندن،
[۳] ؍؍ ص ۲۴۳،

ہمت نہیں ہوئی تھی، کہ ادھر کا رُخ کریں لیکن بہادر شاہ کے عہد میں اس کی دھاک اور زیادہ بیٹھ گئی، وہ مالوہ، دکن اور چیتوڑ کے فتح کرنے کی طرف متوجہ ہوا، اور پایۂ تخت سے دور ہو گیا، تو پرتگیزوں نے چاہا کہ بڑھ کر دیو پر قبضہ کر لیں، لیکن بہادر شاہ کو اس کی خبر مل گئی، اور وہ اچانک دیو پہنچ گیا، جس سے پرتگیزی حواس باختہ ہو گئے، اور بھاگ نکلے، اس واقعہ سے بہادر شاہ چوکنا ہو گیا، اور حکم دیا کہ کھنبایت میں ہر وقت ایک سو جنگی جہاز تیار کھڑے رہیں[1]

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مظفر حلیم کے عہد میں دو سو جنگی جہاز دیو میں رہتے تھے، اور اس کے باپ سلطان محمود اعظم کے عہد میں تین سو جنگی جہاز تھے، سلطان بہادر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مزید نئے جہاز بنانے کا کا حکم دیا، چنانچہ جب وہ تیار ہو گئے، اور ان کو آراستہ پیراستہ کرکے کھنبایت کے بندرگاہ میں ان کی نمائش کی گئی تو اس کے دیکھنے کے لئے سلطان خود کھنبایت گیا[2]

اس وقت تک گجراتی بیڑا بے انتہا ترقی کر گیا تھا، خصوصاً ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں جب مصطفیٰ بہرام (رومی خاں) جنگی اور غیر جنگی جہازوں کا ایک بڑا لے کر یمن سے دیو آ گیا، جس کے ساتھ سلیمانی توپیں بھی تھیں[3] لیکن بدقسمتی سے سلطان بہادر دکھنیوں کے ساتھ جنگ میں الجھ گیا، پھر مالوہ اور چیتوڑ کی فتح میں مشغول ہو گیا، اور سب سے بڑی غلطی اس سے یہ ہوئی کہ ملک آیاز

---

۱ ظفر الوالہ جلد ۱ ص ۲۴۳ لندن ۲ مرآۃ سکندری ص ۲۱۶، بمبئی ۳ ظفر الوالہ جلد ۱ ول ص ۲۴۳ لندن

کے لڑکے ملک طوغان کو جو دیو میں شاہ بندر تھا، معزول کر دیا، اور اس وفادار امیر کی جگہ رومی خان کو امیر البحر اور شاہ بندر مقرر کر دیا، جس نے ہمایوں کی جنگ میں عین وقت پر غداری کی، اور بہادر شاہ کو شکست ہوگئی، وہ شکست کھا کر کھنبایت پہونچا، وہاں سے دیو جانے لگا، تو حکم دیا کہ ایک سو جنگی جہاز جو بندر میں موجود ہیں، جلا دیئے جائیں، تاکہ مغلوں کے ہاتھ نہ لگیں، اس حکم کی پوری تعمیل کی گئی، اگر جلانے کے بجائے اُن کو سمندر میں منتشر کر دیا جاتا، یا دیو روانہ کر دیئے جاتے، تو سب جہاز محفوظ ہو جاتے، اس لئے کہ اس وقت مغلوں کے پاس جہاز نہ تھے، جو وہ ان جہازوں کا تعاقب کرتے، اور اگر کرتے بھی، تو ایک سو جہازوں کا مقابلہ ہمایوں کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا،

$\frac{۹۴۳}{۱۵۳۶}$ھ میں جب بہادر شاہ شہید ہو گیا، تو اس کے بعد بحری بیڑے کو سخت نقصان پہنچ گیا، پرتگیزوں نے دیو کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا جس سے بحری بیڑا کمزور اور تجارت فیل ہوگئی، گجرات کے امراء کی خانہ جنگی کے بعد سلطان محمود نے پھر اس طرف توجہ کی، اور خداوند خاں شاہ بندر نے نئے سرے سے بیڑے کو مرتب کیا،

$\frac{۹۴۵}{۱۵۳۸}$ھ میں سلیمان بادشاہ ایک ترکی بیڑا لے کر پرتگیزوں سے جنگ کرنے آیا، لیکن جنگ ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ واپس چلا گیا، مگر تمام جنگی سامان چھوڑ گیا، جس میں توپیں بھی تھیں، اس سے گجراتی بیڑے کو بڑی تقویت ہوگئی، لیکن وزیر افضل خان کی حماقت سے جب خداوند خاں

اور دوسرے بہترین بحری افسر پرتگیزوں کے ہاتھ سے شہید ہوگئے، تو اس بیڑے کو سخت نقصان پہونچ گیا، جس سے سلطان محمود بحد متاثر ہوا، اور افضل خان کو وزارت سے معزول کر دیا، اور حکم دیا کہ توپیں اور نئے جہاز تیار کئے جائیں، چنانچہ خداوند خان کے لڑکے رومی خاں اور جہانگیر خاں کی نگرانی میں کام شروع ہو گیا، اور تھوڑی ہی مدت میں پانچ سو نئے جنگی جہاز تیار ہوگئے، یہ ان جہازوں پر مستزاد تھے، جو دوسرے بندرگاہوں میں پہلے سے موجود تھے[1]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زوال کے وقت بھی گجراتی بیڑا نہایت مضبوط اور حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے بالکل کافی تھا۔

۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں سلطان محمود کی شہادت کے بعد سلطان احمد ثالث تخت نشین ہوا، تو پھر امراء خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے، اسی دوران میں ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں سید علی ترکی امیر البحر جہازوں کا ایک بیڑا لے کر گجرات آیا، اور سامانِ حرب اور تقریباً ایک درجن جہاز گجراتی افسروں کے سپرد کر کے خشکی کی راہ سے ترکی چلا گیا[2]، لیکن اس کے عملہ کے ۵۰ فی صدی آدمی گجرات ہی میں رہ گئے، امرائے گجرات اگر خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہوتے، تو گجراتی بیڑا اس غیر متوقع امداد سے کتنا مضبوط ہو جاتا، لیکن سلطنت زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی، اس کو یہ امداد بالکل کام نہیں آئی اور اس سے اس کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر

---

[1] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۲۱ [2] سفرنامہ امیر البحر سید علی ترکی وطن لاہور،

پرتگیزوں نے دیو اور دمن دونوں جزیروں پر قبضہ کرلیا، اس سے بحری مرکز کا خاتمہ ہوگیا، سلطان مظفر چہارم کے زمانہ میں کھنبایت اور سورت کے بندرگاہ بحری مرکز تھے، سورت رومی خاں جیسے شاہ بندر کے انتظام میں تھا، اس لئے اس کو بڑی فوقیت حاصل تھی، آخر میں ہر بندر ایک ایک امیر کی جاگیر میں آگیا، اور خود سلطنت کا مرکزی بیڑا برائے نام رہ گیا،

سنہ ۹۸۲ھ ۱۵۷۴ء میں اکبر نے جب گجرات پر قبضہ کیا، تو اس وقت گجراتی بیڑا اتنا کمزور تھا کہ اس میں مدافعت کا بھی دم باقی نہیں رہ گیا تھا، چنانچہ خانِ اعظم جب حج کے لئے گیا تھا، تو اس کو سمندری محصول پرتگیزوں کو ادا کرنا پڑا تھا،

اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں پھر بحری بیڑے کی طرف توجہ کی گئی، اور عالمگیر کے زمانہ میں اس میں کچھ طاقت بھی آگئی، چنانچہ بمبئی وغیرہ میں انگریزوں کے نکالنے کا کام اسی سے لیا گیا، اور سورت کے شاہ بندر کو حکم دیا گیا کہ فرنگی جہاز وہاں سے نکال دیئے جائیں، لیکن حق یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کو سمندر کی جانب کامل توجہ کبھی نہیں ہوئی، اسی لئے عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی امیروں کی نااتفاقی اور خانہ جنگی سے شاہی بیڑے کا خاتمہ ہوگیا، مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ پرتگیزی اور ولندیزی ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ وہ بحرِ عرب اور بحرِ ہند کے مالک ہوگئے، اور ہندوستان کے تمام سواحل اُن کے رحم و کرم پر ہوگئے، پھر جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے

اس میں ترقی کی، تو پرتگیزیوں اور ولندیزیوں پر بھی زوال آگیا، اور وہ چند ساحلی مقامات کو چھوڑ کر ہر جگہ سے نکال دیئے گئے، اور آخر میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو بھی نکال باہر کیا، اور آہستہ آہستہ انھوں نے ہندوستان کے تمام ساحلی علاقوں (بمبئی، مدراس، بنگال) پر قبضہ کر لیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحری بیڑے کا خاتمہ تو سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، تجارتی جہازوں کے بیڑے کا بھی خاتمہ ہو گیا،

مغلیہ عہد میں تاجروں کے پاس اپنے ذاتی جہاز کثرت سے تھے، جو عرب، مصر، ایران، عراق، شام، افریقہ اور جزائر تک جاتے تھے، اور تجارت کے ذریعہ ان سے بڑا نفع کماتے تھے، سورت اس وقت کی بحری تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، سورت کے ایک عبدالغفور نامی تاجر کے پاس اپنے ذاتی جہاز اتنے عمدہ تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس بھی نہیں تھے، مسافری جہاز بھی لوگوں کے پاس بہت تھے، جن کی عرب اور ایران میں بڑی آمد و رفت تھی،

بندروں کی آمدنی | ان بندروں سے سلطنت کو کیا آمدنی تھی، اس کا صحیح حساب بتانا بہت مشکل ہے، مگر خوش قسمتی سے تاریخوں میں بعض ایسی جزئیات مذکور ہیں، جن سے اس پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے،

مولوی سکندر صاحب نے سلطان بہادر کے حالات میں لکھا ہے کہ نظام الملک کی طرف سے شاہ ذاہر سفیر بن کر آئے، تو سلطان بہادر

ان کی علمی لیاقت اور شیریں زبانی سے بہت متاثر ہوا، اور اُن کی بڑی عزّت افزائی کی، تو ایرانی تاجروں نے کہا کہ ہمارا بحری محصول بہت زیادہ ہے، اس کو معاف کردیا جائے، اس نے اقرار کرلیا، اور وہ ملک ایاز کے لڑکے ملک طوغان کے پاس گئے، جو دیو کا شاہ بندر تھا، اور اس کے سامنے اپنی عرضداشت پیش کی، ملک طوغان نے دفتر میں دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ واجب الادا محصول کل ساٹھ ہزار[1] ہے، اس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ معاف کردیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب صرف ایرانی تاجروں کا محصول ساٹھ ہزار تھا تو ایک سو تجارتی اور ایک ہزار مسافر جہازوں کے ذریعہ حکومت کو محصول میں کتنی رقم وصول ہوتی رہی ہوگی،

آصفی نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ سلطان محمود ثالث نے قندھار (گندھار) متصل بھروچ بندر کی آمدنی مکہ اور مدینہ کے لوگوں پر وقف کردی تھی، پھر لکھا ہے کہ خلیج کھنبایت میں ایک چھوٹا سا بندر تھا، جس کی آمدنی ایک لاکھ اشرفی تھی[2]، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک چھوٹے سے بندر کی آمدنی جب ایک لاکھ پونڈ تھی، تو پھر کھنبایت، بھروچ، سورت، گھوگھہ، دیو، دمن، سومناتھ، ماہم، اور تھانہ وغیرہ بندروں کی آمدنی کتنی رہی ہوگی،

مرآۃ احمدی میں بندرگاہوں کی آمدنی پانچ کروڑ بتائی ہے لیکن

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۲۲۳ [2] ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۳،

اس کا ماخذ نہیں بتایا ہے،

مرآۃ احمدی میں ۸۸ بندرگاہوں کا ذکر ہے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:-

دیو بندر، بھیم بندر، بادار پور بندر، کاج، پٹن بندر، فرنگی بندر،

جو بندر محصول یا خراج دیتے تھے، وہ مندرجۂ ذیل ہیں،

چیول، ڈابھول، بلادل، ببی، ڈانڈا، راج پوری، نوا، تمتی، گھری کوٹ، کالن، کوہا امات، کاپی، لمبھا، مال دیو، دھورہ، تند، وانکر، بندر عرب،

مسقط کے متعلق جو بندر تھے، اُن کے نام یہ ہیں،

کران، بصرہ، لوبھی، لاہری ہرمز، سادہ، سیکو، دھنا سری ملکیت، مکینہ، قلتہ، سوال، سودردا، پونما، بدرجی خاں، بیدر، میربھائی، بندر آسن، جینی، ملاخہ، بدرسا، گلستاں، دمار، راکل، جادہ، لیکن یہ فہرست صحیح نہیں ہے، کیونکہ ڈابھول، اور چیول دکن کی بندرگاہیں ہیں، گجرات سے ان کا کوئی تعلق نہیں، اسی طرح عرب کی بندرگاہیں مسقط، اور بصرہ ہندوستان سے باہر ہیں، کران، لاہری، ہرمز، سادہ فارس کے بندر ہیں، چین، اور جاوہ ہندوستان سے بہت دور ہیں، اسی لئے خود علی محمد خاں نے اس فہرست کے بعد تحریر کیا ہے:-

ہرچند کہ تصدیق شرح صدر اکثرے را محل تعجب می نماید یعنی اس کی

تصدیق مشکل ہے،

مرآۃ احمدی کی تحریر کا ماخذ محکمۂ دیوانی کا دفتر ہے، جس کے موروثی سررشتہ دار موہچند تھے، مرآۃ احمدی کے مصنف کا بیان ہے کہ موہچند کے دفتر کے سوا اور کہیں سے کوئی تحریر نظر سے نہیں گذری، جس سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے[1]

اصل یہ ہے کہ موہچند کے بزرگوں نے دفتر دیوانی میں گجرات کے بندروں کے نام تحریر نہیں کئے تھے، بلکہ یہ تحریر کیا تھا، کہ گجرات کے بندروں میں کہاں کہاں سے جہاز آتے تھے، اور ان سے کس قدر آمدنی ہوتی تھی، لیکن مرہٹوں، بابیوں اور حامد خاں کے ہنگاموں سے دفتر دیوانی منتشر ہوگیا، اور سارے کاغذات ضائع گئے، اس لئے موہچند کے پاس کوئی مستند اور صحیح ذریعہ معلومات باقی نہیں رہا تھا، دفتر میں بندروں کے نام اور رقوم کی تشریح دیکھ کر سمجھا گیا، کہ یہ سب گجرات ہی کے بندر ہیں، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ بصرہ، سقطا، جاوہ، اور چین ہندوستان میں نہیں ہیں، سلیمان تاجر بصری نے ایک جگہ اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ کوکن (تھانہ) میں چینی جہاز آتے ہیں، اور ان سے ایک ہزار درہم اور دوسرے جہازوں سے دس دینار تک محصول لیا جاتا ہے[2]

جہازوں کے کارخانے | گجرات میں قدیم زمانہ سے جہاز اور کشتیاں بنتی تھیں جس کا ثبوت قدیم کتابوں سے ملتا ہے، پٹی مورا، کچھ، اور کاٹھیاواڑ

---

[1] مرآۃ احمدی کا مقدمہ ص ۲۲، کلکتہ [2] کتاب الہند و السند پیرس،

میں بڑے بڑے جہاز بنتے تھے، جو ہندوستان کے سواحل پر گھوما کرتے تھے[1]
ان میں تجارتی بھی ہوتے تھے، اور سفری بھی لیکن سرکاری جنگی بیڑے کا پتہ
نہیں چلتا، اس زمانہ میں باجیا (بحری ڈاکو) بکثرت تھے، جو زیادہ تر جاٹ
اور گجراتی ہوتے تھے، اور مسلح رہتے تھے، ابوریحان بیرونی نے بھی ان
بحری قزاقوں کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ بحرِ عرب میں یہ لوٹ مار کرتے
ہیں، اور کچھ ان کا مرکز ہے، لیکن یہ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذرا کہ ان
کے جہاز سفری جہازوں کے برعکس جنگی جہازوں کی طرح ہوتے تھے، عرب
اور ایرانی مسلمان تاجر ابتدا میں عرب سے جہاز لے کر آتے تھے، اور چونکہ
یہاں کے جہاز اُن کے کام کے نہیں ہوتے تھے، اس لئے وہ انہی جہازوں
کو پسند کرتے تھے، جو عرب میں بنتے تھے، لیکن جب گجرات میں ان لوگوں
نے مستقل بود و باش اختیار کر لی، تو یہاں کے جہازوں کو بھی کام میں لانے
لگے، جن کا مرکز کھنبایت تھا،

اسلامی عہد میں سلاطین گجرات سے قبل سرکاری بیڑے کا ذکر کسی گجراتی
تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا، محمد تغلق کے زمانہ میں ابن بطوطہ جب چین
کی سفارت پر روانہ کیا گیا ہے، تو وہ گندھار (بھڑوچ) سے جہاز پر سوار ہوا
اس نے لکھا ہے کہ ہم ناخدا ابراہیم کے جہاز پر سوار ہوئے، چھ جنگی جہاز اُن
کی اپنی ملکیت تھے، تحفہ کے گھوڑوں میں سے ستر گھوڑے اس جہاز میں ساتھ
تھے، باقی گھوڑے اور نوکر ابراہیم کے بھائی کے جہاز پر تھے، راجہ نے بھی ہم کو
ایک جہاز دیا تھا، جس پر ظہیرالدین کے گھوڑے سنبل اور اُن کے نوکر چاکر تھے

---
[1] گجرات ڈوبیاں دوڑص ۲،

راجہ نے ایک اور جہاز ہمارے ساتھ کر دیا تھا، جس پر اس کا قرط کا سوار تھا، یہ جہاز غراب کشتی کے مشابہ لیکن اس سے کچھ بڑا تھا، اس میں ساٹھ چپو تھے، لڑائی کے وقت جہاز پر چھت ڈال دیتے تھے، جس سے چپو چلانے والے پتھر اور تیر سے محفوظ رہتے تھے، ہمارے جہاز میں پچاس تیرانداز اور پچاس حبشی سپاہی تھے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ شاہ دہلی کی طرف سے جو سفارت چین گئی اس کے سارے متعلقین کرایہ کے جہازوں پر سوار تھے، اگر کوئی سرکاری بیڑا اس زمانہ میں ہوتا تو وہی سفیروں کو لے کر جاتا، جیسا کہ سلطان مظفر گجراتی نے ایرانی سفراء کو اپنے سرکاری جہازوں پر بھیجا تھا،

سلاطینِ گجرات میں سے سلطان احمد اوّل پہلا بادشاہ ہے جس کے پاس بیڑا تھا، جس کا مرکز کھنبایت تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ جہازوں کے کارخانے بھی ایسی ہی جگہوں میں ہوں گے، یہاں پارسیوں کی بڑی تعداد آباد تھی، اور یہ لوگ جہاز بنانے میں بڑے ماہر تھے، سلطان محمود کے پاس تین سو جنگی جہاز تھے، اس کے زمانہ میں کھنبایت کے بعد دیو کا بندر بڑی ترقی پر تھا، میرا خیال ہے کہ اس نے کھنبایت اور گھوگھہ کے علاوہ دیو میں بھی جہاز سازی کے کارخانے کھولے تھے، سلطان بہادر کے زمانہ میں جہاز سازی کا کام کھنبایت، گھوگھہ اور دیو کے علاوہ دمن اور بھروچ میں بھی ہوتا تھا،

سلطان محمود ثالث متوفی ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء کے عہد میں سورت، بھروچ،

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم باب ۹۔

گھوگھہ، دمن اور کھنبایت میں بڑے بڑے جہاز سازی کے کارخانے تھے[1] ان کی وسعت، عظمت اور کارکردگی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ چند مہینوں کے اندر ان میں پانچسو جنگی جہاز تیار ہو گئے تھے، جب پرتگیزوں کی جنگ میں توپیں اور جہاز بہت ضائع ہو گئے، اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ کہیں سورت پر حملہ نہ کر دیں تو یہ کارخانے اُن کی مدافعت کے لئے بڑے بڑے جنگی جہاز تیار کرنے لگے، متوسط قد و قامت کے جہاز کچھ سومناتھ، تھانہ، بدانہ اور دوسرے بندرگاہوں میں بنائے جاتے تھے، چھوٹی چھوٹی کشتیاں تو ہر بندر پر معمولی بڑھئی بنا لیتے تھے،

مغلیہ دور میں اگرچہ اس کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی لیکن پرائیویٹ کارخانے بہت تھے،

کہا جاتا ہے کہ ۱۶۶۰ء میں مشہور لنگر کا جہاز وکٹری نامی گجراتی کاریگروں نے بنایا تھا، اس کا وزن دو ہزار ایک سو باسٹھ ٹن تھا، عرض ۵۰ فٹ اور طول ایک سو چھ فیٹ تھا، اس میں سو توپیں اور سات سو سے زیادہ سپاہی آ سکتے تھے، سورت کا جہاز سازی کا کارخانہ بہت اچھی حالت میں تھا، سورت اور دوسرے بندروں کے جہاز بارہ سو سے پندرہ سو ٹن تک کا سامان لیتے تھے، آخر زمانہ میں پارسی جہاز سازی میں بڑے ماہر ہو گئے تھے، پھر یہ کارخانے سورت سے منتقل ہو کر بمبئی چلے گئے، جن کے کاریگر پارسی اور گجراتی تھے، سیٹھ مصنوجی نوشیرواں جی کا خاندان جہاز سازی کے لئے بہت مشہور تھا، ...

---

[1] ظفر، فوالہ جلد اول ص ۲۸۳، لندن،

کی لکڑی سے جہاز بناتے تھے، غرض انگریزوں کے کامل تسلط سے قبل تک گجرات
میں جہاز سازی کے کارخانے موجود تھے، جن میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے
سے بڑے جہاز بے تکلف تیار ہوتے تھے۔[۱]

گجرات گزیٹیر میں ہے کہ سورت میں جہاز سازی کے جو کارخانے تھے
ان کے کاریگر پارسی تھے، یہ بڑے ہوشیار تھے، ان کے بنائے ہوئے جہازوں
پر اٹھائیس ہزار من تک مال لادا جاتا تھا، گجرات نو واہان وٹو میں ہے
کہ سورت میں ایک ہزار سے بارہ سو ٹن تک کے جہاز تیار ہوتے تھے،
ان کے تین چار بادبان ہوتے تھے، ۱۶۱۲ء میں ہنری مڈلٹن نے بحر احمر کی
طرف جانے والے جس سورتی جہاز کو روکا تھا، وہ پندرہ سو ٹن کا تھا، جو
۱۵۲ فیٹ طویل اور ۴۲ فیٹ عریض اور ۳۱ فیٹ بلند تھا، جنگ نامی جہاز
جو ایک گجراتی دھول سیٹھ بھرڈچی کا تھا، اس میں سولہ بادبان بڑے اور
چار چھوٹے تھے، غراب قسم کے جہاز بھی بمبئی میں بنتے تھے لیکن اس کا اصلی
مرکز مالابار تھا، مگر یہ مسلم ہے کہ ایسٹ انڈیا کے اثر اور تسلط سے قبل گجراتی
بندروں میں سلاطین گجرات کے تحت ہر قسم کے جنگی تجارتی اور مسافروں
کے جہاز تیار ہوتے تھے۔

جہازوں کے اقسام جہاز تین قسم کے ہوتے تھے، جنگی، مسافری، تجارتی، ان میں
جنگی جہازوں کی بڑی اہمیت تھی، اور چونکہ یہ مختلف سائز مختلف وزن اور
مختلف کاموں کے لئے بنائے جاتے تھے، اس لئے ان کے نام بھی الگ الگ

---

[۱] گجرات نو وہاں وٹو مطبوعہ گجرات ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد،

ہوتے تھے، ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

سواتی یہ بڑا قلعہ نما جنگی جہاز ہوتا تھا، اس میں متعدد برج ہوتے تھے، اس میں کئی طبقے ہوتے تھے، اعلیٰ طبقہ میں تیرانداز فوج اور آخری طبقہ میں ملاح، بارود انداز وغیرہ ہوتے تھے، یہ مدافعت کے کام میں آتا تھا،

شینی متوسط قد وقامت کے جنگی جہاز میں ۱۵۰ سپاہیوں کی گنجائش ہوتی تھی، اور ۱۴۳ ڈانڈوں سے چلتے تھے،

سونہ بڑا جنگی جہاز حراقہ کے برابر،

حراقہ یہ بڑا جہاز ہوتا تھا، مگر شینی سے چھوٹا، اس میں میگزین توپ، اور بارود وغیرہ رکھی جاتی تھی، اس کا سرا بعض جانوروں مثلاً ہاتھی، شیر، عقاب، سانپ، (اژدہا) کی شکل کا ہوتا تھا،

طریدہ، یہ جنگی کشتی تھی، جو سواریوں کے لئے مخصوص تھی، اس میں صرف چالیس گھوڑے آسکتے تھے،

طراد یہ طریدہ سے چھوٹا جہاز تھا، اس میں سواریاں کم آتی تھیں اس کے سوار زیادہ تر تیرانداز ہوتے تھے،

تیز رو یہ ایک قسم کا جنگی جہاز تھا، جو بہت تیز جاتا تھا، اسی لئے اس کا نام تیز رو تھا،

شلندری یہ بڑا جنگی جہاز مسلح اسلحہ اور مسلح سپاہیوں کے بچانے کے لئے تھا، سونہ اور حراقہ کے برابر ہوتا تھا،

غراب قدیم زمانہ میں ہلکے قسم کا جہاز دو چھوٹے بادبان والا لیکن بعد کو یہ جنگی جہاز بن گیا، اس کی ساخت کوے (پرندے) کی مثل ہوتی تھی، غراب عربی میں کوّے کو کہتے ہیں، اس میں کم از کم سو آدمی سوار ہوتے تھے،

شباک چھوٹا جنگی جہاز جو بحر ابیض اور بحر متوسط میں چلتا تھا،

قارب مثل غراب کے ہوتا، اس میں ذکر پیشہ اور خادم سوار ہوتے، اس کی جمع قوارب آتی ہے،

احمالات بڑا جنگی جہاز تھا، جس میں خوراک، سامان، کاریگر، آلات محاصرہ، دبابہ، منجنیق، برج وغیرہ لادے جاتے تھے، اور دشمن سے مخفی رکھنے کے لئے جہاز پر پردہ ڈال دیتے تھے، جس کو ستار کہتے تھے،

بطس بھاری بھرکم بڑا عظیم الشان اور بڑا خوفناک جہاز تھا، اس میں کئی ہزار سوار لیجا سکتے تھے، اور اس کے متعدد طبقے ہوتے تھے، ان میں بعض صرف فوجیوں کے لئے مخصوص تھے، اس کی شکل مچھلی کی ہوتی تھی،

سیبرت اس میں چالیس مجذاف یعنی ڈنڈے ہوتے تھے،

شذوات اور جابابات دونوں پہلے جنگی جہاز تھے، بعد میں مسافری ہو گئے،

عکبری غراب کے مشابہ لیکن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا تھا، اس میں ساٹھ ڈانڈے ہوتے تھے، اور جنگ کے وقت اس پر

چھت ڈالتے تھے۔ یہ جہاز سندھ اور بحرِ عرب (گجرات) میں زیادہ مستعمل تھا،

بیڑا اس کو عربی میں بارجہ کہتے ہیں جس کی جمع بوارج آتی ہے، یہ بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا، متعدد جہاز جب آگے پیچھے چلتے تھے، تو اُس کو بیڑا کہتے تھے[1] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ لفظ جنگی جہاز کے لئے مستعمل ہونے لگا، چنانچہ بارجہ (بیڑا) اس بڑے جنگی جہاز کو کہتے ہیں جس میں پردے نہیں ہوتے، وہ شونہ کے برابر ہوتا تھا، جس میں بڑی فوج سما سکتی تھی،

برشت غراب کی طرح یہ بھی جنگی جہاز تھا، لیکن ان دونوں میں کیا فرق تھا، یہ نہیں معلوم ہو سکا،

جنگ بعض جگہ یہ لفظ جنگ بضم اوّل و کاف فارسی پایا گیا ہے، یہ ایک بڑا جہاز ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ نے چینی جہازوں کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے، اسی طرح ترکی اور ہندوستانی جہازوں کے ساتھ اس کا نام آتا ہے، اور اس کے بارہ مستول ہوتے تھے، جو بید کی لکڑی کے بنے ہوتے تھے، اور بادبان بوریہ کی طرح بنے ہوئے ہوتے تھے، اُن کو کبھی نیچے نہیں گراتے، بلکہ ہوا کے رُخ پر اُن کو پھیر دیتے ہیں، جب جہاز لنگر ڈالتے ہیں تو بھی بادبان کھڑے رکھتے ہیں، اور ہوا کے ساتھ اڑتے رہتے ہیں، ہر جہاز میں ہزار آدمی ہوتے ہیں۔ چھ سو تو جہاز رانی سے متعلق ہوتے ہیں، اور چار سو سپاہی ہوتے ہیں، اُن میں سے کچھ تیر انداز اور چرخی کے ذریعہ سے روغنِ نفط پھینکنے والے ہوتے ہیں، ہر بڑے جہاز کے ساتھ تین جہاز اور ہوتے ہیں، پہلا آ

---

[1] غیاث اللغات ج ا لکھنو،

بڑے جہاز کا نصف، دوسرا اس کا نصف، اور تیسرا بڑے کا چوتھائی، جنگ درحقیقت جنگی جہاز تھا، بعد میں مسافری ہوگیا، اب بھی چین اور ہند میں بڑے جہاز کو جنگ کہتے ہیں۔

گیلن — یہ بھی ایک قسم کا جنگی جہاز تھا، اس کا ذکر سید علی امیرالبحر ترکی نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے[1]، یہ سب جہاز اس زمانہ میں اسی طرح کے ہوتے تھے، جیسے آج کل کروزر، سب مرین، ڈسٹرائر، ڈیٹ ناٹ، وغیرہ ہیں۔

تجارتی جہاز — تجارتی جہاز اس زمانہ میں بھی ایسے ہی ہوتے تھے، جیسے آج کل ہوتے ہیں، اُن میں مال بھر دیتے تھے، عملہ کے علاوہ بعض دفعہ مالک جہاز اور مالک مال، (تاجر) یا ایجنٹ دوسری منزل پر ساتھ ساتھ ہوتے تھے، اور بعض دفعہ مال بھر کر ناخدا کے سپرد کردیتے، اور وہ موقع مناسب سے فروخت کردیتا، اور کمیشن کاٹ کر نفع مع اصل مالک کے حوالہ کردیتا، جب سمندر میں خطرہ ہوتا تو اس جہاز پر مسلح سپاہی ساتھ کردیئے جاتے، بعض دفعہ مسلح جہاز ڈاکوؤں سے لڑنے اور مال کی حفاظت کے لئے آگے پیچھے ہوتے، ان جہازوں میں نصف میں تجارتی مال ہوتا، نصف میں مسافر اور اُن کا اسباب و سامان، اور ایک حصہ جنگی سامان اور سپاہیوں کے لئے مخصوص ہوتا[2]،

یہ تجارتی جہاز کھنبایت، دیو، دمن، بھڑوچ، سورت وغیرہ سے بصرہ

---

[1] الاسطول الاسلامی مصر و سفرنامہ امیرالبحر سید علی ترکی و دہلی لاہور و سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم اردو دہلی [2] مجالس رنگیں ص ۵۹ لکھنو،

سیراف، بحرین، قطیف، عدن، مخہ، (یمن) جدہ تک جاتے، اور مشرق میں لنکا، مالدیپ، برما، سیام، جاوا، سوماٹرا، جاپان، چین تک پہونچتے تھے، ایک دفعہ راقم الحروف کو کلکتہ میں ایک جاپانی جہاز دیکھنے کا اتفاق ہوا جو رنگون جا رہا تھا، اس میں دو ہی درجے تھے، ایک منزل میں مال بھرا ہوا تھا، اور دوسری منزل میں مسافر تھے، رنگون کے اور کسی جہاز کا اُس وقت ٹکٹ نہیں مل رہا تھا، میں نے چاہا کہ اسی پر سوار ہو جاؤں، لیکن معلوم ہوا کہ اس پر وہی مسافر جاتے ہیں جن کا مال ہوتا ہے، اسی لئے مسافروں کے لئے بہت تھوڑی سی جگہ رکھی گئی ہے، اس طرح کے جہازوں کو آج کل لدو کہتے ہیں،

مسافری جہاز مسافری جہازوں کی ساخت مختلف ہوتی تھی، یک منزلہ، دو منزلہ اور بعض سہ منزلہ ہوتے تھے، سب سے اوپر افسر جہاز کا کیبن ہوتا تھا، جس کو ناخدا، ربان، معلم کہتے تھے، ان میں کوٹھریاں اور کوٹھریوں میں دریچے اور کھڑکیاں ہوتیں، سنڈاس ہوتا، ہر کوٹھری میں دروازہ بھی ہوتا، جو اُس کو لیتا، دورانِ سفر تک وہ اس کا مالک اور متصرف ہوتا، ملاح اور سپاہی اور اُن کے اہل و عیال بھی ساتھ ہوتے تھے، جہاز کے پچھلے حصہ کو دوسہ کہتے تھے، اس میں لکڑی کا حوض بنا کر ترکاریاں وغیرہ بوتے تھے، جہازوں میں رہنے کا حصہ بالکل مکان کی شکل کا ہوتا، جب تاجر کے ساتھ پردہ دار عورتیں ہوتیں، وہ متعدد کوٹھریاں لے لیتا، ورنہ ہر شخص ایک ایک کوٹھری لیتا، اور اس پر قابض ہو جاتا، اگر سمندر میں قزاقوں کا خطرہ ہوتا

تو تیر انداز اور نفط انداز سپاہی بھی سوار کر لئے جاتے، ایک اسلحہ خانہ بھی ہوتا، یہ اسلحہ خانہ اور سپاہیوں کی بارکیں مسافروں سے الگ عموماً اوپر کے درجے میں ہوتی تھیں، نیچے کے حصّہ میں مال و اسباب رکھے تھے اور درمیانی حصّہ میں مسافر ہوتے تھے،

جہازوں کے عہدہ دار اور عملہ — جہازوں میں جو لوگ کام کرتے تھے، اُن کی دو قسمیں تھیں، ایک افسر، دوسرے اس کا عملہ جن کے نام یہ ہوتے تھے،

شاہ بندر — اس کی مثال ٹھیک اسٹیشن ماسٹر کی ہے، یہ پورے بندر کا انچارج ہوتا تھا، اسی کے حکم سے جہاز بندر میں آجا سکتے تھے،

امیر البحر — تمام بیڑوں اور جہازوں کا افسر اعلیٰ جس کو انگریزی میں ایڈمیرل کہتے ہیں، ہر قسم کے جہاز کے عملے اس کے ماتحت ہوتے تھے

ناخدا — کبھی کبھی ناخدا ہی جہاز کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، جس کو ربان یا کپتان کہتے تھے،

ربان — جہاز کا افسر اعلیٰ آج کل اس کو کپتان یا کپتان کہتے ہیں، اس کی مثال ٹھیک ٹرین گارڈ کی ہے۔ جہاز کا چلانا، ٹھہرانا، مال کا چڑھانا، اوتارنا، وغیرہ سب اس کے اختیار میں ہوتا،

قائد — رئیس الجیوش فوج کا سردار اعلیٰ تمام اسلحے اور فوجی انتظام اس کے متعلق ہوتا،

رئیس — سمندر کے پانی اور سمندر کے راستوں کا جاننے والا،

یہ ہر جہاز کا علیحدہ علیحدہ ہوتا،

معلم   فلکی آلات اور نقشوں کا ماہر اور ستاروں کے ذریعہ راستہ بتانے والا، آخر میں اس کو مالم کہتے تھے، یہ فن ریاضی کا ماہر ہوتا تھا،

وکیل   یہ یا تو ناخدا کا وکیل ہوتا، یا تمام جہاز کے تاجروں کا، یہ بڑی شان و شوکت کا ہوتا، جب وہ جہاز سے اتر کر کہیں جاتا، تو تیر انداز سپاہی اور مسلح حبشی اس کے آگے چلتے تھے، اور نوبت اور نقارے بھی ساتھ ہوتے، مسلح محافظ دستہ اس کی حفاظت کرتا،

دیدبان   جہاز کا نگراں جو بہت بلندی سے جہاز کی نگرانی کرتا، اور وہ چیز جو سمندر میں نظر آتی، اس کی خبر ربان (ناخدا) کو دیتا، اس کا صحیح ترجمہ شاید "سگنل مین" ہو، انیسویں صدی میں جب پنڈارے لٹیروں نے ہر ہر گاؤں کو لوٹنا شروع کیا، تو ہر گاؤں میں ایک دیدبان بنایا گیا تھا، جس پر بیٹھ کر ایک آدمی ہر وقت نگرانی کرتا تھا،

اُشاتمہ   یہ افسر مسافروں کا نگراں اور اُن کی ضرورتوں کا کفیل ہوتا،

خمیس، التندیل   ملاحوں کا افسر،

کرانی   کارکن   (کلارک)

مقدمۂ بحر   ہڈ کلرک یا اور کوئی عمدہ دار،

خلاصی   (ملاح) جہاز کھینے والا، جہاز کو صاف رکھنا، رنگنا، چرب کرنا،

مال لادنا، اتارنا جہاز وغیرہ کی مرمت کرنا وغیرہ اس کا کام تھا،

اس فہرست میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے، جو بہت ضروری ہے یعنی اگر جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کی فوری مرمت کے لئے کوئی عملہ ضرور رہا ہوگا، جس کو آج کل انجینیر کہتے ہیں، لیکن عہدہ داروں کے ذیل میں کتابوں میں اس طرح کے عملہ کا ذکر نظر نہیں آیا،

منارہ | جس کو آج کل لائٹ ہاؤس کہتے ہیں، یہ بندر پر تو ہوتا ہی تھا، لیکن خشکی سے پچیس یا پچاس میل کے فاصلہ پر سمندر میں کسی جزیرہ یا پہاڑ کی چوٹی پر یہ منارہ بنایا جاتا تھا، جس میں ایک مستقل عملہ رہتا تھا، جس کا کام اس کا روشن کرنا ہوتا، شب میں سمندر میں بہت دور سے اس کی روشنی نظر آتی تھی، اس سے جہازرانوں کو راستہ کا صحیح پتہ چل جاتا تھا، یہ عملہ ایک مہینہ کا سامان رکھ لیتا تھا، جب وہ ختم ہو جاتا، تو شاہ بندر پھر بھیج دیتا،

جہازوں کی رفتار | جہازوں کی رفتار کے متعلق صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ کیا ہوتی تھی، اس کا تمام تر دار و مدار ہوا کی موافقت پر تھا، لیکن پھر بھی تجربات کی بنا پر مختلف تدبیریں تیز چلنے کے لئے اختیار کی جاتیں، مثلاً بادبان کے پردوں کی تعداد زیادہ کر دیتا، اگر رفتار بہت تیز مقصود ہوتی، تو بادبان کے ساتھ ملاح کے ڈانڈے بھی کام میں آتے تھے، جہاز جس قدر بڑا اور وزنی ہوتا، اسی قدر پردے اور ڈانڈ زیادہ ہوتے، جب کل پردے، اور سارے ڈانڈ جن کی تعداد ۲۰۰ تک ہوتی، کام میں لائے جاتے، تو جہاز

کی رفتار بہت تیز ہو جاتی، اور لمبی سے لمبی مسافت بڑی جلد ہی طے ہو جاتی
جتنی رفتار کم کرنی مقصود ہوتی، ڈانڈا اور پردوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی
جب ہوا مطلق نہ ہوتی، تو صرف ڈانڈوں سے کام لیتے جس کی وجہ سے منزلِ
مقصود تک پہونچنے میں بڑی تاخیر ہو جاتی بعض چھوٹی کشتیاں ایسی بنائی
جاتیں، جو لمبی نوکدار ہوتیں، سمندر میں پانی کو چیرتے ہوئے بہت تیز چلتی تھیں
ہوا اور بہاؤ کا اثر جہازوں پر بہت زیادہ ہوتا ہے،

جہازوں کا سامان | جہاز کے سامان دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک اہم، دوسرا
غیر اہم، مثلاً ناریل کی رسی جو سمندر کے پانی سے نہیں سڑتی، رسی کا گٹھا جس کو
جہاز اور بندرگاہ کی دیوار کے درمیان رکھتے ہیں، تاکہ جہاز کو ٹکر نہ لگنے پائے
اس کے علاوہ مرمت کے چھوٹے بڑے اوزار، جہاز کو صاف کرنے کا سامان
وغیرہ، لیکن ایسی اہم چیزیں جن کے بغیر جہاز بے کار ہو جاتا تھا، حسب ذیل ہیں
شارع یعنی پردے، جس کو ہندوستانی میں پال اور فارسی میں بادبان
کہتے ہیں، جس کو کھولنے اور بند کرنے سے جہاز کی رفتار تیز یا سست ہوتی ہے
اُن کی تعداد جہاز کے چھوٹے اور بڑے ہونے کے اعتبار سے کم و بیش ہوتی ہے
پردوں کے چڑھانے کی لکڑی کو پرمان کہتے تھے،

پتوار یا سکان جہاز کے سرے پر ایک لمبی لکڑی ہوتی تھی، جس کے
نیچے ایک چوڑا تختہ کیلوں سے مضبوط جڑ دیتے تھے، جب جہاز کو ایک رُخ
سے دوسرے رُخ پھیرنا ہوتا، تو لکڑی کو اسی رُخ موڑ دیتے تھے، اس پر
ایک خاص آدمی مقرر ہوتا تھا، جو کپتان کے حکم سے اس کو حرکت دیتا تھا،

کپا جس کو لکڑی کے ذریعہ اس کو کئی آدمی مل کر گھمانے تھے، اس کو کپا کہتے تھے،

دنبالہ کشتی یا جہاز کا پچھلا حصہ، اس کو ہندوستانی میں نیرم کہتے ہیں،

لنگر یہ عموماً جہاز کے پچھلے حصہ اور کبھی اگلے حصہ میں ہوتا، جب جہاز کو ٹھہرانا مقصود ہوتا، تو اس کو سمندر میں آہستہ سے اُتار دیتے، یہ لوہے کا، اور تیس یا چالیس یا پچاس ہندوستانی من کے وزن کا ہوتا، اس کی شکل کانٹے کی طرح ہوتی، اگر پانی کے نیچے زمین ہوتی، تو نوکدار ہونے کے باعث زمین میں گھس جاتا، اور باوزن......................
ہونے کی وجہ سے اتنا مستحکم ہو جاتا کہ بعض وقت لنگر اٹھانے میں کافی محنت کرنی پڑتی، اور زمین نہ ہوتی تو پانی میں جھولتا رہتا، جہاز لنگر کی سمت ذرہ سا جھک جاتا، اس لئے اگر ہوا کا زور ہوتا، تو پھر دونوں طرف کے لنگر گرا دیئے جاتے، جس سے جہاز کا توازن قائم رہتا، یہ لنگر لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں بندھے ہوتے تھے، اس کے لئے ایک خاص عملہ ہوتا، جو چرخیوں کے ذریعہ اس کو اُتارتے اور چڑھاتے تھے اگر لنگر چھوٹ جاتا، تو جھٹکے سے زنجیر ٹوٹ جاتی، اور نہ بھی ٹوٹتی تو جہاز کو جھٹکا ضرور لگتا تھا، اگر عملہ کے کسی آدمی کو اس کا جھٹکا لگتا تو وہ زخمی ہو کر سمندر میں گر پڑتا، لوہے کی زنجیروں کے بجائے ناریل کے بڑے اور موٹے رسّوں سے بھی کام لیتے تھے، بعض جہاز میں نصف زنجیر اور نصف ناریل کا رسّا استعمال کرتے، اس کا طول جہازوں کے حجم اور وزن کے مطابق ہوتا، اس لئے ایک ایک میل کا لمبا رسّا ہوتا تھا،

رہنمارہ نامہ جس کو عربی میں کتاب البحر کہتے تھے۔ اس میں بزرگوں کے سمندر سے متعلق واقعات، بحری سفر کے تجربات، جہازوں کے چلنے کے قوانین ہواؤں کے معلوم کرنے کا طریقہ۔ سمندر کے پانی کا رنگ اور مزہ، سمندر کی مسافت وغیرہ کا حال درج ہوتا تھا، اس کے بغیر جہازراں ایک قدم بھی جہاز نہیں لیجا سکتا تھا، رومی اس کو کپاس کہتے تھے،

بحری نقشے جہازرانی کے لئے سب سے ضروری چیز بحری نقشے ہیں جنکو جہازراں اپنے ساتھ رکھتے تھے جن سے سمندر کے متعلق بہت سی چیزیں معلوم ہوتی تھیں؟ ان نقشوں کو اپنے ذاتی تجربات سے بھی مکمل کرتے، اس میں دریا، ساحل، جزیرے، طول بلد، اور عرض بلد وغیرہ لکھا ہوتا۔ بشاری مقدسی نے چوتھی صدی کے وسط میں، امیر خراسانی کے کتب خانہ میں کاغذ کا اسی قسم کا ایک نقشہ دیکھا تھا، پھر اُس نے امیر ابوالقاسم ابن انماطی کے پاس نیشاپور میں اسی قسم کا کپڑے کا نقشہ دیکھا، ابن ماجد مشہور امیر البحر جب واسکوڈی گاما پرتگالی کو ہندوستان لایا تھا، تو اُس کے پاس بحر ہند کا پورا نقشہ موجود تھا، اس میں خطوط نصف النہار اور خطوط متوازی ترتیب کے ساتھ بہت متصل بنے ہوئے تھے لیکن اس میں ہواؤں کے رُخ کے نشانات نہ تھے، جو مربعے ان خطوط سے بنے تھے وہ بہت چھوٹے ہوتے تھے، اس لئے ساحل کی جدا خطوط نصف النہار کو قطع کرنے والے خطوط شمال، جنوب، مشرق، مغرب سے معلوم ہوتی تھی، وہ بہت صحیح تھی، اس نقشہ پر ہواؤں کے رُخ کے نشانات کثرت سے نہ تھے، جیسا کہ پرتگالی نقشے پر ہوتے تھے، جو دوسروں کے لئے بنیاد کا کام دیتا تھا،[۱]

---

[۱] عربوں کی جہازرانی، سید سلیمان ندوی،

اصطرلاب ایک پیتل کا آلہ جس پر علم نجوم کے احکام کے بموجب نقوش
اور خطوط کھدے ہوتے تھے، اس سے آفتاب اور ستاروں کے سالانہ
ارتفاع کا حساب بخوبی معلوم ہو جاتا تھا[۱]، یہ اصطرلاب ہر جہازراں کے پاس
ضرور ہوتا تھا، واسکوڈی گاما نے جب ابن ماجد امیرالبحر کو لکڑی کا ایک بڑا
اصطرلاب اور دھات کے بنے ہوئے چند اصطرلاب دکھائے، جن سے آفتاب
کی بلندی کا اندازہ ہوتا تھا، تو اس نے قطعی حیرت کا اظہار نہیں کیا،
اور اس نے بتایا کہ بحر احمر کے جہازراں آفتاب اور قطب کی بلندی کا اندازہ
کرنے کے لئے پیتل کے آلات استعمال کرتے ہیں، اور اس سے وہ جہازرانی
میں بہت زیادہ کام لیتے ہیں، ان کی شکل مثلث اور مربع دائرہ کی ہوتی
ہے، اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خود اور کھنبایت (گجرات) اور ہندوستان
کے تمام جہازراں بعض جنوبی و شمالی ستاروں اور چند خاص ستاروں کی
مدد سے جو آسمان میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں، جہازرانی
کرتے ہیں، وہ لوگ آفتاب کی بلندی کا اندازہ اس قسم کے آلات سے
نہیں کرتے، جس قسم کے واسکوڈی گاما نے اسے دکھائے تھے، بلکہ ایک
دوسرے آلہ سے جسے ابن ماجد خود بھی استعمال کرتا تھا، یہ تین تختیوں کا
بنا ہوا تھا، اور اسے واسکوڈی گاما کو اس نے دکھایا بھی تھا،

قطب نما فارسی لفظ ہے، عرب اس کو دائرہ کہتے تھے، جب یہ سوئی
کی شکل کا بنا تو نویں صدی ہجری میں اس کو بیت الابرہ کہنے لگے، یہ وہ

---

۱ نوراللغات، لکھنؤ،

مقناطیسی آلہ ہے جس سے سمت دریافت کی جاتی ہے، اس کے موجد کے حالات اور ایجاد کی تاریخ پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ چینی تاریخوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ چینیوں کے پاس مچھلی کی شکل کا ایک آلہ رہتا تھا۔ جس کو وہ ریاضی کے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، عرب جہازرانوں نے پہلی صدی ہجری (سنہ ۹۰ھ) میں بحری سفر میں سمت معلوم کرنے کے لئے اس سے کام لیا، تیرہویں صدی میں رومیوں نے بھی اس کو استعمال کیا، اس سے پہلے ان کو اس کا علم نہ تھا، تحریری صورت میں عربوں میں سب سے پہلے ادریسی (۵۴۹ھ / ۱۱۵۴) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس کا حوالہ ڈاکٹر موسیو لیبان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں دیا ہے، ساتویں صدی کی ابتدا میں محمد عوفی نے جوامع الحکایات میں نوادر اشیاء کے ذیل میں اس کا شمار کیا ہے۔ یہ ۶۲۲ھ میں سندھ سے کھنبایت (گجرات) آیا تھا، اس کے بعد ساتویں صدی کے وسط (۶۸۱ھ / ۱۲۸۲) میں بیلک قبچاقی نے اپنی کتاب کنز التجار میں اس کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے کہ،

"لوگوں کا بیان ہے کہ وہ ناخدا جو بحرِ ہند میں جہازرانی کرتے ہیں وہ بجائے سوئی اور لکڑی کے ٹکڑے کے ایک قسم کی مچھلی استعمال کرتے ہیں، جو مجوف لوہے کی بنی ہوتی ہے، اور پانی میں ڈالنے سے سطح پر تیرتی رہتی ہے، اور اپنے سر اور دم سے شمال اور جنوب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔"

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آہنی مچھلی کی شکل کے بجائے

سوئی والا قطب نما درحقیقت عربوں نے ایجاد کیا تھا، مگر وہ ساتویں صدی کے آخر تک ہندوستانی سمندر میں استعمال نہیں ہوا تھا، مقریزی ۸۴۵ھ ۱۴۴۱ء خططِ مصر میں لکھتا ہے۔

"بحرِ ہند کے مسافر ہمیشہ ایسی اندھیری راتوں میں جب تاروں سے رونمائی نہ ہوتی ہو، جن سے سمت کا حال معلوم ہو سکے، تو وہ مچھلی کی شکل کا مجوف لوہا استعمال کرتے ہیں، جو بہت پتلا ہوتا ہے، مچھلی کے منہ میں مقناطیس کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے، یہ مچھلی جب پانی میں ڈالی جاتی ہے، تو قطب جنوبی کی سمت گھوم جاتی ہے، اور قطب شمالی کی طرف اس کی دم ہوتی ہے"

اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ نویں صدی کے وسط تک اہلِ ہند سوئی والے قطب نما سے واقف تھے، یہ قطب نما ایک قسم کی مقناطیسی سوئی ہوتی تھی جو لکڑی کے دھاردار ٹکڑے یا نرکل کے ذریعہ پانی میں تیرتی تھی، قبجاقی نے اپنے بحری سفر میں شامی سمندروں میں اس کا استعمال دیکھا تھا، شیخ شہاب الدین احمد بن ماجد سعدی نجدی الملقب بہ اسد البحر اور سلیمان مہری حضر موتی نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر تصریح سے کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ ہند میں اس کا استعمال نویں صدی کے آخر میں ہوا ہے،

ابن ماجد اسد البحر نے اپنی تصنیف الفوائد فی اصول البحر میں اس قطب نما کی ایجاد کا دعویٰ کیا ہے، لیکن ابھی آپ قبجاقی کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ اس کے دعوے ایجاد کی بنا درحقیقت ایک دوسری چیز ہے، جس کو ترقی

دے کر موجودہ شکل میں لایا تھا، اور پھر اس کے لئے ایک ڈبہ ایجاد کی، اور اس میں سوئی رکھدی، جو مقناطیسی اثر سے شمال اور جنوب کی سمت مڑ جاتی ہے، اس نے اس ڈبہ کا نام بیت الابر یعنی سوئی کا گھر رکھا، جو آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہو گیا، اہل یورپ کو مقناطیسی قطب نما کا علم پندرہویں صدی عیسوی کے بعد ہوا، اور وہ بجائے نقشوں کے اسی کو کمپاس کہنے لگے، بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ یورپ کے مشہور سیاح مارکو پولو ۱۲۹۵ء نے مشرقی ممالک کی سیاحت میں اس کو حاصل کیا، اور اپنے اہل وطن کو بطور تحفہ کے دیا، اور بعض قدیم بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ صلیبی کے فرانسیسی مجاہدوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں مشرق سے یہ راز پایا، اور اہل یورپ کے سامنے ظاہر کیا،[۱] ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور بھی بہت سے فلکی آلات اور بحری سامان تھے، جن کا ذکر طویل اور غیر دلچسپ ہے، اس لئے ہم قلم انداز کرتے ہیں، اسد البحر نے اپنی کتاب میں ان کا بتفصیل ذکر کیا ہے،

جہازرانوں کے لئے ضروری علم	جہازرانوں کے لئے مندرجۂ ذیل معلومات بیحد ضروری تھے، جن کے بغیر وہ جہازرانی میں کامل نہیں ہو سکتے تھے،

(۱) علم ہیئت اور ستاروں کا علم (۲) طول بلد اور ارض بلد کا علم: (۳) ہواؤں کا علم کہ کس سمندر میں کس موسم میں، کس وقت

---

[۱] عربوں کی جہازرانی ص ۵۹،

کس رُخ کی ہوا چلتی ہے۔ (۴) سمندر کے ہر مقام کا موسم، فصل، اور اس کے اثرات (۵) مختلف ملکوں کا جغرافیہ اور بندرگاہوں کا جائے وقوع، اور خطرناک بحری پہاڑوں اور تنگ بحری راستوں کا علم (۶) مختلف آلاتِ فلکی کا عملی استعمال، (۷) ملکوں، شہروں، بندرگاہوں اور جزیروں، اور اُن کے باشندوں کی واقفیت (۸) مختلف زبانوں سے واقفیت (۹) شمسی مہینوں اور دنوں کا حساب (۱۰) مدوجزر کا علم جو سمندر میں ہوتا ہے،

جہازوں کے نام | جس طرح آجکل جہازوں کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح اگلے زمانہ میں بھی نام ہوتے تھے، چنانچہ تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ جن جہازوں میں مع مال واسباب خود سوار ہوا تھا، اُن کے نام عکبری جاگیر اور منورت تھے[1] ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء میں الغ خاں نے اپنا جو جہاز مین اور مکہ وغیرہ بھیجا تھا، اس کا نام الغ خانی تھا، اسی پر مشہور عالم ابن فلح سوار تھے، اس جہاز کا مشہور ناخدا حسن علوان تھا، اسی میں فقیہ محمد زبیدی بھی تھے، افسوس کہ یہ جہاز ڈوب گیا[2] ایک جہاز عیدروس نامی تھا، جو شحر و عمان سے دیوانے ہوئے ڈوب گیا، اس میں بہت سے حسنی سادات تھے، ایک جہاز کا نام تیزرو رکھا گیا تھا، محمد آصفی مصنف ظفر الوالہ اسی جہاز پر مکہ سے سورت (گجرات) آیا تھا[3]، ایک جہاز کا نام احمدی تھا، جو سورت سے عرب آتا جاتا تھا[4] مولوی رفیع الدین صاحب جس جہاز پر سوار ہو کر عرب گئے تھے، اس کا نام

---

[1] ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۲۰۳، دہلی، [2] النور السافر ص ۴۲۲ بغداد [3] ظفر الوالہ جلد ۲ ص ۵۰۰ [4] حقیقۃ السورت ص ۷، بمبئی،

سفینۃ الرسول تھا۔[۱]

جہازی عملوں کی تنخواہ

ان جہازی عملوں کی تنخواہوں کا صاف پتہ کتابوں سے نہیں چلتا، لیکن یہ مسلّم ہے کہ ایک جہاز میں سب سے بڑا حاکم خود مختار (ناخدا) ربان، یا کپتان کہلاتا تھا، مغلوں کے عہد میں اس کی جو تنخواہ مقرر کی گئی تھی، اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں، کہ اس کے ماتحت عملہ والوں کی کیا تنخواہ رہی ہوگی، چنانچہ کھنبایت بندر کے ایک جہازی ناخدا کی تنخواہ آٹھ سو روپیہ تھی، جیسا کہ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے،[۲] باقی عملہ چونکہ اس سے کم درجہ کا ہوتا تھا، اس لئے یقین ہے اس سے کم رہی ہوگی، اور درجہ بدرجہ ملاحوں اور قلیوں تک کم ہوتی چلی گئی ہوگی، افسوس ہے کہ جہازی مسافروں نے اپنے سفرناموں اس چیز کی طرف قطعی اعتنا نہیں کیا ہے، اصل یہ ہے کہ ناخدا کو تنخواہ کی پروا نہیں ہوتی تھی، کیونکہ وہ خود بھی تجارت کرتا تھا، کبھی تو اپنا مال لیجاتا، اور کبھی دوسرے تاجر کا وکیل (ایجنٹ) بن جاتا، اور جس بندر پر نفع معقول ملتا، بیچ دیتا، چنانچہ الف لیلہ اور دوسری کتابوں کے پڑھنے سے جو بحری سیاحوں نے لکھی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ناخدا عام طور پر یہ کام کرتے تھے،

گجراتی سواحل کی آمد و رفت

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ گجرات میں عرب، ایران، بغداد، مثلاً وغیرہ کے جہاز آتے جاتے تھے، سلیمان مہری نے نویں صدی ہجری میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ایک فہرست

---

[۱] سفرنامہ حرمین بحوالہ عربوں کی جہازرانی ص ۱۹۶ [۲] آئین اکبری جلد ا،

ی ہے، گجرات سے متعلق اس میں جو کچھ ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے دیول سندھ) سے دیو، دیو سے مسقط، کھنبایت سے عدن، دیو سے ملاگا، دیو سے چاٹگام، (بنگالہ) زیلع (حبشہ) سے گجرات، دیو یا کھنبایت سے براہِ راست گجرات، عدن سے گجرات، قشن سے گجرات، ظفار (یمن) سے گجرات، قلہات سے گجرات، دیو سے شقاص، دیو سے شحرا ور عدن، اور ہاتم کو عرب یہ وہ مقامات ہیں، جہاں سے بکثرت آمدورفت رہتی تھی، ورنہ کھنبایت، دیو، بھروچ، ہانم وغیرہ سے بصرہ، سیراف، قطیف، لنکا، مدراس (معبر) کالی کٹ، بنگالہ، جاوا، ساٹرا، تک جہاز جاتے تھے لیکن جاوا ساٹرا تک جانے والے جہاز زیادہ تر وہ ہوتے تھے، جو چین جاتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ یہ جہاز زیادہ تر غیر ملکی (عرب) ہوتے تھے، خاص گجراتی جہاز کے چین جانے کا پتہ مجھے تاریخوں سے نہیں چلا

بحری راستے اور مسافت گجراتی جہاز منزلِ مقصود تک پہونچنے میں کن کن بندروں پر ٹھہرتے تھے، اور اُن کی کیا مسافت ہوتی تھی، اس کا پتہ چلنا مشکل ہے، تاہم سفرناموں سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،

بصرہ یا سیراف سے جہاز روانہ ہوتا، تو اس کی پہلی منزل جزیرۂ خارک ہوتا، جو ان دونوں مقامات سے پچاس فرسخ یا ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھا، خارک سے اسی فرسخ پر جزیرۂ لاوان، اور یہاں سے سات فرسخ

---

[1] قلادۃ نحور،

جزیرہ بلیہ وللہ، پھر اس سے سات فرسخ پر جزیرہ قین، پھر یہاں سے سات فرسخ پر جزیرہ کیس (قیس) اور آٹھ فرسخ پر جزیرہ ابن گاوان اور سات فرسخ پر جزیرہ ہرمز تھا، یہاں سے سات دن کی مسافت پر مقام سادا تھا، جو سندھ کا سرحدی علاقہ تھا، اس لئے جو جہاز سندھ ہو کر جانا چاہتا، تو پہلے سندھ کے مشہور بندر دیول جاتا، پھر وہاں سے گجرات کا رُخ کرتا، لیکن جو جہاز براہ راست جانا چاہتا تو وہ ہرمز سے چل کر پہلے کچھ کی بندرگاہ پر ٹھہرتا، پھر یہاں سے سومناتھ، اور سومناتھ سے دیو، دیو سے کھنبایت یا (گھوگھ) اور پھر یہاں سے بھروچ جاتا، اور بھروچ سے وتن یا (رانڈیر سورت) اور وہاں سے تھانہ، پھر تھانہ سومناتھ سے کھنبایت تین فرسخ، یہاں سے بھروچ تیس فرسخ، اور سوپارا چھ فرسخ، اور تھانہ پانچ فرسخ تھا، چےمور، و کچھی پد، کابجی، اور درود میں بھی جہاز ٹھہرتے تھے،

درآمد ان جہازوں کے ذریعہ جو چیزیں غیر ملک سے درآمد ہوتی تھیں، اُن کی صحیح فہرست بتانا مشکل ہے، لیکن مختلف کتابوں میں جو چیزیں معلوم ہو سکی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

قدیم زمانہ میں مصر اور عرب سے سونا، روپا، پیتل، قلعی، سیسہ، پارہ، مرجان، کانچ، پکھراج، مونگہ، شراب، کپڑا، وغیرہ آتا تھا، ایران سے غلام، لونڈیاں، سونا، موتی، کھجور، شراب اور کپڑا، خرید کر تاجر لاتے تھے، افریقہ سے سونا لاکر بھروچ آتا رہتے، مالابار اور لنکا سے مسالہ آتا تھا،

لہ المالک والمسالک لابن خرداذبہ ص ۱۴ و کتاب الہند للبیرونی،

کھنبایت میں سونا، روپا، تانبا، گھوڑا، سرمہ اور چمڑا لاتے تھے؎۵۱ بہادر شاہ
کے عہد (۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء) میں دیو میں گلاب، پستہ، مویز لا کر اتارتے، اسلحہ گھوڑے
ریشم کے کپڑے، اور قالین وغیرہ بھی۔

برآمد | بحری راستہ سے جو چیزیں یہاں سے برآمد ہوتیں، اُن کی مکمل فہرست
تو دستیاب نہیں ہوئی، تاہم کچھ اشیاء مندرجۂ ذیل ہیں،

کھنبایت سے سونٹھ، کپاس، گوگل، خوشبودار اشیاء، شکر، اتیل، باریک
کپڑا، لاکھ، آملہ، جوتا، ریشمی کپڑا، عرب، ایران اور افریقہ جاتے تھے، بھروچ
سے تل، روئی، شکر، لاکھ، نیل اور دوسرے اعلیٰ درجہ کے کپڑے عرب اور مصر
جاتے تھے، پیتل، سنکھ، صندل، اور دوسری قسم کی لکڑی ایران جاتی تھی، لاکھ
بھی بہت زیادہ برآمد ہوتی تھی، کھنبایت سے اعلیٰ درجے کے جوتے اور ہاتھی
دانت جاتا تھا، تھانہ کے کپڑے مشہور تھے، جن کو عرب بکثرت لیجاتے تھے، کھنبایت
اور بھروچ سے ساگوان کی لکڑی بصرہ بھیجی جاتی تھی، تاجر فلسطین تک بندر، طوطا،
اور مور لیجاتے تھے، کاغذ اس ملک کا خاص تحفہ تھا، جو عرب، شام، مصر تک
جاتا تھا، اور لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے؎۵۲ سولھویں صدی سے اٹھارہویں
صدی (۱۵۰۰ء سے ۱۷۰۰ء) تک ابریشم، زری، زربفت، مخمل، کمخواب، مشروع،
تلوار، جمدھر، تیر و کمان، مروارید، مرجان، گجرات سے باہر جاتے تھے، البتہ
چاندی ایران اور روم سے آتی تھی،؎۵۳ قاضی مرتضیٰ حسن بلگرامی لکھتے ہیں:-

---

؎۵۱ گجرات سرو سنگھرہ ص ۲۵۱ و ۲۵۲ ؎۵۲ مقدمہ مرآۃ احمدی بمبئی،

؎۵۳ چار گلشن قلمی مصنفہ رائے چترمن منقولہ ۱۱۷۳ھ،

ب۔ احمد آباد گجرات میں قلمدان، صندوقچے، پارچہ زرتار، کرنبد، کم خواب، زربفت، مشروع، تافتہ، ٹاٹ بند، اور مخمل بہت اعلیٰ درجہ کا بنتا ہے، اور تلوار، جمدھر، تیر و کمان بھی اس جگہ کی مشہور ہے، میں نے خود اپنی آنکھ سے ان سب کو دیکھا، واقعی بے نظیر ہیں[۵۱] انہی ایام میں سرخیز (سرکھیج) سے بکثرت نیل باہر جاتی تھی عرب کے علاوہ یورپ میں بھی اس کی بہت مانگ تھی[۵۲]

سولہویں صدی کے آخر میں تباکو کی کاشت گجرات میں بہت ہوتی تھی، ۱۶۳۶ء میں سورت سے تباکو جہازوں میں بھر کر جاتا تھا، چنانچہ ۱۶۴۲ء میں مخہ (یمن) اور اراکان بھیجا گیا تھا[۵۳]

گجراتی جہازرانوں کے نام | گجراتی جہازرانوں کے نام کا شمار مشکل ہے، کیونکہ سلطان احمد کے عہد حکومت سے مستقل طور پر سرکاری بیڑہ نظر آتا ہے، جس میں مسافری، تجارتی اور جنگی جہاز سب شامل ہیں، ان میں سے ہر جہاز پر متعدد افسر ہوتے تھے، سلطان مظفر ثانی کے عہد میں ایک ہزار مسافری، اور ایک سو تجارتی جہازوں کی سالانہ آمد و رفت تھی، اور دو سو جنگی جہاز مستقل طور پر بندر دیو میں رہتے تھے، اسی طرح بھروچ، راندیر، سوپارہ، چیمور، تھانہ، ماہم وغیرہ میں جہاز آتے جاتے رہتے، ان جہازوں کے مالک زیادہ تر گجراتی تھے، ان میں کچھ تو اصلی تھے، اور بڑی تعداد ان عربوں اور ایرانیوں کی تھی، جو گجرات میں آکر بس گئے تھے، اب اگر ہر بندر کے شاہ بندر، امیر البحر، ناخدا، ربان (کپتان) اور معلم ہی کو لے لیا جائے، تو کئی

---

[۵۱] حدیقۃ الاقالیم، اقلیم دوم، قلمی کتب خانہ راجہ سلیم پور لکھنؤ۔ [۵۲] ظفر الوالہ ج ا ص ۲۲۰

[۵۳] معاشی حالات ہند ص ۱۱۰،

ہزار ہوں گے، ان میں سے چند جہازرانوں کے نام جو آٹھویں، دسویں، بارہویں صدی کے ہیں، پیش کئے جاتے ہیں، کتابوں میں اُن کے نام آجانے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اپنے وقت کے بہترین ماہرفن تھے، ان میں سے شاہ بندر اور امیرالبحر کے کچھ نام اوپر آچکے ہیں، اور کچھ نام اور دوسرے بعض افسروں کے نام یہ ہیں :-

نویں صدی ہجری میں ناخدا اسماعیل نائتہ ایک مشہور شخص تھا، اس کی شہرت ہی کے باعث اس کو آخر میں شاہ بندر بنا دیا گیا تھا آٹھویں صدی ہجری میں ابراہیم ناخدا بڑا نامور تھا، اُس کے متعدد ذاتی جہاز تھے، اس کے بھائی کے پاس بھی کئی جہاز تھے، جو گندھار گجرات بھروچ سے چین تک جاتے تھے، ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ میں معلم حسن تھا، جو نانڈیر (راندیر متصل سورت) سے عرب جایا کرتا تھا،

نویں صدی میں موسیٰ منڈل حبشی ناخدا تھا، یہ اپنے وقت کا بڑا ماہر فن تھا، اس کے جہاز بھی زیادہ تر عرب جاتے تھے، معلم حیو ابن المہری بھی مشہور معلم تھا، ظفرالوالہ کے مصنف نے اس کا خاص طور سے نام لیا ہے، یہ دسویں صدی ہجری میں تھا، اور گجرات سے عرب جانے والے جہاز وہیں میں رہتا تھا، اسی صدی کا مشہور ناخدا محمد علی ہے، یہ بھی زیادہ تر عرب کے جہازوں سے تعلق رکھتا تھا، ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ میں حسن علوان مشہور ناخدا [illegible] کے جہاز پر تھا، اور جہاز ڈوب جانے سے وفات پا گیا، تقریباً ۱۱۵۰ھ میں شیخ ڈاکور مشہور معلم اور مصنف تھا، ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۱ کے قریب عنایت (عنایت [illegible])

شیخ ملکو رسکا رنا کا بھی بہت بڑا معلم تھا، جزیرہ بمبئی میں رہتا تھا، (ڈاکو رہ ایک مشہور قصبہ ہند گو دھرہ لائن پر ہے)

گجراتی تصانیف :- گجرات کے کن کن لوگوں نے جہازرانی کے متعلق کتابیں لکھی افسوس ہے کہ اس کے متعلق صحیح معلومات ناظرین تک پہنچانا مشکل ہے لیکن بعض ایسی کتابیں نظر سے گذری ہیں، جن سے قیاس ہوتا ہے کہ اس فن پر دوسرے گجراتی ماہرین فن نے ضرور کتابیں لکھی ہوں گی، ہندوستان پر برٹش گورنمنٹ کے قبضہ، اہل ملک کی ناقدر دانی اور یورپین جہازرانی کی اعلیٰ تعلیم نے افسوس ہے کہ اس قسم کی قدیم تصنیفات کو ضائع کر دیا ان میں سے بچی کھچی کتابیں جو ادھر ادھر کتب خانوں میں باقی رہ گئی ہیں انہی کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک کتاب سندھی یا کوکنی زبان میں ہے، راقم الحروف جب سنہ ۱۹۳۱ء میں علمی تحقیقات کے سلسلہ میں بمبئی گیا تھا، تو جامع مسجد کے کتب خانہ میں دو کتابیں میری نظر سے گذری تھیں، ایک خط نسخ میں تھی، لیکن میں عجلت کی وجہ سے معلوم نہ کر سکا، کہ وہ سندھی میں ہے یا کوکنی زبان میں، کسی عربی کتاب کی شرح معلوم ہوتی تھی، اول سے ناقص تھی، بعض جگہ عربی زبان بھی استعمال کی گئی ہے، مثلاً معرفۃ العباد والکواکب المشہور عند الجمہور بعد ادکا وعن نقطۃ الکرۃ بجمیع دشمانون درجۃ ہر عنوان کی شرح کے معرفت کے لفظ سے قائم کیا گیا ہے، ایک جگہ صحیح قول معلم سلیمان مرقوم تھا، بعض جگہ فارسی زبان بھی استعمال کی گئی ہے، جس میں ہر جگہ

کا بحری فاصلہ بتایا گیا ہے، جزیروں کے نام بھی دیئے ہیں، مصنف یا کاتب کا نام کہیں نہیں لکھا ہے، اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۰۲؁ کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب بھی خطِ نسخ میں تھی، اس کا حجم معقول اور مکمل ہے۔ زبان سندھی یا کوکنی ہے جو فارسی کے ساتھ مخلوط ہے، اس کا کاتب آخر میں لکھتا ہے:

"کاتبہ و مالکہ فقیر الحقیر بہ تقصیر معلّم عنایت بن معلّم شیخ واکو (ڈاکوبر)
در جزیرۂ بمبئی ۱۰ رجب"

سنہ کا پتہ نہیں چلا، اندرونی شہادت سے ۱۱۹۶؁ معلوم ہوتا ہے یہ کسی کتاب سے منقول ہے اور بے قاعدہ لکھی گئی ہے، بیچ بیچ میں روزنامچہ بھی آجاتا ہے۔ کیا عجب ہے یہ معلّم شیخ عنایت کا سفینہ (نوٹ بک) ہو۔

تیسری کتاب کوکنی (یا گجراتی) زبان میں تھی، یہ ۱۹۳۰؁ء میں جناب یوسف کھٹکے صاحب بی اے مرحوم ناظم جامع مسجد بمبئی کے پاس تھی، لیکن اُن کی وفات کے بعد اس کتاب کا پتہ نہیں چلا، اُن کی جمع کردہ کتابیں بمبئی یونیورسٹی نے خرید لی ہیں۔

یہ وہ کتابیں ہیں جو بالکل اتفاقیہ نظر سے گذریں، ورنہ اگر تلاش و تفحّص سے کام لیا جائے، تو اور بھی کتابوں کا پتہ چل سکتا ہے، خصوصاً ان خاندانوں میں جن میں آج سے پچاس برس قبل معلّم موجود تھے، ان میں سے ایک خاندان سورت میں آج بھی مالم کے نام سے موجود ہے اور تجارت کرتا ہے، ابن ماجد نجدی نے اس فن پر چبیس کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے ایک کا نام "قصیدۂ مکیہ" ہے۔

سلہ عربوں کی جہازرانی، ص ۱۹۰۔

اسی میں مکہ، جدہ، کالی کٹ، دیول، کوکن، گجرات اور ہرمز کے بحری حالات درج کئے ہیں، ۱۳۹۰ھ کی تصنیف ہے،

یورپ کا پہلا جہاز | جدید تحقیقات یہاں تک پہنچی ہے کہ پچھلے رومن امپائر کے جہاز کالی کٹ آتے تھے، کچھ سکے بھی برآمد ہوئے ہیں، لیکن رومن امپائر کے زوال کے ساتھ جہازوں کی آمدورفت بند ہوگئی، اور پندرہویں صدی تک پھر کوئی جہاز یورپ سے ہندوستان نہیں آیا،

یہ معلوم کرکے آپ کو تعجب ہوگا کہ دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) پرتگالی جہاز جو یورپ کا سب سے پہلا جہاز تھا، اس کو ہندوستان لانے والا ایک گجراتی تھا، جس کا اصل وطن نجد (عرب) تھا، اس کا نام ناخدا معلم احمد بن ماجد ہے، یہ بحر بربر سے لے کر بحر ہند، بحر عرب، بحر احمر اور بحر فارس تک کا سب سے بڑا تجربہ کار جہازراں اور جہازرانی کے علوم اور آلات کا سب سے بڑا واقف کار تھا، یہی واسکوڈی گاما (پرتگیز) کو راستہ بتا کر ہندوستان لایا تھا، اس واقعہ کو عرب اور پرتگیزی دونوں تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ گجرات کے مشہور عالم قطب الدین نہروالی (مکی) البرق الیمانی میں لکھتے ہیں کہ

دسویں صدی کے شروع میں جو عظیم الشان واقعات پیش آئے، ان میں فرنگی اقوام میں سے پرتگالی قوم کا ہندوستان کے دیار میں پہنچنا ہے، اس سے ایک گروہ تنگنا سے سبتہ (اسپین) سوار ہوتا تھا۔ اور بحر ظلمات (اٹلانٹک) سے ہوکر ان جبال قمر کے پیچھے آجاتا تھا، جو دریائے نیل کا منبع ہیں۔ اور مشرق

میں اس مقام پر پہونچ جاتا تھا، جو ساحل کے قریب ایک تنگنا جیسی ہوتی ہے جس کے ایک طرف پہاڑ دوسری طرف بحر ظلمات ہے یہاں کی موجیں بہت شدید تھیں، وہاں جہاز ٹھہر نہیں سکتے تھے، بلکہ ٹوٹ جاتے تھے، کوئی بچتا نہیں تھا، وہ اسی طرح اس جگہ تباہ ہوتے رہے، اور ان میں سے کوئی بچ کر بحر ہند میں نہیں پہونچ سکا۔ یہاں تک کہ جہازرانوں میں سے ایک ماہر جہازراں نے جس کا نام احمد بن ماجد تھا، ان کی رہنمائی کی فرنگیوں کے افسر نے جس کو ہندی والیرانتی یعنی امیر البحر کہتے تھے، اس کو اپنے ساتھ لیا' اس کے نشہ کی حالت میں اس سے بہت بے تکلف ہوگیا، اور اسی نشہ کی حالت میں اس افسر کو راستہ بتا دیا، کہا کہ پہلے ساحل کے قریب نہ جاؤ، لیکن سمندر میں گھستے چلے جاؤ، اور پھر لوٹو، تب سمندر کی موجیں تم کو نہ پائیں گی جب اس نے اس پر عمل کیا، تو ابن ماجد جوش میں آگیا، اس کے بعد پرتگالیوں کے بہت سے جہاز یکے بعد دیگرے بحر ہند میں پہونچنے لگے، اور انھوں نے گوا میں اپنا بحری مرکز بنا لیا۔"

اس سے زیادہ واضح خود واسکوڈی گاما کے ہمراہیوں میں سے ایک بروس نامی نے لکھا ہے وہ کہتا ہے:

جب واسکوڈی گاما مالندی میں تھا، تو کھنبایت واقع گجرات کے چند بنیے (تاجر) امیر البحر سے ملنے آئے، ان کے ساتھ گجرات کا ایک (مور) (عرب مسلمان) تھا، جس کا نام مالیموکنا تھا، (معلم گنگا) یہ اسد البحر ابن ماجد معلم ہندوستانی عرب تھا، یہ اس لطف کے خیال سے جو اس کو ہمارے

آدمیوں کے صحبت میں لگا تھا۔ نیز مالندی کے بادشاہ کو خوش کرنے کی غرض سے جو پرتگالیوں کے لئے ایک رہنما تلاش کر رہا تھا۔ اُن کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا، واسکوڈی گاما نے اس سے باتیں کیں۔ تو اس کی بحری واقفیت پر اس کو بڑا اطمینان ہو گیا، اس مور نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کے پورے ساحل کا نقشہ دکھایا، جو قوم مور کے نقشوں کی طرح خطوط نصف النہار اور خطوط متوازی کی ترتیب کے ساتھ بہت مفصل طور پر بنا ہوا تھا، لیکن اس میں ہواؤں کے رُخ کے نشانات نہ تھے، چونکہ جو مربعے ان خطوط نصف النہار و خطوط متوازی سے بنے تھے، وہ بہت چھوٹے تھے، اس لئے ساحل کی جو راہ ان خطوط سے معلوم ہوتی تھی بہت صحیح تھی، البتہ اس پر ہواؤں کے رُخ کے نشانات زیادہ نہ تھے، جیسا کہ ہمارے پرتگالی نقشوں میں ہوتے ہیں، اور دوسرے نشانیوں کے نئے بنیادوں کا کام دیتے تھے،

واسکوڈی گاما نے اس مور (مسلمان عرب) کو لکڑی کا وہ اصطرلاب جو اس کے پاس تھا، اور دھات کے اور چند اصطرلاب بھی دکھائے، جن سے آفتاب کی بلندی کا اندازہ کیا جاتا تھا، لیکن مور نے ان آلات کو دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، اس نے بتایا، کہ بحرِ عرب کے جہازراں آفتاب اور قطب ستارہ کی بلندی کا اندازہ کرنے کے لئے، جس سے وہ جہازرانی میں کام لیتے ہیں، پیتل کے آلات استعمال کرتے ہیں، جن کی شکل مثلث اور ربع دائرہ کی ہوتی ہے، اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اور کھنبایت (گجرات) اور ہندوستان کے تمام دوسرے جہازراں جنوبی و شمالی اور بعض دوسرے ستاروں کی مدد

سے جو آسمان پر مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوتے ہیں، جہازرانی کرتے ہیں، وہ لوگ آفتاب کی بلندی کا اندازہ اس قسم کے آلات سے نہیں کرتے تھے، جیسے واسکوڈی گاما نے اسے دکھائے تھے، بلکہ ایک دوسرے آلہ سے کرتے تھے، جو خود اس کے پاس بھی تھا، اور وہ اسے استعمال بھی کرتا تھا؛ واسکوڈی گاما کو دکھانے کے لئے وہی آلہ فوراً لایا، یہ آلہ تین تختیوں کا بنا ہوا تھا،

غرض اس گفتگو کے بعد جو ان لوگوں نے جہازراں سے کی، واسکوڈی گاما کو احساس ہوا کہ اُس نے ایک بڑا خزانہ پالیا، اور یہ خیال کرکے کہ کہیں وہ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے جس قدر جلد ممکن ہوسکا، لنگر اٹھا دیا، اور جہاز روانہ ہوگیا، اور ۲۴ اپریل ۱۴۹۸ء (۹۰۳ھ) کو کالی کٹ پہونچ گیا،[۱]

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ شہاب الدین مجوزہ عربوں کی جہازرانی ص ۱۴۰،

فہرستِ مآخذ

شمار	نام کتاب	شمار	نام کتاب
۱	مرآۃ سکندری بمبئی		فضیلت النساء بھروچ)
۲	طبقاتِ اکبری کلکتہ	۱۳	النور السافر بغداد
۳	فرشتہ نولکشور	۱۴	آداب الحرب والشجاعہ، لاہور
۴	ظفر الوالہ لندن		بحوالہ دونیل تاریخ میگزین
۵	فیروز شاہی ضیاء برنی کلکتہ	۱۵	کتاب نجات حیدرآباد
۶	مسالک الابصار جلد دوم مصر	۱۶	خاتمہ مرآۃ احمدی لاہور
۷	تاریخ گجرات جلد اول قلمی	۱۷	تاریخ محمود شاہی قلمی پشاور
۸	مظفر شاہی قلمی	۱۸	اقبال نامہ جہانگیری کلکتہ
۹	گلشن گجرات قلمی	۱۹	تاریخ کشمیر قلمی حبیب گنج
۱۰	تاریخ بیجاپور دہلی	۲۰	طبِ فرشتہ قلمی
۱۱	برہان مآثر دہلی	۲۱	کوکبِ فلک قلمی
۱۲	گجرات کی تاریخ قلمی مملوکہ	۲۲	یادِ ایام لکھنؤ

شمار	نام کتاب
۲۲	تزک جہانگیری لکھنو،
۲۴	موسم بہار بمبئی،
۲۵	آئین اکبری کلکتہ،
۲۶	مرقات الوصول قلمی احمد آباد
۲۷	ہندوستانی صنعتوں کا زوال
۲۸	چہار گلشن قلمی،
۲۹	حدیقۃ الاقالیم قلمی لکھنو (کتب خانہ راجہ سلیم پور)
۳۰	مآثر الامراء کلکتہ
۳۱	فرامین سلاطین دہلی
۳۲	جواہر نامہ قلمی احمد آباد (موجودہ کتبخانہ پیر محمد شاہ احمد آباد)
۳۳	منافع الصبیان قلمی (موجودہ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد)
۳۴	ہفت اقلیم رازی کلکتہ
۳۵	مقدمہ رقعات عالمگیر (شبلی اکاڈیمی)
۳۶	بساتین السلاطین،
۷	تاریخ مالوہ
۳۸	تاریخ عزیزی
۳۹	تاریخ دکن مولفہ (ہاشمی صاحب حیدرآباد)
۴۰	کتاب (قلمی کتب خانہ عیدروس)
۴۱	تمدن عرب طبع اول آگرہ،
۴۲	تحفۃ التجاری قلمی (کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد)
۴۳	عجائب الہند لنڈن
۴۴	تحفۃ المجالس قلمی
۴۵	تاریخ شیرازی کلکتہ،
۴۶	کتابت بڑودہ
۴۷	دیوان سعد سلمان بحوالہ الیٹ صاحب
۴۸	سفرنامہ سید علی ترکی لاہور
۴۹	مسعودی جلد اول مصر،
۵۰	بلاذری مصر،

شمار	نام کتاب
۵۱	الضوء اللامع مصر
۵۲	مقدمہ منہل قلمی
۵۳	تذکرہ محمد بن طاہر قلمی
۵۴	مجمع النوادر قلمی لاہور
۵۵	حقیقۃ السورہ بمبئی
۵۶	مآثر الکرام جلد اول آگرہ
۵۷	تاریخ بدایوں جلد دوم کلکتہ
۵۸	بمبئی گورنمنٹ ریکارڈ نمبر ۱۶
۵۹	خلاصۃ الاثر جلد ثانی مصر
۶۰	کتاب مزارات سورت و بھڑوچ قلمی (کتب خانہ سید عیدروس سورت)
۶۱	شعر العجم حصہ سوم شبلی اکاڈمی
۶۲	تاریخ ایلیٹ جلد سوم
۶۳	فیروز شاہی عفیف کلکتہ
۶۴	عمل صالح کلکتہ
۶۵	معاشی ہند حیدرآباد
۶۶	گجرات نو واہل دتو احمد آباد
۶۷	مجالس رنگین لکھنؤ

شمار	نام کتاب
۶۸	سفرنامہ ابن بطوطہ دہلی
۶۹	تمدن ہند سید علی بلگرامی آگرہ
۷۰	معجم البلدان یاقوت حموی مصر
۷۱	سفرنامہ سلیمان بصری پیرس
۷۲	بمبئی گزیٹیر
۷۳	سفرنامہ ابو زید سیرافی پیرس
۷۴	گجرات سرو شکرہ احمد آباد
۷۵	رتن مالا
۷۶	جوامع الحکایات قلمی (کتب خانہ شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ)
۷۷	نور اللغات لکھنؤ
۷۸	الاسطول الاسلامی مصر
۷۹	عربوں کی جہازرانی سید سلیمان ندوی اعظم گڈھ
۸۰	قلادۃ الشموس مصر
۸۱	الممالک المسالک لابن خرداذبہ مصر
۸۲	کتاب الہند بیرونی
۸۳	انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

سلسلہ تاریخ ہند

"ہندوستان عربوں کی نظر میں"

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق عربی کی تاریخوں، سفرناموں، اور جغرافیہ کی کتابوں میں جو بیش قیمت مواد پھیلا ہوا ہے اس کو دو جلدوں میں مع ترجمہ جمع کر دیا گیا ہے،

جلد اوّل

اس میں جاحظ، ابن خردادبہ، سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، بلاذری، یعقوبی، ابن فقیہ ہمدانی، ابن رستہ، بزرگ بن شہریار، مسعودی، مطہر مقدسی، اصطخری اور بشاری مقدسی کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کا ترجمہ ہے،

ضخامت ۰۰ ۔ ۴ صفحے قیمت مجلد ہے غیر مجلد ہے

جلد دوم

اس میں ان کے بعد کے مصنفین مثلاً ابن ندیم، عبدالقاہر بغدادی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید، ادریسی، ابن جابر، اصیبعہ ابن بطوطہ، قلقشندی وغیرہ کی کتابوں اور سفرناموں کے اقتباسات اور ان کا ترجمہ ہے،

ضخامت صفحے قیمت ہے

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے (علیگ)

ہندوستان کی تاریخ عہد وسطیٰ کے سلسلہ کی یہ چوتھی کتاب ہے جس میں اس عہد کے اور خصوصاً مسلمان حکمرانوں کے دور کے فوجی و حربی نظام، آلات حرب، آتشیں اسلحہ [illegible] کیمپ کے سامان، صف آرائی، میدان جنگ، محاصرۂ قلعہ، چھا[illegible] کی ترتیب، فوجی عہدہ داروں کے فرائض وغیرہ پر اس عہد کے اص[illegible] کے ساتھ معلومات فراہم کئے گئے ہیں، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو مصنف کی بیس سالہ تلاش و جستجو، تحقیق و تفتیش، اور محنت و جانفشانی کا نتیجہ ہے قیمت مجلد

(طابع زیر طبع ہے)